یعنی

فلسفہ ـ کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر ایک نئے نقطۂ نظر سے بحث اور فلسفہ و سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی حقائق کا اثبات

مولانا عبد الباری ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹، لکھنؤ

سلسلہ مطبوعات مجلس
۴۵

# مذہب اور سائنس

یعنے

فلسفہ۔ کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر ایک نئے نقطۂ نظر سے بحث اور فلسفہ و سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی حقائق کا اثبات

مولانا عبدالباری ندوی رح
سابق پروفیسر فلسفۂ جدید عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد۔ دکن

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

بار دوم

سال اشاعت ____ ۱۹۷۶ء

صفحات ____ ۳۰۴

کتابت ____ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ____ نامی پریس لکھنؤ

قیمت مجلد ____ بارہ روپے (۱۲)



(باہتمام۔ محمد غیاث الدین ندوی)



طابع و ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

# فہرست عنوانات

## پیش لفظ

# فہرست مضامین

## کتاب

# مختصر تعارف

(از مولانا عبدالماجد دریابادی)

میں سن میں مولانا سے کوئی دو ہی تین سال چھوٹا ہوں، درسی تعلیم میں بس تقریباً ساتھ ہی ساتھ رہا، وہ دارالعلوم ندوہ میں تھے اور میں لکھنؤ کے کیننگ کالج میں، تعلیم متوازی (PARALLEL) چل رہی تھی، ان کا وطن اکتسابی ضلع بارہ بنکی ہی کا ایک دوسرا قصبہ گدیا تھا اور مستقل یکجائی میری ان کی لکھنؤ ہی رہتی تھی، تعارف ۱۹۰۸ء میں ہوا، اور دو ہی ایک سال میں یگانگت اتنی بڑھی کہ گمان عزیزداری کا ہونے لگا، مشترک موضوع ہمارے ان کے مغربی فلسفہ اور عقلی علوم تھے، نوجوانی کے جوش میں زبان پر اور قلم سے ہر وقت یہی بحثیں جاری رہتی تھیں، ایک مردم شناس مبصر نے اسی وقت یہ فقرہ کہہ ڈالا کہ "ماجد صاحب کا مطالعہ جتنا بھی ہو۔ اور فلسفہ کی کتابیں جتنی بھی انھوں نے پڑھ ڈالی ہوں لیکن فلسفی کہلانے کے مستحق باری صاحب، ہی ہیں"

یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں تو "چار پائے بروکتابے چند" عمر بھر بدستور بنا رہا

البتہ وہ فلسفی سے ترقی کرکے متکلم اور صوفی بن گئے، لیکن عقلیت جیسے ان کی سرشت میں تھی، باوجود اپنے تقشف وتصلب کے وہ محض تسبیح وسجادہ کے صوفی ہوکر نہیں رہے بلکہ بقدر ضرورت برابر مغربی فلسفہ اور اس سے بھی بڑھ کر ماڈرن سائنس خصوصاً شعبۂ طبعیات سے ربط اور ان کا مطالعہ قائم رکھا، اس کی شاہد عادل تو یہ کتاب بھی ہے اور اگر خارجی کوئی شہادت مطلوب ہو تو اس کیلئے اس کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر رضی الدین وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کا نام کافی ہے، ان کا شمار خود وقت کے معتمد اور مستند ماہرین فن میں ہے۔

عبدالماجد دریابادی

۲۵ر نومبر ۱۹۷۰ء

# بہ برکات

حضرات والد ماجد حکیم عبدالخالق، و سراپا شفقت و احسان استاذی علامہ شبلی نعمانی، ومحسن ومجسم کرم پروفیسر شیخ عبدالقادر (آئی ای، ایس، بمبئی یونیورسٹی)، و قدردانِ اعظم مولٰنا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور مملکت آصفیہ مرحوم، و مرشدی و مولائی حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، اور اولاً و آخراً برادر عالیقدر حضرت مولانا علی میاں سلمہم، سرورق کے اس سرنامہ "بہ برکات" کو کوئی رسمی (DEDICATION) بالکل تصور نہ فرمایا جائے، بلکہ پیشکش کتاب کی کم وبیش نصف صدی کی سرگذشت میں جن حضرات کے برکات و احسانات کارفرما رہے بس ان کا مختصر ذکر مقصود ہے۔

# سرگذشت

میراخاندان یاگھر گھرانہ دنیا کے جاہ و مال سے کہنا چاہیئے کہ بالکل فارغ البال تھا البتہ جن والدین کے گھر میں پیدا ہوا وہ بحمداللہ خصوصاً زمانہ کو دیکھتے ہوئے دین کی دولت سے مالامال تھے، والد مرحوم تو مشاہیر شیوخ وقت میں حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے نہ صرف معمولی مرید تھے بلکہ اپنی کفش بردارانہ ادنیٰ سے ادنیٰ خدمات اور سلوک کے سلسلہ میں مجاہداتِ شاقہ کی بدولت بڑے چہیتے مرید تھے، مگر اخفا و استتار طبیعت پر اس قدر غالب تھا کہ وفات کے بعد جب ان کے شیخ کے پوتے مولانا محمد اسلم صاحب گدیہ میرے پاس تعزیت کے لئے تشریف لائے تو فرمایا کہ آج ایک حکیم صاحب مرحوم کا راز ظاہر کرتا ہوں۔ دادا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جب ہم نے ان کے مجازین کی فہرست دیکھی تو اس میں حکیم صاحب مرحوم کا نام بھی تھا تب میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت آپ تو اپنے شیخ کے مجاز بھی ہیں خود میں نے مجازین کی فہرست میں آپ کا نام پڑھا میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ بس ایک درخواست ہے کہ اب

کسی اور پر اس کو ظاہر نہ فرمائیں، ان کی زندگی بھر میں نے ان کے اس حکم کا پورا خیال رکھا لیکن اب ان کی وفات کے بعد آج آپ سے ظاہر کر دینے ہی کا جی چاہا۔ خود میرا ذہن بھی کبھی اس طرف نہ گیا نہ ان کے کسی مرید وغیرہ کا علم ہوا۔ بس زیادہ سے زیادہ ایک صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ ان کو کچھ ذکر وغیرہ کی تعلیم فرمادی تھی۔ اب والدہ مرحومہ کے دینی احساسات کا ایک ہی واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے، میں پونہ کے دوران ملازمت میں سالانہ بڑی تعطیل میں گھر اس حال میں آیا تھا کہ نماز صرف فرض پڑھتا تھا سنتیں بالکل متروک تھیں۔ اب بالکل یاد نہیں کہ شامت کا باعث کیا تھا، تاہم غالباً ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ہی سنتیں بھی پڑھنے لگا تب والدہ ایک دن روتی ہوئی تشریف لائیں اور فرمایا کہ یہ تم کو کیا ہو گیا تھا کہ تم نماز بھی پوری نہیں پڑھتے تھے۔ میں رو رو کر دن رات کی نمازیں دعا کرتی رہی، اور اب الحمدللہ یہ دیکھکر کہ تم پوری نماز پڑھنے لگے ہو جان میں جان آئی۔ دین کی حد تک، روز اول ہی سے ان کی برکات کی ابتدا بقول الہ آباد کے عارف اکبر کے کہ "دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا"، یہ نظر کہنا چاہیئے کہ والدین کی بدولت دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی نصیب ہونا شروع ہو گئی، جب ولادت کا وقت قریب ہوا اپنے فرنگی محلی شیخ و مرشد کی خدمت میں حاضری پر عرض کیا کہ حضرت گھر میں ولادت ہونے والی ہے۔ شیخ نے فرمایا انشاءاللہ لڑکا ہو گا۔ پھر والد نے نام کیلئے عرض کیا تو فرمایا کہ خالق باری پوری کر لینا۔ اس طرح اس عبدالخالق زادہ کا نام عبدالباری ہو کر خالق باری پوری ہوئی، جب بسم اللہ کا وقت آیا تو والدہ مرحومہ، جو خود بھی حضرت ممدوح ہی کی مریدہ تھیں مجھے لے کر خدمت میں حاضر ہوئیں، ساتھ کچھ مٹھائی بھی تھی جو مرشد کے سامنے رکھدی اور مرشد نے مجھکو اپنی گود میں بٹھا کر مٹھائی کی ایک ڈلی اپنے منھ میں ڈالی اور وہی آدھی کاٹ کر میرے منھ میں ڈالدی۔

پھر ستر کھ میں ایک بزرگ ابن بزرگ کے مکتب ہی میں بٹھایا۔ جو خود والد کے استاد بھی

رہے تھے، اور سیرتاً وصورتاً ہر طرح ماشاء اللہ بزرگ ہی تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد مرحوم کو ہمیشہ مکتب کے زمانہ ہی سے اس کا اہتمام رہا کہ استاد صرف کتابی ہی نہ ہو بلکہ مرد صالح بھی ہو۔

**ندوہ میں داخلہ**

ٹھیک بالکل معلوم نہیں کہ والد مرحوم کا ندوہ میں مجھکو داخل کرنے کی طرف ذہن کیسے گیا۔ اغلب یہ ہے کہ وطن کے قریب ایک نئے مدرسہ کا لکھنؤ جیسے شہر میں قیام اور اس کی تازہ تازہ شہرت ہی والد کے لئے ندوہ میں میرے داخلہ کے لئے محرک ہوئی ہوگی۔ ساتھ ہی بالکل ممکن ہے کہ بہت کچھ دخل حضرت مولانا مونگیریؒ جیسے مسلم بزرگ کی نظامت اور حضرت مولانا سید عبدالحیؒ کی نائب نظامت کو بھی رہا ہو۔ اس لئے کہ جس طرح میرا دادہال پورا کا پورا حضرت فرنگی محلیؒ کا مرید تھا اسی طرح نانہال خصوصاً بڑے ماموں حضرت گنج مراد آبادیؒ سے بیعت تھے اور سال میں کم از کم ایک مرتبہ زندگی بھر حاضری دیتے رہے۔ اور حضرت مولانا سید عبدالحی رائے بریلوی کے ساتھ والد مرحوم کا تعلق یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مولانا مرحوم حضرت فرنگی محلیؒ کے شاگرد تھے اور والد مرحوم اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے اور بارہا ہفتوں قیام رہتا۔ اغلب ہے کہ اس دوران میں مولانا مرحوم سے بھی والد مرحوم کا کچھ نہ کچھ تعلق و تعارف ہوگیا ہو اور ان کا نائب ناظم ہونا بھی میرے ندوہ بھیجے جانے کے محرکات میں رہا ہو باقی خود مجھکو اچھی طرح یاد ہے جب پونا یا حیدرآباد وغیرہ سے لکھنؤ آتا تو حضرت نائب ناظم صاحب ممدوح کی خدمت میں بھی ضرور حاضر ہوتا۔ بڑی محبت و شفقت کا برتاؤ فرماتے اور بہت خصوصیت کے ساتھ پیش آتے۔ ادھر مولانا علی میاں سلمہ سے جب کبھی اس کا ذکر آیا تو انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ ان کے والد مرحوم اور احقر کے والد مرحوم دونوں کا تعارف حضرت فرنگی محلی کے مرید و شاگرد ہونے ہی کی بنا پر رہا ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

بہرحال اب ندوہ میں داخلہ ہو چکا تھا۔ جناب ناظم اور نائب ناظم رحمہم اللہ سے تو طلبار کا خاص تعلق براہ راست نہ تھا۔ جو کچھ تعلق تھا حضرات اساتذہ سے تھا، یا جناب مہتمم صاحب دارالعلوم سے، جو اس زمانہ میں مولانا حفیظ اللہ صاحب اعظم گڈھی تھے۔ ان سے بھی ایک خصوصیت یہ حاصل تھی کہ میرے بڑے چچا حکیم امجد علی مرحوم اور مہتمم صاحب موصوف حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔

ندوہ کا یہ زمانہ ابھی اپنے نصاب تعلیم و رنگ تعلیم وغیرہ کے اعتبار سے پرانے درس نظامی والے ہی مدارس کا سا تھا مجھکو خود کافیہ و شرح جامی اور مقامات حریری وغیرہ تک پڑھنا پڑا تھا، جہاں تک یاد ہے کہ درس نظامی میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ نظم و ضبط کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا، طلبہ آزاد تھے، دن اور کبھی رات کو بھی بلا اجازت نکل جاتے، بڑی رغبت کا مشغلہ بنگالی مٹھائی خرید کر کھانا ہوتا، پھر کچھ گپ شپ کے بعد پھاٹک پھاند کر اپنے اپنے بستر پر واپس آجاتے، نماز کی اسوقت پانچوں وقت حاضری ہوتی۔ جس کی طرف سے لبیک کی آواز سنائی نہ دیتی اس کے نام کے آگے غیر حاضری کا "غ" بنا دیا جاتا اور ان غیر حاضر طلبہ کے نام کا ایک پرچہ باورچی خانہ بھیج دیا جاتا، غیر حاضری کی سزا یہ تھی کہ گوشت کا پیالہ بند کر دیا جاتا۔ خالی دال کھانا پڑتی، بلکہ اس نماز کا نام ہی پیالہ کی نماز ہو گیا تھا۔

بہرحال قیام و طعام کا نظام تو بندھا ہوا ہی تھا، باقی عام طور پر طلبہ پر علمی و دینی ذوق و رغبت کا کوئی اثر شاذ و نادر ہی رہا ہوگا، کھیل کود کے معاملہ میں آج کل کے کرکٹ، فٹ بال کا نام نہ تھا، بس صرف ابڈی کھیل لیا کرتے تھے، درسی کتابوں اور امتحانی تیاریوں کے سوا غیر درسی کتابوں کا علمی ذوق نہ تھا، نہ کتب خانہ میں طلبہ ایک آدھ کے سوا دکھائی دیتے۔ خود اپنا حال یہ رہا کہ درسی اور کتابی امتحانوں سے اتنا بے پرواہ رہتا کہ امتحان میں اکثر فیل ہی رہتا البتہ رعایتاً ترقی مل جاتی،

باقی وقت یار باشی یا امین آباد کی نذر ہو جاتا جس کی بدولت پانچ روپیہ جو مجھے جیب خرچ کے
ملتے وہ کیا کافی ہوتے نتیجہ یہ کہ باقی پانچ روپیہ جو کھانہ کی فیس کے آتے وہ بھی فضول خرچی کی نذر
ہو جاتے بالآخر مدرسہ کی طرف سے مطالبات کا تقاضہ والد صاحب کے پاس جاتا۔ وہ بھجوا دیتے
لیکن ان حرکتوں کی بدولت میرا ندوہ سے نام کٹا کے نگرام مولانا محمد ادریسؒ کی خدمت میں بھیجدیا
تھا، جن سے ایک تعلق یہ تھا کہ میرے بڑے چچا حکیم امجد علی مرحوم اور وہ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ
کے شاگرد تھے، اور بھی کچھ تعلقات دادا مرحوم کے زمانہ سے چلے آرہے تھے، مولانا سبق تو مجھے دو ہی
پڑھاتے، ایک فقہ کی کتاب برزنجی اور ایک مشکوٰۃ شریف کا، باقی نیچے کی بعض کتابیں اپنے عزیز
مولوی محفوظ الرحمن صاحب سے پڑھواتے، مولانا ادریس صاحبؒ نرے عالم نہ تھے، بلکہ جوار
کے بزرگوں میں ان کا شمار تھا، اور اس تباہ کار پر تو ان کی بزرگانہ نظر ایسی کیمیا اثر ثابت ہوئی کہ
نہ صرف نماز باجماعت پنجگانہ کا انھیں کی مسجد سے پابند ہو گیا پڑھنے کا شوق بھی اتنا ہو گیا کہ ندوہ
کے زمانہ تعلیم کی جتنی خامیاں تھیں سب اللہ تعالےٰ نے دور فرما دیں، ندوہ میں تو دو سطریں عربی
کی صحیح عبارت تک نہ پڑھ سکتا تھا۔ اور اب تفسیر و حدیث کی کتابیں بے تکلف پڑھنے لگا تھا اور
مطالعہ کی استعداد اچھی پیدا ہو گئی تھی۔

## ندوہ میں دوبارہ داخلہ

پھر ندوہ میں علامہ شبلیؒ مستقلاً تشریف لائے تو نہیں معلوم
کیسے والد نے مجھکو دوبارہ ندوہ بھجوا دیا، جس درجہ کو چھوڑ کر
میں نگرام گیا تھا اسی درجہ میں دوبارہ داخلہ دینے پر ندوہ تو تیار تھا، میں نے خود ہی ایک درجہ نیچے
نام لکھوایا تاکہ کامیابی کے ساتھ چل سکوں، نگرام کے چند ماہ قیام سے میری تعلیمی حالت بہت
سدھر گئی تھی۔ اب محنت کا یہ حال تھا کہ بجز نماز کی حاضری اور کھانے سونے وغیرہ کے اوقات
کے کہنا چاہیئے کہ پورا وقت کتابوں میں ہی گذرتا تھا۔ اور ایک ہی سال میں نہ صرف امتحان میں

اول آیا بلکہ سارے پرچے ایسے اچھے رہے کہ مولانا حفیظ اللہ صاحب جس پرچہ کے ممتحن تھے انھیں
یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ یہ میرے جواب ہیں، فرمایا کہ یہ اس "عنطا" نخرہ نے اتنی ترقی کیسے کرلی
اور مجھکو بلاکر بڑی شاباشی دی پھر اسکے بعد سے اپنے درجہ میں ممتاز محنتی اور شوقین طلبہ میں
شمار ہوتا تھا۔

**عہدِ شبلی کا اثر**

عام طور پر ندوہ کے طلبہ پر یہ پڑا کہ ان میں نہ صرف درسی کتابوں کے پڑھنے
کا شوق ہوگیا بلکہ غیر درسی کتابوں کے پڑھنے کا بھی عام شوق پیدا ہوگیا
ساتھ ہی مضمون نگاری وغیرہ کا بھی، کتب خانہ جس میں پہلے شاذونادر ہی دو ایک طالب علم
نظر آتے تھے اب قریب قریب بھرا رہتا، نیز مولانا کے اثر سے تاریخ و ادب کے مطالعہ تحریر و
تقریر کا شوق و ذوق عام ہوگیا تھا، اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یاد آیا، اعظم گڑھ کے
ایک طالب علم عبدالعزیز نام کے تھے، ماشاء اللہ اب بھی موجود ہیں اور اپنے گھر پر کاشتکاری
کا کام کرتے ہیں، انھوں نے نخاس سے ایک پرانی کرسی میز خرید کر اس پر علامہؒ کی نقالی
میں بیٹھ کر مضمون نگاری کیا کرتے، مگر جب مولانا کو اپنا کوئی مضمون دکھاتے تو مولانا فرماتے
کہ تم اس کی کوشش نہ کرو، مضمون نگاری نہ فرض ہے نہ ضروری، نہ تم کو اس سے مناسبت ہے
آخر کار وہ مایوس ہو کر بیٹھ ہی گئے اور اب جاکر اندازہ ہوتا ہے کہ جس اعظم گڈھ کے مولانا
عبدالسلام نے اپنی یادگار میں درجنوں کتابیں چھوڑیں اسی اعظم گڑھ کے میاں عبدالعزیز
ایک مضمون بھی شاید زندگی بھر نہ لکھ سکے۔ اصل میں مولانا شبلیؒ میں جوہر شناسی کا ملکہ بہت
غیر معمولی تھا۔ ان کے دارالعلوم میں قدم رکھتے ہی حضرت سید صاحبؒ کا تو ذکر ہی کیا مولوی
عبدالسلام، مولوی ضیاء الحسن وغیرہ کئی طالب علم دیکھتے دیکھتے اچھے خاصے مضمون نگار ہوگئے
جن میں سے بعض کے مضمون "الندوہ" میں شائع بھی ہوتے اور قدر کی نگاہ سے پڑھے جاتے،

حضرت علامہؒ کی مجلس عام کا وقت عصر اور مغرب کے وقت رہتا، جس میں اس وقت کے بی۔اے کے فلسفہ کے طالب علم اور آج کے مولانا عبدالماجد نیز ان کے بڑے بھائی ڈپٹی عبدالمجید مرحوم وغیرہ دوسرے لوگ بھی آ بیٹھتے۔ ندوہ کے طلبہ کے ساتھ حضرت ممدوح کا معاملہ بالکل اولاد کا سا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اولاد سے بھی بڑھکر، ایک لطیفہ یاد آگیا غالباً مجلس میں کسی نے یہ خبر سنائی کہ میاں حامد (مولانا کے اکلوتے صاحبزادے) نے فٹ بال میں کوئی کپ یا انعام حاصل کیا ہے، مولانا نے برجستہ فرمایا کہ یہ تو شبلی کے لڑکے کی نہیں کسی نٹ کے لڑکے کی تعریف ہوئی، اس سے اندازہ لگایئے کہ مولانا اپنی اولاد کس کو سمجھتے تھے، اور اس کے حق میں دامے درمے سخنے کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت خود راقم ہذا کی آپ بیتی ہے۔

علامہؒ ہی کے زمانہ سے مصر کے رسائل واخبار آنے لگے تھے، ان میں ایک رسالہ "المقتطف" شام کا ہوتا جو کسی عیسائی کے زیر ادارت تھا، اس میں جدید فلسفہ اور سائنس کی چیزیں زیادہ ہوتیں مجھکو یوں بھی منقولات کے بجائے معقولات سے زیادہ مناسبت تھی ساتھ ہی قدیم معقولات کی شروح در شروح، حواشی در حواشی کے قیل وقال سے الجھن بھی بہت ہوتی، خدا بھلا کرے علامہ ممدوح کا کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں نصاب میں جو تبدیلیاں کیں ان میں سے بعض ایسی تھیں جنھوں نے میری دلچسپی قدیم معقولات سے بھی کچھ بڑھادی مثلاً "شرح حکمۃ العین" "شرح حکمۃ الاشراق" جیسی کتابوں نے، بالخصوص "شرح حکمۃ الاشراق" پڑھانے والے استاد مولانا شبیر علی حیدرآبادی تھے، جنھوں نے اپنے خاص طرز تعلیم سے میری رغبت اور بڑھادی، اچھے اور لائق اساتذہ کے لانے میں حضرت علامہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر استاد لاتے تھے، خود اپنے استاد

مولانا فاروق چریاکوٹی کو بھی دوبارہ بلالیا تھا، یہ دونوں حضرات مولانا شیر علی اور مولانا چڑیاکوٹی حقیقت میں پرانے قسم کے اساتذہ کی جیتی جاگتی مثال تھے، لیٹے بیٹھے، سوتے جاگتے اپنے طلبہ اور ان کو پڑھائی جانے والی کتابوں کے متعلق ہی مطالعہ وفکر میں رہتے اس کی ایک مثال مولانا شیر علی کی یاد آئی جو شرح حکمۃ الاشراق اور اقلیدس پڑھاتے تھے ایک دن حوائج ضروریہ کے لئے میں کچھ رات کونا وقت اٹھ بیٹھا اور وہ حوض جس میں پانی بھرا رہتا اور ٹونٹیاں لگی رہتی تھیں مولانا کی قیامگاہ کے قریب ہی تھا، فراغت کر کے جب مولانا کے قریب سے گذرا تو مولانا کو کچھ چاپ ملی، فرمایا کون ہے؟ عرض کیا عبدالباری فوراً اپنے پاس بلالیا اور بٹھا کر فرمایا کہ آج کے سبق میں شرح حکمۃ الاشراق کی جو بحث پڑھائی گئی تھی اس میں تمہیں کچھ اشکال تھا، اس کے بارہ میں سوچ رہا تھا۔ آؤ تمہارے سامنے پھر تقریر کئے دیتا ہوں تاکہ اشکال رفع ہو جائے۔

مذکورہ بالا مصری رسالہ "المقتطف" کو میں قریب قریب پورا پڑھ ڈالتا تھا، اس سے میرے اندر انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا کہ کاش ان باتوں کو براہ راست انگریزی میں پڑھ سکتا۔ لیکن پڑھتا کیسے جبکہ والد مرحوم اس کے قریب جانا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ گو دارالعلوم میں انگریزی پڑھانے کے استاد جو ماسٹر کے بجائے دارالعلوم کے بہت سے مولویوں سے زیادہ مولوی معلوم ہوتے تھے۔ چہرہ پر بڑی سی داڑھی، سر پر بڑا سا عمامہ، انگریزی پڑھنے کی لالچ میں پرائمر لیکر ان کے پاس جا بیٹھتا، پرائمر اور ایک آدھ ریڈر شاید انھیں سے ختم بھی کرلی تھی، پھر اس کے بعد علامہ کے دور میں ایک کے بجائے دو انگریزی ماسٹر ہو گئے بلکہ تین، ایک جو حساب وغیرہ سکھاتے تھے، عربی کے نصاب میں بھی خاصی تبدیلیاں ہو گئی تھیں، کچھ کتابیں جو اس وقت خود مجھے پڑھنا پڑی تھیں، ان میں شرح حکمۃ العین و شرح حکمۃ الاشراق

کے علاوہ "دلائل الاعجاز" بھی تھی، قرآن مجید سے متعلق ہونے کی بنا پر اس کتاب کو بھی دلچسپی سے پڑھا تھا۔ اور شاید اسی زمانہ سے قرآن مجید سے کچھ مناسبت پیدا ہوئی۔

بہرحال "المقتطف" پڑھتے پڑھتے اب میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ اتنی انگریزی پڑھ لوں کہ ان چیزوں کا مطالعہ خود انگریزی میں براہ راست کر سکوں۔ ٹھیک یاد نہیں ایک طرف تین تین اساتذہ تھے انگریزی کے بلکہ اس کا ایک مستقل شعبہ ہی الگ ہو گیا تھا جس کے ہیڈ ماسٹر قاضی تلمذ حسین صاحب گورکھپوری تھے۔ اس طرح اب خود ندوہ میں میرے انگریزی پڑھنے کی ایک صورت نکل آئی تھی، لیکن والد سے جب عرض کیا کہ میں ندوہ میں دو تین سال اب صرف انگریزی پڑھنا چاہتا ہوں تو بے ساختہ فرمایا کہ "میرے ذمہ کا جو کام تھا اللہ تعالے نے وہ ندوہ نگرام میں پورا فرما دیا، باقی اس انگریزی تعلیم کے کارخیر میں شرکت سے معذور ہوں۔" اس کے بعد سے خرچ دینا بند کر دیا۔ میں یہ فریاد لیکر حضرت استاد علامہ کی خدمت میں پہونچا، بڑی تسلی فرمائی اور فرمایا تمہارے لئے انگریزی تعلیم کا انتظام ندوہ ہی سے ہو جائیگا، چنانچہ قاضی تلمذ حسین صاحب ہیڈ ماسٹر اور دین محمد صاحب ماسٹر کو باقاعدہ طور پر ایک ایک سبق پڑھانے کا حکم دیدیا اور کھانے وغیرہ کا انتظام بھی ندوہ ہی سے فرما دیا۔ اس طرح پوری بے فکری سے صرف انگریزی پڑھنے میں مصروف ہو گیا، اور الحمدللہ کوئی دو برس کے بعد ہی اس قابل ہو گیا کہ انگریزی کی فلسفہ کی آسان کتابوں سے لغت کی مدد سے بقدر ضرورت مطلب نکال لینے لگا، دوسری طرف مدد کی ایک صورت یہ نکل آئی کہ آج کے ہمارے مفسر دریابادی اور اس زمانہ کے ماجد میاں جو لکھنؤ کیننگ کالج میں بی۔اے کے فلسفہ کے طالب علم تھے ان سے بے تکلفانہ اور دوستانہ تعلقات بڑھنا شروع ہوئے اور غالباً نفسیات کی ایک کتاب ان سے باقاعدہ بھی پڑھنے لگا، نیز ان کی بدولت بعض ان کے رفقائے کالج ایسے مل گئے جو مجھے انگریزی پڑھنے پڑھانے میں اچھی خاصی مدد دیتے رہتے تھے

افسوس کہ وہ سب مرحوم ہو چکے، الغرض ندوہ کے دو مستقل استادوں اور بیرونی دوستوں خصوصاً ماجد میاں کی مدد سے اس قابل ہو گیا کہ فلسفہ کی اوسط درجہ تک کی کتابیں لغت کی مدد سے حسب ضرورت سمجھ لیتا تھا خیال آیا کہ اگر مجھکو اب کسی کالج میں سال دو برس فلسفہ کے لکچروں کی صرف سماعت کی اجازت مل جائے تو پھر انشاء اللہ کسی ضابطہ کے امتحان کی ضرورت کا محتاج نہ رہوں گا۔ یہ خیال بھی حضرت استاذ علامہ کی خدمت میں پیش کیا۔ ممدوح نے علی گڑھ کے لئے تین خط لکھکر دیئے، ایک صاحبزادہ آفتاب احمد کے نام جس میں یہ تھا کہ حامل ہذا کے لئے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے وظیفہ مقرر کردیا جائے، موصوف نے پوچھا کہ کیا چاہتے ہو۔ عرض کیا پندرہ روپیہ ماہوار انھوں نے اسی وقت اپنے دفتر سے باقاعدہ حکم لکھوا کر اور پندرہ روپیہ کی پہلی قسط دلوا بھی دی اور فرمایا کہ اب جہاں بھی رہو اپنے پتہ سے دفتر کو مطلع رکھو، انشاء اللہ ماہ بماہ وظیفہ تمکو پہونچتا رہے گا۔ دوسرا خط حضرت علامہؒ نے اپنے بھتیجے اقبال کو لکھا تھا جو اس وقت علی گڈھ میں وکالت کرتے تھے کہ حامل ہذا ندوہ کے طالب علم ہیں علی گڑھ میں فلسفہ کے لکچر سننے کے لئے آرہے ہیں امید ہے کہ ان کے قیام کا انتظام اپنے ساتھ کروگے، موصوف نے فرمایا اپنا گھر سمجھ کر بے تکلف آجایئے۔ تیسرا خط نواب وقار الملک کے نام تھا کہ حامل ہذا ندوہ کے فارغ التحصیل طالب علم ہیں بعد کو ان کو جدید فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا تو اس کے لئے نجی طور پر انگریزی اتنی پڑھی ہے کہ فلسفہ کی معمولی کتابیں مطالعہ کے ذریعہ سمجھ لیتے ہیں۔ اب چاہتے یہ ہیں کہ کم از کم ایک سال ان کو فلسفہ کے لکچروں میں شرکت کی اجازت مل جائے، نواب صاحب نے اس خط کو پڑھ کر مولانا کا لحاظ تو اتنا فرمایا کہ جب میں ان کی خدمت سے واپس لوٹا تو دروازہ تک پہونچانے آئے لیکن آدمی وہ قانون وضابطہ کے مشہور ہی تھے فرمایا کہ اس کا تعلق براہ راست پرنسپل سے ہے، میں مشورہ کے بعد جواب دوں گا، دوبارہ جب حاضر ہوا تو فرمایا کہ پرنسپل نے مجھ سے خود ایسا سوال کیا جس کا

جواب نہ بن پڑا کہ اگر اس طرح صرف لکچروں کے سننے کا دروازہ کھولا گیا تو پھر بند کس طرح کیا جائیگا اور کالج کا نظام درہم برہم ہو جائیگا، غالباً ایسا ہی جواب مولانا شبلیؒ کے خط کا بھی تحریر فرما دیا ہمارے ماجد میاں اس زمانہ میں وہاں فلسفہ کے ایم۔ اے میں زیر تعلیم تھے لکھنؤ کے تعلقات کی وجہ سے انھیں کا مہمان رہ کر بالآخر بے نیل مرام واپس آگیا،

علی گڈھ سے بے نیل مرام واپس آنے کے بعد اب ایک ہی راستہ سمجھ میں آیا کہ انٹرینس کا امتحان پرائیویٹ دینا چاہئے لیکن پرائیویٹ کیلئے قید یہ تھی کہ کسی ہائی اسکول میں کم از کم ایک سال ملازمت کی ہو۔ اس مشکل کے لئے بھی حضرت استاذ کی خدمت میں عرض کیا حسن اتفاق سے اس زمانہ میں فیض آباد ڈویژن کے انسپکٹر آف اسکولس عبدالعزیز صاحب تھے جو علی گڈھ میں حضرت استاذ کے شاگرد رہے تھے، استاد محترم نے حسب سابق میرے عرض کرتے ہی ایک سفارش نامہ موصوف کے نام لکھ دیا، میں اسکو لیکر فیض آباد پہونچا، انسپکٹر صاحب موصوف نے جیسے ہی مولانا کا والا نامہ پڑھا مجھکو کچھ جواب دیئے بغیر دفتر سے ایک حکم نامہ لکھوا دیا کہ ہیڈ مولوی کی جو جگہ سلطانپور ہائی اسکول میں خالی ہے حامل ہذا مولوی عبدالباری کا اس پر تقرر کیا جاتا ہے اس طرح سلطانپور ہائی اسکول پہونچا اور وہاں اپنے رفیق اساتذہ کی مدد سے انگریزی اور دیگر مضامین کی تیاری میں لگ گیا۔

حضرت استاذ علامہ اس دوران میں ندوہ سے بالکل علاحدہ ہو کر اپنے وطن اعظم گڈھ جاکر اپنے بنگلہ وباغ میں عزلت نشین ہو چکے تھے ایک طرف اس بنگلہ اور باغ کو وقف فرما کر دار المصنفین کے قیام کی تجویز میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہر قسم کی تصنیف و تالیف سے قطع نظر فرما کر صرف سیرۃ النبی میں مشغول تھے، احقر کا جی چاہا کہ ایسے عمر بھر کے محسن و محترم استاد کی خدمت میں دو چار دن کے لئے اعظم گڈھ جاکر حاضری دوں، اعظم گڈھ پہونچا اور کم از کم تین دن سراپا شفقت استادی کا مہمان رہا، اور کم و بیش حضرت کے آرام اور تصنیف کے کام کے علاوہ قریب ہی حاضر رہتا گفتگو

دو ہی چیزوں پر فرماتے۔ دار المصنفین کے قیام اور سیرۃ النبی کی تکمیل ان دو کے سوا تیسری بات مشکل ہی سے فرماتے، بس اس طرح مولانا کو اپنے خاتمہ ہی کی فکر معلوم ہوتی تھی جس کے لئے اب شفیع المذنبین کی سیرت ہی کی تکمیل ہو رہی تھی جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی　　مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

تین دن رات کی حاضری میں استاد ممدوح کا معاملہ استاد سے زیادہ ایک شفیق باپ کا سا رہا، باتیں ایسی بے تکلفی اور محبت سے فرماتے جیسے کسی معمولی طالب علم سے نہیں بلکہ کسی بے تکلف دوست سے ہو رہی ہوں، ندوہ کے زمانہ میں جب لکھنؤ سے باہر ہوتے مثلاً بمبئی میں اور میں اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کے سلسلہ میں کچھ لکھتا تو بڑی ہمت افزائی فرماتے، ایک کارڈ میں تحریر فرمایا کہ ؎

ہمت بلند دار کہ عزیز جہاں شوی

بہت سے والا ناموں میں اس طرح کی ہمت افزائی اور مدد فرمائی کی باتیں ہوتیں، کسی خط میں تحریر فرمایا کہ بس تم بقدر ضرورت انگریزی اور جدید فلسفہ سے مناسبت پیدا کرو تو میں تم کو آغا خاں سے ولایت کا وظیفہ دلاؤں گا۔ اعظم گڑھ کی آخری زیارت میں یہ بھی محسوس کیا کہ محترم و مرحوم استاد کو ندوہ سے جدائی کا بہت قلق تھا، راقم الحروف کے نزدیک یوں تو اجل مسمی کا وقت آچکا تھا لیکن ظاہری اسباب میں ایک سبب کم از کم ندوہ سے علاحدگی بھی رہی ہوگی اسلئے کہ جس وقت میں حاضر ہوا ہوں مولانا فریش بالکل نہ تھے اچھی طرح حسب عادت گفتگو فرماتے اور چلتے پھرتے، اصل یہ ہے کہ ندوہ نے ان کے ساتھ عام انسانی حیثیت سے بھی نامناسب سلوک ہی کیا تھا، حالانکہ جس ندوہ کا آج عرب و عجم میں چرچا ہے اور جس کا سب سے بڑا نشان برادر عالی قدر مولانا علی میاں سلمہم ہیں یہ سو فیصدی عہد شبلی ہی کی دین ہے، اس سے پہلے نہ تقریر و تحریر کا کوئی خاص ذوق طلبہ میں تھا اور نہ مضمون نگاری و

تصنیف کا، نہ اردو عربی ادب وانشاء کا، نہ تاریخ کا، یہ سب چیزیں بالکلیہ دورِ شبلی کی یادگاریں ہیں، ندوہ کے زمانہ تعلق میں بارہا خود دارالعلوم تشریف لاکر ہم طلبہ کی مجلس میں تقریر فرماتے ایک تقریر کی یاد آج بھی ذہن میں نقش کالحجر ہے، فرمایا کہ یورپ کا تو کوئی ماضی نہیں اس لئے وہ مستقبل کے اندھیروں میں جدھر چاہے ٹھوکریں کھاتا پھرے لیکن اسلام کا ماضی اتنا شاندار ہے کہ مسلمانوں کی ترقی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے میں ہے یہاں تک کہ ہٹتے ہٹتے خیر القرون عہد صحابہ بلکہ خود حضور صلعم کے عہد مبارک تک جا پہونچیں، یہی ہماری ترقی کا اصل راز ہے، اس قسم کی تقریریں ندوہ کے طلبہ کے عام مجمع میں فرمایا کرتے بلکہ جن طلبہ میں اردو یا عربی تقریر کی کچھ صلاحیت دیکھتے ان کو تنہائی میں بلاکر اور کوئی موضوع دیکر اپنے سامنے تقریر کراتے، خود اس راقم عاجز کو باوجود معذرت کے کم از کم ایک مرتبہ اپنے سامنے ہی تقریر کا حکم دیا، ساتھیوں کی دیکھا دیکھی الٹی سیدھی جیسی بن پڑی استاد کے حکم کو بجا لایا، تقریر تو جیسی تھی میں ہی جانتا ہوں لیکن استاد کی شفقت نہ بھلائی جانے والی ہے فرمایا کہ تم میں صلاحیت ہے لیکن ذرا مشق بڑھانے کی ضرورت ہے جس سے خامیاں اور جھجک دور ہو جائے گی، آہ! کیسی دولت ندوہ نے کھوئی اپنے ہاتھ سے بہرحال ندوہ جو آج عرب و عجم میں شہرت رکھتا ہے خصوصاً ہمارے علی میاں سلمہم اور میرے مخدوم بزرگ اور علی میاں کے برادر بزرگ ڈاکٹر عبد العلی صاحب مرحوم کے صاحبزادے محمد میاں سلمہم جو "البعث" وغیرہ نکالتے ہیں اس کو یہ عاجز دیانتہً عہد شبلی کی دین جانتا ہے کیونکہ ان سب کی بنیاد بڑی شبلی ہی کے دور میں تھی، اور دارالمصنفین تو مجسم صرف مولانا ممدوح کی ذات واحد کی یادگار ہے، اس میں کام کرنے والے طلبہ بھی زیادہ تر دور شبلی کی روایات کے پروردہ رہے ہیں

## دکن کالج پونہ

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب اپنے استاد محترم کی وصیت و حکم کے مطابق دکن کالج کی فارسی کی لکچراری خیرباد فرماکر سیرۃ النبی کی تکمیل کیلئے

اعظم گڑھ آ گئے، اور انتظامی امور کیلئے ساتھ ہی ساتھ مولانا مسعود علی صاحب مرحوم بھی، اب اسی باغ اور بنگلہ میں جو علامہؒ نے اپنی ملکیت سے خارج کر کے دار المصنفین کے لئے وقف فرما دیا تھا اسی ہیں دار المصنفین کی داغ بیل پڑ گئی، اور ماشاء اللہ اب سنا ہے کہ شاہ معین الدین صاحب کے دور میں عمارتی ترقی بھی خاصی ہو گئی ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

پونہ کے لئے سید صاحب ممدوح نے میری خواہش اور اپنی شفقت سے میرا نام اپنی جگہ کے لئے پروفیسر شیخ عبد القادر کو پیش کر دیا، جو شعبۂ فارسی کے صدر تھے، گو میرے مقابلہ میں فارسی کے کئی فرسٹ کلاس ایم۔ اے والوں کی بھی درخواستیں تھیں لیکن شیخ صاحب موصوف نے صدر شعبہ ہونے کی حیثیت سے اپنا پورا وزن ڈالکر سب کے مقابلہ میں میرا ہی انتخاب کرا لیا، پونہ پہونچنے پر شیخ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ سید صاحب تو فارسی میں لکچر دیتے تھے لیکن اگر آپ انگریزی میں عادت ڈال لیں تو یہاں بہت مواقع آپ کے لئے نکلیں گے، میں نے ڈرتے ڈرتے دو شرطوں کے ساتھ قبول کر لیا، ایک تو یہ کہ مجھے سر دست انٹر کلاس کے لکچر دیئے جائیں کیونکہ انٹر والوں کی انگریزی اتنی اچھی نہ ہو گی کہ میری انگریزی پر زیادہ ہنس سکیں، دوسری یہ کہ میں ابتدا خواجہ حافظ سے کروں گا جو انٹر کلاس میں داخل تھا، خواجہ حافظ سے مجھے استاد محترم علامہ کے مشورہ کے مطابق دلچسپی بھی زیادہ ہو گئی تھی، قریب قریب دیوان ہر وقت سرہانے ہی رہتا، مزید برآں دیوان کے ترجمے اور شرحیں بھی انگریزی میں ملتی تھیں، بہر حال تیاری کرتا رہا کالج کھلنے پر اللہ کا نام لیکر لکچر شروع کر دیئے، الحمد للہ کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی، طلبہ پر بھی اثر اچھا ہی رہا، پھر کوئی دو برس بعد بی۔ اے کا بھی ایک لکچر لے لیا، الحمد للہ اس میں ہر طرح توقع سے بڑھکر کامیابی اور نیک نامی رہی، ایک دوست ڈپٹی باقر علی صاحب کو مجھ سے کچھ ایسی موانست ہو گئی تھی کہ کچہری سے اٹھکر وہ قریب قریب روز ہی میرے مکان پر آ جاتے اور مغرب تک رہتے

ایک دن بہت خوش خوش آئے اور کہا کہ خاص طور پر آپکو مبارکباد دینے آیا ہوں، مبارکباد
اس بات کی کہ آپ نے انگریزی کا تو ایک بھی اونچا امتحان پاس نہیں کیا، اس لئے میں
ڈر رہا تھا کہ آپ بی۔اے کو کیسے لکچر دیتے ہوں گے، لیکن آج میں نے مسٹر منشی بی۔اے کے
سب سے ہوشیار طالب سے پوچھا تو انھوں نے بہت جوش اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ اگر مولوی
صاحب رہ گئے تو بمبئی پریسیڈنسی میں ان سے بہتر کوئی استاد نہو گا، باقی پروفیسر عبدالقادر ممدوح
باوجود صدر شعبہ اور آئی۔ای۔ایس ہونے کے اس خاکسار کے ساتھ بڑی عنایت ومحبت فرماتے
یوں بھی اپنی ذات میں وہ شرافت وانسانیت کا مجسمہ تھے، اس کے لئے ایک ہی بات کافی
ہوگی کہ صدر شعبہ ہونے کی حیثیت سے ان کو حق تھا کہ اپنے ماتحت اساتذہ کو جو چاہیں کام
سپرد کریں، لیکن راقم الحروف کے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس اس حد تک تھا کہ کالج
جب کھلتا تو خود میرے پاس تشریف لاکر فرماتے کہ آپ مجھے کیا کام دیتے ہیں، میں جو دو ایک
لکچر قبول کرلیتا باقی سب اپنے ذمہ رکھ لیتے اس سے بڑھکر سنئے کہ مہینہ میں کسی اتوار کی چھٹی
میں اپنے گھر کا سامان خریدنے بازار جاتے وقت میرے گھر پر بھی ہوتے جاتے اور فرماتے کہ
کلو (میرے نجی ملازم) کو میرے ساتھ کردیں تو آپ کے یہاں کی ضرورت کا سامان بھی ان کو
خرید وادوں، دو ایک مرتبہ تو میں نے اس کو قبول کرلیا باقی آئندہ کے لئے شرط لگادی کہ ساتھ
میں بھی چلوں گا، اور پھر یہی معمول رہا، وہاں اچھے اچھے کالج کے بڑے بڑے پروفیسر جو امریکہ و
یورپ کی ڈگریاں اور موٹر رکھتے تھے موٹروں میں بیٹھ کر بازار سے بے تکلف اپنے اور گھر کی ضروریات
کا سامان لاتے، اس سلسلہ میں مہاراشٹر والوں کا اپنی تہذیب اور طریقوں پر جس درجہ اصرار دیکھا
وہ خصوصاً ہم مسلمانوں کے لئے سننے سنانے کے لائق ہے، بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کا
اتفاق ہوا جس میں گورنر وغیرہ تک مدعو ہوتے لیکن کسی ایک پروفیسر کو بھی دیکھنا یاد نہیں

جو اپنے اسی لباس میں نہ ہوتا جو گھر باہر روزانہ کا معمول تھا یعنی سر پر ایک خاص پگڑی نما ٹوپی اور پاؤں میں لال جوتیاں، اس سلسلہ کی کچھ قابل ذکر باتیں اور بھی سنئے، میرے شاگردوں میں زیادہ تر مرہٹے اور پارسی اور چند حیدر آباد کے مسلمان تھے، دکن کالج کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر معمول یہ تھا کہ ایک وقت مسلمان اپنے ہاسٹل میں اساتذہ کی دعوت کرتے اور دوسرے وقت غیر مسلمان طلبہ، میں بالعموم مسلمان طلبہ کے یہاں شریک ہو جایا کرتا، ان کے ڈائننگ ہال میں چاروں طرف تصویریں لگی ہوتیں اور کھانے میں چھری کانٹوں کا استعمال ہوتا، صرف حیدر آباد کے طلبہ اپنی حیدر آبادی بریانی کا اضافہ کر دیتے جس کو غیر مسلم اساتذہ اور انگریز پروفیسر و پرنسپل سب ہی پسند کرتے، ایک مرتبہ اسی سالانہ تقریب کے موقعہ پر میرے پرائیویٹ کمرہ میں دو غیر مسلم طلبہ آئے اور کہا کہ آپ ہر سال مسلمانوں کے ڈنر میں شریک ہوتے ہیں، اس سال درخواست ہے کہ ہمارے ساتھ شریک ہوں، میں نے کہا کہ آپ نے پہلے بھی دعوت دی ہوتی تو ضرور شریک ہوتا زیادہ سے زیادہ ایک بار ان کے یہاں اور ایک بار آپ کے یہاں اب سنئے ان کے یہاں کھانے کا وقت دوپہر کا تھا میرے پرائیویٹ کمرہ میں ایک طالب علم اپنے کاندھے پر دھوتی ڈالے ہوئے اس انداز میں آ کھڑے ہوئے گویا کچھ کہنا چاہتے ہیں، میں نے کہا کہ جو کچھ کہنا ہو بے تکلف کہئے، تو بے تکلف نہایت شرم کے ساتھ کہا، وہاں سب لوگ دھوتی میں ہوں گے، اگر آپ بھی پسند کریں تو یہ دھوتی حاضر ہے، میں اس وقت اپنے کمرہ میں شیروانی اتارے کرتہ پائجامہ میں تھا، میں نے کہا کہ اگر ایسی ہی بے تکلفی ہے تو میں بلا شیروانی پہنے اسی بے تکلف لباس کرتے پاجامہ میں چلا چلوں۔ کہا بسم اللہ

دکن کالج کا جب ذکر آتا ہے تو وہاں کے پرنسپل ایف، ڈبلیو بین کی یاد آجاتی ہے جو انگریزی کا مشہور مصنف بھی تھا، اس درمیان میں پروفیسر شیخ کا :: الفسٹن کالج یونیورسٹی

میں ہو گیا تھا، مجھے ان سے ملنے کے لئے بمبئی جانے کی ضرورت ہوئی، میں پرنسپل صاحب سے اجازت لینے کے لئے ان کے کمرہ میں گیا کہ دو دن کے لئے بمبئی جانا چاہتا ہوں، اس کا جواب موصوف نے مذاقیہ انداز میں دیا کہ "پھر میں کیا کروں؟" میں نے عرض کیا کہ پھر میں کس سے اجازت لوں؟ اس کا جواب پرنسپل نے یہ دیا کہ میں اپنے کالج میں ہر شخص کے متعلق سب سے پہلے یہ اطمینان کرتا ہوں کہ یہ اہلیت اور فرض شناسی کے ساتھ کام کرتا ہے یا نہیں، جس کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا اس کا میں اپنے کالج میں رہنا ہی پسند نہیں کرتا، آپ کو اگر بمبئی جانا ہے تو بے تکلف جائیے البتہ نوٹس بورڈ پر نوٹس لگوا دیجئے کہ فلاں فلاں دن میرا لکچر نہ ہوگا تاکہ طلبہ پریشان نہ ہوں، یہ پرنسپل صاحب جن کو ظاہری ضابطہ پرستی سے کچھ طبعی بیزاری سی تھی اور شیخ صاحب کی شرافت نفس کی وجہ سے دکن کالج میں راقم ہذا کو بہت ہی اطمینان اور سکون نصیب رہا، ان دونوں شخصیتوں کی بدولت لکھنے پڑھنے کا موقعہ بہت ملتا رہا، کالج کی لائبریری میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، پرنسپل صاحب کو خود بھی فلسفہ کا بڑا ذوق تھا، اس لئے اس فن کی کتابوں سے بھی لائبریری خاص طور پر معمور تھی، میں نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا، جدید فلسفہ میں ڈی کارٹ سے لیکر ڈیوڈ ہیوم تک کی کتابوں کے خصوصیت سے پڑھنے کا موقعہ وہیں ملا، شروع میں اس موضوع پر جب کچھ لکھنے کا خیال آیا تو جی چاہا کہ فلسفہ کی کسی مختصر و مستند تاریخ ہی کا ترجمہ کر دیا جائے، چنانچہ جرمنی کے مشہور فلسفی وببر کی تاریخ فلسفہ کے انگریزی ترجمہ کا ترجمہ شروع بھی کر دیا اور بہت سا کر بھی ڈالا، پھر خیال بدل گیا اور ارادہ یہ ہوا کہ اس کی بجائے براہ راست اردو میں انگریزی کی مختلف کتابوں کو سامنے رکھ کر ایک تاریخ فلسفہ مرتب ہو جائے، اس کام کا بھی بیشتر حصہ ہو گیا تھا، لیکن جدید فلسفہ میں مجھکو ڈی کارٹ سے لیکر ہیوم تک اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ برکلے کی کتاب سے زیادہ دلچسپی

محسوس ہوئی اور اس کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اسلئے اور سارے خیالات چھوڑ کر براہ راست برکلے کی کتاب پرنسپلس آف ہیومن نالج" (PRINCIPLES OF HUMAN KNOWLEDGE)

کا ترجمہ" مبادی علم انسانی" کے نام سے کر ڈالا، ساتھ ہی برکلے کی سوانح اور اسکے فلسفہ پر بھی ایک کتاب لکھ گئی، یہ دونوں کتابیں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئیں۔

## گجرات کالج احمد آباد

پروفیسر شیخ کے بمبئی تبادلہ کے بعد اور پرنسپل بین کے وظیفہ پر مستقلاً علاحدہ ہوجانے کے بعد میرا تبادلہ گجرات کالج احمد آباد ہو گیا، گجرات کالج ہی کے دوران قیام میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس طے پایا، راقم نابکار کے بڑے مہربان و قدردان مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا حکم آیا کہ تم کو اس اجلاس میں اپنے پسند کے کسی موضوع پر تقریر کرنا ہے اور اس سلسلہ میں کوئی معذرت قبول نہ ہوگی، جواباً عرض کیا کہ اس حکم محکم کے بعد معذرت کی گنجائش ہی کیا، بس اتنی درخواست ہے کہ مجھکو چونکہ عام جلسوں میں تقریر کی عادت نہیں البتہ امتثال امر کے لئے کچھ اپنے مذاق کی باتیں عرض کرونگا وقت عام اجلاس کی بجائے کسی مخصوص اور محدود مجمع کا ہو تو بہتر ہوگا، اسکو قبول فرما کر رات کا وقت رکھا، میں نے ایک پرچہ پر یادداشت کے طور پر کچھ چیزیں لکھ لی تھیں، بس انھیں پر کم و بیش ایک گھنٹہ عرض کیا۔ پسند اس کو سب سے زیادہ خود صدر جلسہ سر ابراہیم رحمت اللہ (وزیر تعلیم بمبئی) نے کیا اور بڑے اصرار سے فرمایا کہ اس کو آپ رسالہ کی صورت میں مرتب کردیں تو میں اس کا انشاءاللہ انگریزی میں ترجمہ کراؤں گا، بہرحال گجرات کالج کے تعلق سے یہی ایک کام ہو سکا کہ وہ تقریر" مذہب و عقلیات" کے نام سے مرتب ہو کر کانفرنس ہی کی طرف سے شائع بھی ہو گئی اور اللہ تعالےٰ نے اسے توقع سے بڑھ چڑھ کر قبول بخشا حتیٰ کہ ہمارے برادر گرامی قدر مولانا علی میاں سلمہم کو تو یہ مضمون اتنا پسند آیا کہ بعد نظر ثانی و تکملہ اس کا عربی میں ترجمہ کرنے پر

تیار ہو گئے، لیکن نظر ثانی اور تکملہ کا معاملہ ایسا آسان نہ تھا، فلسفہ کے ساتھ یہ خیال دامن گیر ہو گیا کہ جدید ترین سائینسی نظریات و معلومات کو شریک کر کے اس کو ایک مستقل کتاب کی صورت دے دی جائے، علی میاں ممدوح کی طرف سے وقتاً فوقتاً یاددہانی بھی جاری رہی لیکن سائینس کا معاملہ راقم ہذا کے لئے فلسفہ کی طرح آسان نہ تھا، فلسفہ تو عمر بھر پڑھتا پڑھاتا رہا تھا اور سائینس کے لئے پوری تیاری کی ضرورت تھی، جس میں کم و بیش تین چار سال لگ گئے اور درجنوں کتابیں پڑھنا پڑیں، اب ذرا درمیان میں مولانا شیروانی رحمۃ اللہ علیہ قدردان اعظم کی عظیم قدردانی کا بھی ایک اور نمونہ ملاحظہ فرماتے چلیں۔

مجھکو ابھی غالباً حیدر آباد (عثمانیہ یونیورسٹی) پہونچے چھ ماہ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ دو سو روپیہ نقد النقد کے ساتھ صدر الصدور مملکت آصفیہ کے دستخط سے ایک مراسلہ اس مضمون کا ملتا ہے کہ "مذہب و عقلیات" کے لکچر کے سلسلہ میں اور اس کے بعد جدید علم کلام پر جو ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا اس کی تکمیل کے لئے سردست دو سو روپیہ ماہوار دو سال کے لئے منظور کئے جاتے ہیں، امید ہے کہ کام شروع کر دیں گے، باقی اگر تکمیل کے لئے مزید توسیع درکار ہوئی تو اس کا بھی انتظام ہو جائے گا" یہ مراسلہ عین اس حال میں ملا کہ میں دمہ کے شدید دوروں سے بالکل فریش تھا اور خود شیروانی صاحب ممدوح اپنی بزرگانہ شفقت کی بنا پر دوسرے دن عصر اور مغرب کے درمیان ضرورت عیادت سے مشرف فرماتے، مراسلہ کے جواب میں پہلی معذوری تو یہی ممدوح کی خدمت میں لکھا دی کہ ان دوروں کی بدولت میرے لئے یونیورسٹی کے دو لکچر روزانہ پورا کرنا ہی دشوار ہو رہا ہے اس لئے سردست مزید کسی خدمت کی طرف توجہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہے، تاہم آنمخدوم کے حکم سے سرتابی بھی دشوار ہے اس لئے آنمخدوم کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ

نے شفا بخشی تو انشاء اللہ امتثال امر کی حتی الوسع سعادت حاصل کروں گا، لیکن دمہ کی شدت اور دوروں کا سلسلہ جس طرح چلتا رہا ان کی بدولت تو سال کا بیشتر حصہ بیماری کی رخصتوں میں گذر جاتا، کچھ حیدرآباد ہی میں اور کچھ لکھنؤ میں اسی دوران میں مولانا شیروانی کی شفقت اور قدردانی کا ایک اور لطیفہ سننے اور سنانے کا ہے میں لکھنؤ بیماری کی رخصت پر آیا ہوا تھا حیدرآباد میں میری ملازمت کے دو سال گذر جانے کے بعد حسب قاعدہ استقلال کی کارروائی پیش تھی، یہاں جسکو گزیٹڈ پوسٹ کہا جاتا ہے اس پر استقلال کیلئے وہاں خود اعلیٰ حضرت کی طرف سے منظوری عطا ہونا ضروری ہوتا ابھی غالباً کارروائی اعلیٰ حضرت تک پہونچی بھی نہ تھی کہ ڈیوڑھی کے حاضر باش کسی مہربان نے اعلیٰ حضرت کے کانوں تک یہ بات پہونچادی کہ شیروانی صاحب نے فلسفہ کا صدر ایسے شخص کو بنوادیا ہے جس کو فلسفہ کی کیا سرے سے کوئی ادنی سے ادنی سند بھی حاصل نہیں، اعلیٰ حضرت نے شروانی صاحب سے جواب طلب کر لیا، اب جو جواب شروانی صاحب نے دیا اس کا لطف ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اسی "مذہب و عقلیات" کے رسالہ کے ساتھ اپنا عریضہ منسلک کرکے یہ تحریر فرمایا کہ ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے انکے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ہذا کی چند سطروں کے ملاحظہ سے فرما سکتے ہیں، بہر حال اعلیٰ حضرت کی طرف سے اس جواب کے بعد استقلال کی کارروائی پر دستخط ہو گئے اور میرے پاس دوستوں وغیرہ کے مبارکباد کے تار آنے لگے، مگر مولانا ممدوح کی اس اعلیٰ ظرفی کی داد دیجئے کہ انھوں نے کسی اور کو کیا مولانا گیلانی تک کو اسکی کانوں کان خبر نہ ہونے دی جن کے متعلق وہ جانتے تھے کہ میرے ہم قیام وہم طعام ہی نہیں بلکہ دونوں کی رفاقت حیدرآباد میں ضرب المثل تھی، شروانی صاحب کی خدمت میں جب حاضری ہوتی تو دونوں کی ساتھ ہی ہوتی پھر بھی ان تک سے کوئی ذکر تک نہ فرمایا کہ اعلیٰ حضرت کی طرف سے کیا جواب طلب ہوا تھا اور میں نے کیا جواب دیا، بالآخر جب لکھنؤ سے رخصت ختم ہونے پر میں حیدرآباد

واپس گیا اور ممدوح کی خدمت میں حاضری ہوئی تب بہت مختصر الفاظ میں یہ قصہ سنایا کہ تمہارے استقلال کے وقت اعلیٰ حضرت نے یہ جواب طلب فرمایا تھا اور میں نے یہ جواب دیا، پھر اس سلسلہ میں کچھ کام کئے بغیر دو سو روپیہ جو ماہ بماہ آتے رہے ان کی رسید پر دستخط کر کے وصول کرتا اور اپنے خرچ میں لائے بغیر جمع کراتا رہا، جب قدردان اعظم خود ممدوح الشان حیدرآباد سے وظیفہ یاب ہو کر ہندوستان واپس آگئے اور اس کے بعد خود میرے وظیفہ پر علاحدگی کا وقت قریب آیا تو چھ مہینہ میں جو بارہ سو روپیہ وصول کئے تھے خط کے ساتھ رجسٹرار یونیورسٹی کو واپس کر دیئے کہ چونکہ ایک ماہ بھی یہ کام توجہ کے ساتھ نہیں کر سکا اسلئے کسی حق الخدمت کا بھی کسی طرح حقدار نہیں لہذا اس کی واپسی قبول ہو کر سرکاری خزانہ میں داخل کر کے مشکور فرمایا جائے اس درمیان میں جب حضرت حکیم الامت[1] علیہ الرحمۃ کی جوتیوں تک رسائی ہوئی تو یہ رسالہ ملاحظہ کیلئے انکی خدمت میں بھیج دیا تھا، جواب حسب عادت ایجازی اور اعجازی یہ عطا ہوا کہ یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے راقم عاجز کو جتنی مسرت حضرت تھانویؒ کے ان دو لفظوں سے ہوئی شاید ہی کسی کی طویل سے طویل تنقید و تبصرہ سے ہوئی ہو۔

اب اولاً و آخراً ہمارے حضرت علی میاں سلمہم کی قدر دانی و قدر افزائی انکی کتاب "محسن کتابیں" کے آخیر میں ملاحظہ ہو:۔

"مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب "مذہب و عقلیات"

---

[1] یہ سعادت بھی والد مرحوم کی دعا و تمنا کی برکت تھی جنھوں نے اپنے فرنگی محلی شیخ کے وصال کے بعد اپنا اصلاحی و تربیتی تعلق حضرت حکیم الامت ہی سے فرمایا تھا جسکے بہت سے خطوط والد مرحوم کی وفات کے بعد انکے کاغذات میں دستیاب ہوئے "النور" رسالہ بھی برابر منگواتے تھے اور کبھی کبھی بہن وغیرہ کے ذریعہ میرے پاس بھی پڑھنے کے لئے بھیج دیتے لیکن میں اس وقت تمامتر شلیت اور ندویت کے زیر اثر تھا اسکی کیا قدر کرتا۔

پر نظر پڑی جسکو ذوق و ذہن نے پورے طور پر اپنالیا اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا بلکہ جس قدر پڑھا "ان ھم الا یخرصون" اور "کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتھم تاویلہ" کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی"۔[1]

حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کے "مذہبی آہنی قلعہ" کی اس سے بڑھکر اور کیا شرح ہو سکتی جو حضرت علی میاں کے قلم نے فرمائی، اس سلسلہ میں حضرت علی میاں ممدوح کی طالب علم کی راہ میں تواضع کی ایک انتہائی کرامت بھی سننے سنانے کی یاد آگئی "مذہب و عقلیات" کے جس چند ورقہ رسالہ کی ممدوح نے اتنی تحسین فرمائی اس کے دوران تحریر ہی میں ایک طرف مجھ پر عقل و عقلیت خصوصاً اس کی مادیت اور ارتقار کے نظریات سے عین بے عقلی کا اثر پڑا تھا، دوسری طرف اسی راہ سے قرآن مجید سے کچھ مناسبت محسوس ہونے لگی تھی۔

جب سال کی بڑی تعطیلات میں لکھنؤ آتا تو ندوہ کے اوپر کے درجوں کے کچھ طلبہ قریب کی کسی مسجد میں آجاتے اور ان سے اپنی بھڑاس نکالتا رہتا، ان میں کبھی کبھی علی میاں بھی آبیٹھتے بلکہ غالباً حیدرآباد کے زمانۂ تعلق میں کسی سال کی بڑی تعطیل میں آیا ہوا تھا تو غالباً کئی ہفتہ اپنے بعض اعزہ و احباب کے ساتھ روزانہ ہی کم و بیش دو میل کی مسافت طے فرما کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے تشریف لاتے۔

اب خیال کرتا ہوں کہ عرب و عجم کے صاحب علم و قلم حضرت علی میاں کے مقام کو کچھ بھی اس وقت

---

[1] محسن کتابیں صفحہ ۱۸۱

پہچان سکتا تو یقیناً اپنی جگہ چھوڑ کر طالب علموں کی صف میں جا بیٹھتا، من تواضع للہ رفعہ اللہ کی یہ کیسی جیتی جاگتی مثال ہے کہ جو آج ان کے سامنے طفل مکتب ہے اس سے بھی انکو کوئی بات کام کی ملتی نظر آتی تو اس میں تامل نہ فرماتے، بارک اللہ فی برکاتہم "مذہب اور سائینس" کی کتاب میں بھی انھیں کی برکات کا بڑا حصہ ہے۔

اور اب الحمد للہ مذہب اور سائینس کے نام سے پیش کش کتاب بھی انھیں کے قائم فرمودہ ادارہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" سے شائع ہو رہی ہے، اللہ تعالےٰ حضرات بالا کی برکات سے اس پیش کش کو بھی پیش کرنیوالے کی دنیا و آخرت کے لئے قبول فرمائیں۔

---
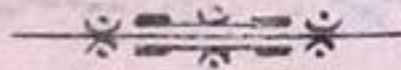
# تشکر

رسولِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص بندوں کا شکر نہیں ادا کرتا وہ خدا کا بھی ناشکر گذار ہے "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ" اس ہیچمداں کے پیش کش اوراق پر سب سے بڑا اس کے مسلم و مستند فاضل سائنس مقدمہ نگار جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد کے رفیق قدیم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی زادہُ اللہ صدقاً (حال وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی پاکستان) کا ہے۔ انشاء اللہ ان کے اس فاضلانہ مقدمہ ہی کی بدولت امید ہے کہ کتاب جدید و قدیم دونوں طبقات کی نظر میں کچھ نہ کچھ قابل توجہ ہو جائے گی، ایک بڑا احسان انگریزی کے ان اکابر سائنس کا ہے جنھوں نے جدید ترین بیسویں صدی کے خالص سائنسی مسائل عام فہم انگریزی میں منتقل کر کے ایک ایسے خود ساختہ انگریزی داں کے لئے قابل استفادہ کر دیا ہے، جو سائنس کیا کوئی ادنی سے ادنی انگریزی زبان کی سند بھی نہیں رکھتا۔ پھر بھی

خالص سائنسی مسائل سے ایسی درجنوں کتابوں سے گذشتہ چوتھائی صدی تک برابر بےتکلف استفادہ کرتا رہا، جس کا اندازہ اصل کتاب کے بکثرت حوالوں سے ہوگا۔

مزید برآں فاضل مقدمہ نگار نے اس مقدمہ ہی کے سلسلہ میں ایک اور بڑا کام فرمادیا ہے کہ بیسویں صدی کی سائنس میں جو بھونچالی انقلاب آیا ہے اس کا بھی ایک اچھا خاصہ اجمالی جائزہ لے لیا ہے، مثلاً نظریۂ اضافیت جس کے وہ خصوصی ماہر ہیں۔

آگے ذرا چند سطریں خود فاضل مقدمہ نگار کے قلم سے پڑھ لیں۔

"زمان و مکان، مادہ و توانائی، عنصر و قوت جیسے بنیادی تصورات کے بدلنے سے علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق ہو گیا ہے، نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائے گی۔ اور محض قوانین حرکت کی بنا پر علم ریاضی کی مدد سے ازل سے ابد تک اس شے کی تمام حالتوں کی پیشبندی کی جاسکے گی۔

میکانکس کا یہی مسئلہ تھا جو مادہ پرستوں کے لئے حکم فیصل کا کام دیتا تھا، اور جس کی بنا پر کسی خالق کائنات کے تصور کو وہ غیر ضروری قرار دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک، کائنات کی ہر حالت ہر لحہ متعین ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں کی بنا پر پروفیسر ہائزنبرگ نے ۱۹۲۷ء میں یہ بتایا کہ مظاہر فطرت میں تعین یا جبر نہیں بلکہ عدم تعین جاری ساری ہے۔

اس کے بعد سے طبعی سائنس کا مسلم قانون یہ ہے کہ نہ صرف کائنات بلکہ اسکے

کسی حصہ یہاں تک کہ کسی ایک ذرہ کا بھی مستقبل متعین نہیں بلکہ وہ کئی ممکن حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کر سکتا ہے۔"

لیجئے، عقل و فلسفہ کی دنیا میں علت و معلول کا جو قانون ازلی و ابدی حیثیت سے مسلم چلا آ رہا تھا، بیسویں صدی کی سائنس نے اس کا بھی بخیہ ادھیڑ دیا۔ اور اگر علت و معلول یا قانون علیت کا جبر کسی ذرہ میں بھی کارفرما نہیں تو پھر ایک اختیار و ارادہ والی ذات کے اختیار و مشیت کے سوا کوئی دوسرا قابل قبول و معقول احتمال سچ پوچھئے تو رہا ہی کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ انگریزی میں کسی نے کوئی مختصر اور عام فہم کتاب بیسویں صدی کے تازہ ترین سائنسی انقلابات پر اسی طرح لکھدی ہوگی جس طرح فلسفہ پر "پرائمر آف فلاسفی" کے نام سے ریو پاٹ نے لکھی ہے اور جس کا ترجمہ راقم الحروف کی خواہش پر ڈاکٹر میر ولی الدین کے قلم نے اردو میں بھی کر دیا ہے جو دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہو گیا ہے،

البتہ دو مشہور سائنس دانوں جے۔ ڈبلو۔ این۔ سلیوان اور والٹر گریسن[1] نے مل کر چوبیس پندرہ روزہ موقت رسالوں[2] میں بیسویں صدی کے قریباً سارے سائنسی علوم کے تازہ ترین انقلابوں یا ترقیوں کو ایسے عام فہم انداز میں جمع کر کرا دیا ہے کہ ان کے خاص خاص حصوں کا اگر اردو میں کوئی سائنس داں خصوصاً طبعیات (PHYSICS)

---

[1] (J. W. N. SULLIVAN AND WALTER GRIERSON)

[2] ان رسالوں کا انگریزی نام "آوٹ لائن آف ماڈرن بلیف" ہے، جسکے تحتی عنوانات "ماڈرن سائنس"، "ماڈرن تھاٹ" اور "ریجن تھاٹ" ہیں۔ یہ رسالے جو ایک لطیفۂ غیبی کے طور پر دستیاب ہو گئے تھے اب میرے اور ہمارے مولانا دریابادی کے پاس محفوظ ہیں۔

کا ماہر قلم منتقل کردے تو ہمارے حضرت علی میاں کے ادارہ تحقیقات و نشریات کا بڑا کارنامہ نہ صرف عام عربی و دینی دارالعلوموں خصوصاً خود ندوہ کے حق میں بہت زیادہ انشاء اللہ کارآمد ہوگا۔
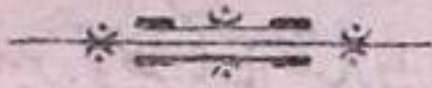
# مقدمہ

از ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی

(حال وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے جدید و قدیم سائنسی اور روائتی علوم یعنی معقولات اور منقولات کی تفریق ختم کر کے ایک ایسی درسگاہ بنانے کی کوشش کی جس میں علم کو بحیثیت مجموعی ایک وحدت کے طور پر پڑھایا اور سیکھا جا سکے، اسی اصول کے تحت برصغیر کے تمام گوشوں سے ایسے منتخب علمار جمع کئے گئے جو علم کی کسی ایک شاخ کے ماہر ہونے کے علاوہ وسیع نظر رکھتے اور مختلف شاخوں کے باہمی ربط اور ایک دوسرے پر ان کے اثرات سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ سائنس، آرٹس، انجینئری اور طب وغیرہ مضامین کے شعبوں (فیکلٹیوں) کے ساتھ ساتھ انہی کے طرز پر ایک فیکلٹی دینیات کی بھی بنائی گئی اور اس فیکلٹی کے طلباء کو سائنس اور آرٹس کے مضامین سے واقف کرایا گیا، اسی طرح ان جدید علوم کے طلبار کے لئے دینیات

کی تعلیم بھی بی۔ اے کے درجہ تک لازمی قرار دی گئی جس میں اسلام کے عقائد اور ارکان ہی کی تعلیم نہیں بلکہ مذہب کے بنیادی اصول اور اس کا فلسفہ بھی بتایا جاتا تھا اور سائنس کے نام پر جو غلط فہمیاں پیدا کر کے گمراہی اور الحاد پھیلایا جا رہا تھا اس کی تردید کی جاتی تھی۔

خوش قسمتی سے دین و دانش کے اس مضمون کو پڑھانے کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور جیسا باکمال استاد میسر آگیا تھا جن کی تفہیم اور اندازِ بیان اس قدر دل نشین اور دلکش تھا کہ تمام طلبا ران کے درسوں میں جوق در جوق شریک ہوتے اور ان کے لکچروں کو غیر معمولی انہماک کے ساتھ سنا کرتے تھے، راقم الحروف کو بھی ان کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اور انہی کے توسط سے حضرت مولانا عبد الباری ندوی مدظلہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، جامعہ میں کم و بیش بیس سال تک مولانا کی رفاقت حاصل رہی، حضرت مولانا شعبۂ فلسفہ سے متعلق تھے اور میں شعبہ ریاضی سے حضرت مولانا قدیم و جدید فلسفہ اور علم الکلام سے تو اچھی طرح واقف ہی تھے لیکن اس کے ساتھ وہ جدید سائنس کے اہم اصول اور نتائج اور فلسفہ اور کلام پر ان کے اثرات سے بھی واقف ہونا چاہتے تھے ادھر میں خود اضافیت اور کوانٹم ( QUANTUM ) کے ریاضیاتی نظریوں پر درس دیا کرتا تھا اور ظاہر ہے کہ فلسفہ اور کلام پر ان دونوں نظریوں کا بڑا گہرا اثر مرتب ہو رہا تھا، اسی تعلق سے مجھے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور ان مسائل پر اکثر گفتگو رہی۔ گردشِ ایام کے سبب گذشتہ بیس سال کے دوران حضرت مولانا سے نیاز تو حاصل نہیں ہو سکا البتہ وقتاً فوقتاً خط و کتابت کے ذریعے یہ معلوم ہوتا رہا کہ موصوف انہی مسائل پر غور و فکر کرنے کے بعد فلسفہ، کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر ایک کتاب کی تصنیف میں مصروف ہیں

چند ماہ قبل حضرت مولانا نے بذریعہ خط ارشاد فرمایا کہ اس کتاب پر مقدمہ تحریر کردوں
حضرت مولانا کی نظر عنایت تو شروع ہی سے مبذول رہی ہے لیکن میرے لئے یہ مشکل
آپڑی ہے کہ میں یہ جسارت کس طرح کروں۔ بہرحال جب حضرت مولانا نے ازراہِ ذرہ نوازی
یہ سعادت بخشی ہے تو اس کو قبول نہ کرنا کفرانِ نعمت کے مترادف ہوتا، امتثال امر کے
طور پر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

یوں تو میں ایک عرصہ سے واقف تھا کہ حضرت مولانا کس گہری نظر سے ان حقائق
کا مطالعہ کر رہے ہیں، جو فلسفہ، کلام اور سائنس کے امتزاج سے منکشف ہوئے ہیں لیکن
اس کتاب کے مسودہ کو پڑھنے کے بعد ہی پتہ چلا کہ حضرت مولانا کا مطالعہ کس قدر وسیع
رہا ہے، اور انھوں نے قدیم یونانی فلسفہ سے لے کر آج تک بڑے بڑے علماء اور حکماء
کی اصل تصنیفوں اور مقالات سے اپنے موضوع کے متعلق کس طرح قیمتی مواد حاصل کیا
ہے اور پھر اس مواد کی تحلیل اور تشریح کے بعد ایک مدلّل پیرایہ میں کیسے صحیح نتیجے اخذ
کئے ہیں۔

راقم الحروف نے بھی گذشتہ پچیس تیس سال کے دوران زمان و مکاں، جبر و قدر
اور سائنس اور مذہب سے متعلق متعدد تقریریں کی ہیں اور متفرق مضامین لکھے ہیں جو مختلف
رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس لئے حضرت مولانا کی کتاب کو پڑھ کر ایک گونہ ہمت افزائی
اور مسرت ہوئی کہ دونوں کے خیالات میں کس قدر توافق اور ہم آہنگی ہے، تعجب اس لئے
نہیں ہوا کہ دونوں کا علم اور طرز استدلال ایک ہی مبدأ فیض سے حاصل ہوا ہے،

حضرت مولانا نے بحث کا آغاز اس نکتہ سے کیا ہے کہ انسان کو بقول غالب " ہے
جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں " یا بقول اقبال " طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد " اقبال نے

"اسرارِ خودی" میں تفصیل سے بتایا ہے کہ انسانیت اور خودی کی تکمیل تخلیقِ مقاصد ہی سے ہوتی ہے اور حضرت مولانا عبدالباری بھی نہایت شرح و بسط کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ یہی "نامحدودیت طلبی" انسان کا طرۂ امتیاز ہے اور اس مسلسل تلاش اور جستجو کا دارومدار اس کے فطری "شعورِ غیب" پر ہوتا ہے، اسی ایمان بالغیب کا تقاضا ہے کہ انسان نہ تو علم میں کسی ایسی حد پر ٹھہر ناگوارا کرتا ہے جس کے آگے کوئی جہل باقی رہ جائے اور نہ قوت و قدرت کے کسی ایسے درجہ پر قانع رہتا ہے جس کے بعد کوئی چیز اس کی طاقت سے باہر رہ جائے، اسی لئے قرآن میں انسان کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہا گیا ہے، انسان کو جس غیب کا علم ہوتا ہے وہ اعتباری اور اضافی ہے اور اسی کائنات اور اس کی درمیانی حالتوں تک محدود ہے غیبِ مطلق اور تخلیق کائنات کی ابتدا اور انتہا کے متعلق اس کو فلسفہ اور سائنس کی مدد سے کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکتا کیونکہ عقلِ محض اور حواسِ انسانی کی رسائی اس حد تک نہیں ہے،

اس کے بعد مولانا نے متعدد صفحات پر پھیلی ہوئی ایک طویل تشریح بیان فرمائی ہے جس میں بڑے بڑے سائنس دانوں کے مقولوں کی مدد سے مادہ اور زمان و مکان کے متعلق جدید تصور پیش کئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ اب نہ تو مادہ ایسی ٹھوس شے ہے اور نہ زمان و مکان ایسے مطلق تصور ہیں جیسے ۱۹ ویں صدی کے آخر تک سمجھا جاتا تھا، اس ضمن میں حضرت مولانا نے راقم الحروف سے ایک گفتگو کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ نظریۂ اضافیت اور "مکان ۔ زمان" کے جدید تصور کو "کما حقہ" سمجھنے کے لئے علم ریاضی سے واقفیت کی ضرورت ہے ۔ اس جملہ میں سب سے اہم اور کلیدی لفظ "کما حقہ" ہے اور یہ حقیقت آج بھی اسی طرح صحیح ہے جس طرح حضرت مولانا سے گفتگو کے وقت صحیح تھی، چنانچہ اس کا کچھ اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اکثر شارحین جو ریاضیات سے پوری طرح

واقف نہیں ہوتے اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ نظریہ اضافیت نے زمان کو مکاں کا ایک جزو بنا دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ مکاں اور زماں دونوں بھی اجزا ہیں ایک تیسرے کل کے جس کو "مکاں۔زماں" مسلسلہ" (SPACE-TIME-CONTINUUM) کہتے ہیں اور جو ایک "چار ابعادی سمتیہ (FOUR DIMENSIONAL VECTOR) ہے اس کو عام فہم زبان میں ٹھیک ٹھیک بیان کرنا امر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کچھ تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اگر ایک ہی واقعہ کو دو مختلف مشاہد، جو ایک دوسرے کی اضافت سے متحرک ہوں، مقابلہ کریں تو اس مقابلہ کے لئے (LORENTZ) کا جو استحالہ (TRANSFORMATION) استعمال کرنا پڑے گا اس کے فارمولوں میں نہ صرف مکاں کے فارمولے میں زماں بھی داخل ہو گا بلکہ زماں کے فارمولے میں مکاں بھی شامل ہو گا۔ یعنی مکاں اور زماں دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہوں گے۔ نیوٹن کے نظریہ میں یہ بات نہیں تھی بلکہ زماں بالکل مطلق تھا اور دو مختلف مشاہدین کے مقام یا حرکت کا زماں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، اور زماں کے فارمولے میں مکاں کبھی شامل نہیں ہوتا تھا، اگرچہ مکاں کے فارمولے میں زماں شامل ہوتا تھا، ایک ریاضی داں کہے گا کہ بس "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" لیکن غیر ریاضی داں شاید اس کو "اتنی سی بات" ہی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں بلکہ بہت ممکن ہے اس "تشریح" کو بھی تتمہ اور تشریح طلب سمجھیں۔

بہرحال پیش نظر کتاب میں جو نتیجے اخذ کئے گئے ہیں چونکہ ان کا سارا دار و مدار مادہ، توانائی اور زماں و مکاں کے جدید تصورات پر ہے اور اگرچہ ان تصورات کو مولانا نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تصورات کو یہاں مختصر طور پر ایک جگہ پیش کر دیا جائے تاکہ قارئین کو اصل کتاب کے مطالعہ میں سہولت ہو۔

جب نیوٹن نے سترہویں صدی میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین ......... کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی فرانس کے مشہور ریاضی داں لاپلاس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکانکس ایک ہی ہو سکتی ہے، اور اس میکانکس کو نیوٹن نے دریافت کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا اب اس کے بعد طبیعی سائنس میں کسی کے لئے کچھ کرنا باقی نہیں ہے ۱۹ ویں صدی میں اس میکانکس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ نہ صرف طبعی سائنس بلکہ حیاتی علوم میں بھی اس کا اطلاق کیا جانے لگا اور انسانی اعضا بلکہ دماغ کے افعال کی توجیہہ بھی میکانی اصول پر ہونے لگی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ جس سائنس کی بنیاد اس میکانی اصول پر نہ ہو تو وہ باضابطہ سائنس ہی نہیں ہو سکتی۔

علوم فلکیات، طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات میں ۱۹ ویں صدی کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیت اور دہریت کو زبردست تقویت پہنچی اور ظاہر بیں لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ سائنس نے مذہب کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں کیونکہ اس میکانکس کی بموجب کائنات میں علت و معلول کا ایک سلسلہ کارفرما ہے جس کی بنا پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تشکیل بھی ہو رہی ہے، اور نہ تو کسی خالق کی ضرورت ہے اور نہ قیوم کی۔

علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا، مادہ اور توانائی ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زماں و مکاں اور علت و معلول جیسے بنیادی

تصور ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا، ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔

انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور تھے۔ مادہ کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مجسم شے ہے جو ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کرتی ہے اور جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے جس کو کم و بیش یا معدوم نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی مادی شے حرکت کرتی ہے تو وہ ایک ہی خط میں ایک ذرہ کی طرح حرکت کرتی ہے، آواز یا روشنی کی موجوں کی طرح پوری فضا میں نہیں پھیل جاتی۔ اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی مجسم شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلا شرکت غیرے گھیرتی ہے، اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا اور وہ ذرہ کی طرح حرکت نہیں کرتی بلکہ موجوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے

جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہو گیا ہے اور تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں۔ کبھی مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی توانائی مادہ میں، کسی مادی شے کی کمیت مستقل نہیں بلکہ اس کی حرکت پر منحصر ہوتی ہے اور رفتار کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ ایک مادی شے کبھی ذرے کی طرح ایک خط میں حرکت کرتی ہے اور کبھی موجوں کی طرح پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، مادہ کے توانائی میں منتقل ہونے کا یہی اصل اصول ہے جس کی بنا پر ایٹم بم بنایا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۰ء میں پلانک (PLANCK) نے کوانٹم (QUANTUM) کا انکشاف کیا اور بتایا کہ توانائی اور مادی نظام کی حالتوں میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ ایک خاص قلیل ترین مقدار یعنی کوانٹم کے اضعاف (MULTIPLES) کے

متناسب ہوتی ہے۔ اس انکشاف کے بعد قدیم ترین زمانے سے طبیعی کائنات میں تغیر و تبدل کے مسلسل اور تدریجی ہونے کا جو تصور چلا آ رہا تھا وہ ختم ہو گیا اور اس کی وجہ سے نیوٹن کی میکانکس میں ایک غیر معمولی انقلاب رونما ہوا۔

ایٹم (جوہر) کے متعلق ۱۸۹۵ء تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادہ کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے بعد پتہ چلا کہ ہر ایٹم کے اندر بہت سے اور چھوٹے ذرے ہوتے ہیں جن کو الکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کہتے ہیں۔ کسی ایٹم کا مادہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ ذرے اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے اور چند معینہ مداروں پر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایٹم کے مختلف ذروں کے درمیان اسی طرح وسیع خلا ہوتا ہے جیسے سورج اور اس کے سیاروں کے درمیان۔ ایٹم کے مرکزی حصہ میں جس کو "نیوکلیس" کہا جاتا ہے اس کا تقریباً تمام مادہ مرتکز ہوتا ہے اور اسی کی شکست و ریخت سے ایٹم کی ماہیت بھی بدل جاتی ہے اور ایٹمی توانائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اب تو ایسے ذروں کی ایک کثیر تعداد دریافت ہوئی ہے جو دو مادی ذروں یا ایک مادی ذرہ اور شعاع (RADIATION) کے باہمی تعامل کے دوران ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

کیمیائی عناصر سے متعلق سابقہ تصور یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے مادہ سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کی ہیئت اور ماہیت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے، جیسے ہائیڈروجن یا آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ۔ چند سال قبل تک خیال تھا کہ ایسے کیمیائی عنصروں کی تعداد ۹۲ ہے اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا وہی امر محال ہے جس کی تلاش میں ازمنۂ وسطیٰ میں متعدد کیمیاگروں نے اپنی عمریں ضائع کیں لیکن آج کل یہ کیمیاگری تجربہ خانہ میں ہر وقت کی جا رہی ہے اور بعض عناصر میں قدرتی طور پر بھی ہوتی رہتی ہے، ایک عنصر کے مختلف بہروپ ہوتے ہیں۔ جن کو

(ISOTOPE) کہا جاتا ہے اور تجربہ خانہ میں مصنوعی طور پر نہ صرف (ISOTOPE)
بلکہ نئے عناصر بھی بنائے جا رہے ہیں اور گذشتہ تیس سال میں تقریباً پندرہ نئے عنصر یورینیم
سے اوپر بنائے جا چکے ہیں۔

اسی مرحلہ پر زماں و مکاں کے جدید تصور کو بیان کرنا ضروری ہے، آئن شٹائن نے
۱۹۰۵ئہ میں نظریاتی اور تجرباتی دونوں قسم کی وجوہات کی بنا پر بتایا کہ مطلق مکان اور مطلق زماں
کا تصور جس کو نیوٹن اور اس سے قبل فلاسفہ اور حکماء نے پیش کیا تھا۔ اب قابل قبول نہیں رہا
آئن شٹائن نے مثالیں دے کر واضح کیا کہ دو واقعات کا ہم وقت ہونا ایک اضافی چیز ہے ایک
مشاہد زید کیلئے جو واقعات ہم وقت ہوں ضروری نہیں کہ دوسرے مشاہد بکر کے لئے بھی وہ
ہم وقت ہوں بلکہ یکے بعد دیگرے ہو سکتے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ وقت کے بہاؤ کی شرح کا بھی ان
دونوں کے لئے یکساں ہونا ضروری نہیں، غرض آئن شٹائن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زماں یعنی وقت
کوئی مطلق شے نہیں بلکہ اضافی ہے۔ ہر مشاہد کا ایک خاص ذاتی وقت ہوتا ہے اور اگر
دو مشاہد بلحاظ ایک دوسرے کے اضافی حرکت کر رہے ہوں تو ان کے وقت بھی ایک دوسرے
سے مختلف ہوں گے۔

اسی طرح مکاں یعنی فضا بھی مطلق نہیں بلکہ اضافی ہے کیونکہ دو متحرک اشیاء کے
درمیانی فاصلے کے کوئی معنی نہیں جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کس خاص وقت کے لئے یہ
فاصلہ ناپا جا رہا ہے اور کونسا مشاہد اس فاصلے کو ناپ رہا ہے۔ اب چونکہ وقت خود اضافی
ہے اس لئے فاصلہ جو وقت پر منحصر ہے، لازماً اضافی ہوگا۔

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور (اقبال)

غرض نظریۂ اضافیت کی رو سے زماں اور مکاں مطلق اور ایک دوسرے سے آزاد نہیں بلکہ اضافی اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں کائنات میں دو مختلف چیزیں مکاں اور زماں نہیں بلکہ ایک ہی شئے "مکاں۔ زماں" پائی جاتی ہے جس میں مکاں اور زماں گھل مل جاتے ہیں اور ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹ ویں صدی تک دنیا کا جو سہ ابعادی تصور رائج تھا، اس کی بجائے اب چار ابعاد (DIMENSION) مان لئے گئے ہیں کیونکہ کائنات محض مقاموں اور نقطوں کا مجموعہ نہیں بلکہ واقعات پر مشتمل ہوتی ہے اور کسی واقعہ کو متعین کرنے کے لئے صرف اس کے جائے وقوع کا بیان کرنا کافی نہیں بلکہ یہ بتانا بھی لازمی ہے کہ وہ واقعہ کس وقت ظہور میں آیا۔

نظریۂ اضافیت کی بنا پر آئن شٹائن نے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا کہ ایک مشاہد کیلئے کسی بھی شے کی کمیت میں، جو اس مشاہد کے لحاظ سے حرکت میں ہو، اضافہ ہونا لازمی ہے تجربہ سے بھی اس نتیجہ کی تصدیق ہوئی اور اس طرح کمیت اور وزن بھی اضافی اشیاء قرار پائیں۔

نیوٹن نے مکاں، زماں اور کمیت کے ساتھ قوت کو بھی مطلق تصور کیا تھا لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ مکاں، زماں اور کمیت اضافی مفہوم ہیں، مختلف مشاہد اپنے اپنے نظام میں ان کی مختلف قیمتیں حاصل کرتے ہیں، قوت بھی چونکہ فاصلہ اور کمیت پر منحصر ہوتی ہے، اس لئے اپنے نظریۂ اضافیت کو توسیع دے کر آئن شٹائن نے بتایا کہ زماں، مکاں اور کمیت کی طرح قوت بھی ایک اضافی تصور ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر آئن شٹائن نے کہا کہ قوت کا علیحدہ تصور ہی بے کار ہے اور حقیقت تک ہماری رسائی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ قوت کوئی خارجی شئے نہیں جو مکاں۔ زماں سے علیحدہ ہو بلکہ اسی مکان۔ زمان

کی ایک حالت ہے جو ہم کو قوت کے طور پر محسوس ہوتی ہے۔ جتنے تجربے اور مشاہدے ہیں ان کی توجیہہ مکان ۔ زمان کی حالتوں کے لحاظ سے کی جا سکتی ہے، علیحدہ قوت کا مفہوم داخل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس کو سمجھنے کے لئے چند مثالیں مفید ہوں گی۔ ایک دریا کا پانی پہاڑ سے نکل کر وادی میں بہتے ہوئے سمندر میں جا گرتا ہے تو کیا ہم کہتے ہیں کہ دریا کو سمندر سے عشق ہے اور اس عشق کی قوت پانی کو مجبور کرتی ہے کہ سمندر میں جا گرے۔ ہم یہی کہیں گے کہ یہاں عشق کی قوت کا مفہوم داخل کرنا غیر ضروری ہے، دریا اس لئے نہیں بہتا کہ سمندر اسکو کھینچتا ہے بلکہ اس لئے بہتا ہے کہ اس مقام پر زمین کی نوعیت ہی اس طرح کی ہے اور یہ اس کے لئے آسان ترین راستہ ہے،

اسی طرح کسی جسم کی حرکت کے متعلق یہ کہنا کہ حرکت ایک قوت کی وجہ سے ہوتی ہے غیر ضروری پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہم جہاں واقع ہے اس کے ارد گرد مکاں ۔ زماں کی حالت ہی کچھ ایسی ہے کہ جسم کا آسان ترین راستہ وہی ہے جو وہ اختیار کرتا ہے۔ زمین اگر سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے کہ زمین اور سورج کے درمیان تجاذب کی قوت فرض کی جائے جو زمین کو گھما رہی ہے۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ سورج کے اطراف مکاں ۔ زماں ایک خاص حالت میں ہے اور اس مکاں ۔ زماں میں زمین اپنے آسان ترین راستہ پر جا رہی ہے اور قوت تجاذب کا کوئی وجود ہی نہیں ہے،

اسی قسم کی تحلیل و تشریح کے ذریعے اضافیت کے عام نظریہ کی بنا پر آئن سٹائن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہم جس کو "قوت" کہتے ہیں، وہ کوئی علیحدہ چیز نہیں بلکہ صرف مکاں زماں کی ہی ایک خاصیت ہے، کائنات کی ہر شے اپنے گرد و پیش کے مکاں ۔ زماں

میں آسان ترین راستہ (GEODESIC) اختیار کرتی ہے، تمام اجسام کی حرکتیں اسی اصول کی بنا پر حاصل کی جاسکتی ہیں، اور آئن شٹائن کا یہی قانون ہے جو نئی طبیعیات میں نیوٹن کے قانون تجاذب کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ آئن شٹائن کے نظریہ اضافیت میں یہ بھی بتایا کہ مادہ کی موجودگی مکاں۔زماں کی ... خاصیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے، تجربے، مشاہدے اور نظریئے سب اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ ... مکان۔زمان اس قسم کی "چپٹی" نہیں ہے جس کو اقلیدس کی جیومٹری میں مان لیا گیا ہے، بلکہ ... مکاں۔زماں کی جیومٹری "نا اقلیدسی" قسم کی ہے جس میں فیثاغورث کا مشہور مسئلہ صحیح نہیں رہتا، چونکہ اقلیدسی فضا کو جس کی جیومٹری ایک مستوی سطح (PLANE) کی جیومٹری کے مماثل ہے "چپٹی فضا" کہتے ہیں۔ اس لئے اس نئی نا اقلیدسی فضا (مکان۔زمان) کو جس کی جیومٹری ایک کرہ کی سطح کی جیومٹری کے مماثل ہے، منحنی یا مڑی ہوئی ... (CURVED) فضا کہتے ہیں اور فضا کا یہ "پیچ و خم" اب ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے۔

نظریہ اضافیت کے انکشاف سے قبل مکان یعنی فضا کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے اگرچہ ہمارے حواس اور تجربے ایک خاص حصہ سے آگے کی کچھ خبر نہیں دیتے۔ لیکن نظریۂ اضافیت کی بنا پر آئن شٹائن نے بتایا کہ ... کائنات متناہی ہے اور اس کے کسی دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ معین ہے لیکن چونکہ کائنات کرہ یا گولہ کی شکل کی ہے اس لئے اس پر کہیں کوئی حد یا کنارہ نہیں ہے اور جب تک چاہیں اس کے گرد سفر کرسکتے ہیں اسی لئے کائنات کو

متناہی (FINITE) مگر غیر محدود (UNBOUNDED) کہتے ہیں یہ نتیجہ فضا کے مڑی ہوئی (CURVED) ہونے کا ایک معمولی نتیجہ ہے۔

آئن شٹائن نے نظریہ اضافیت کی بنا پر یہ ثابت کیا کہ توانائی (انرجی) بھی ایک جمود (INERTIA) رکھتی ہے جس کو عرف عام میں وزن کہا جاتا ہے۔ مادہ اور توانائی دو مختلف اشیا نہیں بلکہ ایک ہی شے کے دو مختلف بہروپ ہیں، روشنی کی شعاع صرف اسی وقت سیدھے خط میں جاتی ہے جبکہ فضا میں کوئی مادہ نہ ہو۔ لیکن اگر یہی شعاع کسی مادی جسم کے قریب سے گذرے تو اپنے سیدھے راستے سے مڑ جائے گی۔ آئن شٹائن نے ایک فارمولا بھی معلوم کیا جو بتاتا ہے کہ کسی مادی شے سے کس قدر توانائی اور کسی توانائی سے کس قدر مادہ حاصل ہوتا ہے۔ مادہ اور توانائی میں کوئی اساسی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک ہی شے کبھی ذرہ کے خواص کا اظہار کرتی ہے اور کبھی موج کے خواص کا۔

زماں و مکاں، مادہ اور توانائی، عنصر اور قوت جیسے بنیادی تصورات کے بدلنے کی وجہ سے علت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آگیا ہے۔ نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائے گی۔ اور محض قوانین حرکت کی بنا پر علم ریاضی کی مدد سے ازل سے ابد تک اس کی تمام حالتوں کی پیش بندی کی جا سکے گی۔ میکانکس کا یہی مسئلہ تھا، جو مادہ پرستوں کے لئے حکم فیصل کا کام دیتا تھا، اور جس کی بنا پر وہ کسی خالق کائنات کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے

..... کیونکہ ان کے نزدیک کائنات کی ہر حالت ہر لمحہ متعین ہے اور وہ اس کے مطابق خودبخود تشکیل پاتی چلی جارہی ہے۔

لیکن کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں کی بنا پر پروفیسر ہائی زن برگ نے ۱۹۲۷ء میں یہ بتایا کہ مظاہر فطرت میں تعین یا جبر نہیں بلکہ عدم تعین جاری و ساری ہے، اس کے بعد سے طبیعی سائنس کا مروجہ اور مسلمہ قانون یہ ہے کہ نہ صرف کائنات بلکہ اس کے کسی حصہ یہاں تک کہ کسی ایک ذرہ کا مستقبل بھی قطعی طور پر متعین نہیں ہے بلکہ وہ کئی ممکن حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کر سکتا ہے، اس طرح قوانینِ قدرت تعینی (DETERMINISTIC) نہیں بلکہ اوسطی یعنی (STATISTIAL) ہو جاتے ہیں۔

دراصل ہائی زن برگ کے اصول عدم تعین (PRINCIPLE OF INDETERMINACY) کے انکشاف سے قبل ہی بعض مشہور سائنس داں اس امر کا اعتراف کر رہے تھے کہ سائنس کے طریقوں سے اشیا اور مظاہر کی انتہائی حقیقت یا غایت کو نہ تو دریافت کیا جاسکتا ہے نہ یہ چیز سائنس کے دائرہ عمل میں ہے، ۱۹۲۲-۲۳ء کے بعد جب نیلسن بوہر (NEILS BOHR) کے کوانٹم نظریہ میں یکے بعد دیگرے متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں تو ۱۹۲۵-۲۶ء میں نئی کوانٹم میکانکس کی بنیاد رکھتے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اسی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریقۂ کار صحیح طور پر متعین نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی اصلی اور آخری ماہیت اور حقیقت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیا اور مظاہر میں باہمی ربط

اور تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر کہا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیت کیا ہے بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے۔

اس سے بھی آگے چلیے تو ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اساسی تصور میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ یہ انقلاب سائنس کے بنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے انیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے بنیادی قوانین استقرائی (INDUCTIVE) نوعیت کے ہوتے تھے۔ مثلاً قانون تجاذب ہی کو لیجیے۔ یہ قانون کہ کائنات کے کسی دو مادی اجسام یا ذروں کے درمیان ایک معین مقدار کی تجاذبی قوت پائی جاتی ہے، خاص مثالوں کی مدد سے اخذ کیا گیا تھا، اسی طرح برق و مقناطیس کے قوانین، یا روشنی کے منعکس اور منعطف یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے،

لیکن ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۵ء میں آئن شٹائن نے اپنے خاص اور عام نظریہ اضافیت کی تشکیل کے لئے جو قانون یا مفروضے (POSTULATES) اختیار کیے وہ استقرائی نہیں بلکہ "علمیاتی" (EPISTEMOLOGICAL) یعنی فلسفیانہ نوعیت کے ہیں۔ ان مفروضوں کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ... قوانین ایسے ہونے چاہئیں جو تمام مشاہدین کے لئے "غیر متغیر" (INVARIANT) یا "ہم متغیر" (CO-VARIANT) ہوں خواہ یہ مشاہدین کسی قسم کی حالت حرکت میں کیوں نہ ہوں۔ یہ مفروضے جن پر نظریۂ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے، استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی ہیں۔ اسی طرح ہائی زن برگ کا عدم تعین کا اصول جس پر جدید کوانٹم میکانکس کا دارومدار ہے، استقرائی نہیں بلکہ

علیاتی ہے۔

پروفیسر ریڈنگٹن نے سائنس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دلچسپ مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض کرو ایک سائنس داں کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی ہیں ناپتا ہے تو بزعم خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے کہ اس تالاب میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس فعل کو جب کوئی دوسرا شخص دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے کہ تمہیں اس قانون کے اخذ کرنے کے لئے تمام دن اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم محض اپنے جالی کو دیکھ کر جس کے تمام خانے ایک انچ طول کے ہیں، شروع ہی میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس جال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی جا سکتی جس کا طول ایک انچ سے کم ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قوانین فطرت کی تشکیل کے لئے علم کی نوعیت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر کے استقرائی قوانین کی بہ نسبت زیادہ دور رس اور دیر پا قوانین بنائے جا سکتے ہیں، کیوں کہ کوئی استقرائی قانون تو ایک بھی مخالف مثال (COUNTER EXAMPLE) کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتا ہے جیسا کہ نیوٹن کا قانون تجاذب، جس کو اس لئے مسترد کرنا پڑا کہ اس کی بنا پر سیارہ عطارد کا جو مدار محسوب کیا جاتا ہے وہ مشاہدہ کئے ہوئے مدار کے مقابلہ میں غلط ہے۔

طبیعی علوم کی انہی حالیہ ترقیوں کا بیان حضرت مولانا نے اکابرین سائنس جیسے آئن شٹائن، برٹرینڈ رسل، ہائی زن برگ، سر جیمز جینس اور سر آرتھر ریڈنگٹن وغیرہ کی تصنیفوں سے اقتباس کے طور پہ پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ مادیت اور جبر و تعین

کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ پھر انھوں نے دے کارت کے فلسفۂ شک کو تفصیل سے بیان کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ برکلے کے فلسفۂ تصوریت (IDEALISM) کو ماننے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ ان فلسفوں کے متعلق یہاں کچھ کہنا بے سود اور غیر ضروری ہے کیوں کہ حضرت مولانا نے ان کو اس کتاب میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع کے لئے مولائے روم فرماتے ہیں:۔

چند گاہش گام آہو خور است

بعد ازاں خود ناف آہو رہبر است (رومی)

بہر حال جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انھوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے بمصداق "کافر نتوانی نشد، ناچار مسلمان شو" خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لئے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن، (UNIVERSAL MIND) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہو گیا۔ حضرت مولانا عبد الباری نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لئے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں۔ یقینِ محکم حاصل کرنے اور دنیا و آخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کا یہ ایک نہایت اہم اور قابلِ تحسین کارنامہ ہے، جو انھوں نے اس کبر سنی میں اس قدر محنت شاقہ برداشت کرکے انجام دیا ہے۔

اور اس کے لئے وہ یقیناً عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور رہوں گے۔

فقط

محمد رضی الدین صدیقی

# "مقام آدمی"

یا

# خودشناسی

آدمیت احترام آدمی

باخبر شو از مقام آدمی

**"آدمیت" ہے کیا؟** کسی مخلوق کا صحیح مقصد و مدعا جاننے پہچاننے کی صحیح صورت ایک ہی ہے۔ عقل و مذہب، دین و دنیا ہر راہ سے پہلے کچھ اس کی نوعی یا خصوصی خلقت و فطرت کے تقاضوں یا مطالبات کو سمجھا جائے۔ پھر ان ہی مطالبات کی تحصیل و تکمیل اس کے خصوصی و امتیازی وجود و نمود کا مقصد و مدعا ہوگی۔ انسان کیا کسی موجود و مخلوق کا بھی اپنی اختصاصی و انفرادی ذات کے تقاضوں سے محروم ہونا یا کر دیا جانا اس کی ہلاکت کو دعوت دینا ہوگا، مچھلی جو پانی سے باہر آپڑے اس کی قسمت تڑپ تڑپ کر مرنا ہی ہوگی۔

انسان جو آج بیسویں صدی کی روز افزوں تمام کی مادی ترقیوں اور ظاہری و جسمانی

راحتوں کی فراوانیوں کے باوجود کم وبیش پوری دنیا جیسے انفرادی و اجتماعی بے چینی واضطراب، سیاسی وسماجی، قومی وبین اقوامی انتشار وخلفشار کا شکار ہو کر ماہیِ بے آب ہو رہی ہے، اس کی نظیر ان ترقیوں سے محرومی یا نام نہاد پس ماندگی کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلکہ جسم وظاہر اور جاہ ومال کی راحتوں اور فراوانیوں سے جو جتنا مالا مال یا بہ ظاہر آسودہ حال ہو گا قریب سے اس کے دل ودماغ یا باطن کو ذرا جھانک کر دیکھو تو سکھ چین یا سکون وعافیت سے اس کو اتنا ہی ویران یا ناآشنا پاؤ گے۔

اس لئے انسان کے دوسرے تمام مسائل سے پہلے اصل سوال یا مسئلۃ المسائل یہی ہے کہ انسان کے انسان ہونے کی حیثیت سے اس کی خاص الخاص تڑپ یا طلب وتشنگی ہے کیا؟ جس کی تدبیر وتشفی کے بغیر اس کی انسانیت کو کسی اور راہ سے تشفی وتسلی سے آشنا نہیں کیا جا سکتا،

ایک بڑی کمزوری بڑوں بڑوں تک کی یہ ہوتی ہے کہ بارہا اپنی دوربینی ہی کے انہماک میں قریب سے قریب تک کی پیش افتادہ حقیقت کو دیکھنے سے قاصر اور موٹی سی موٹی بات تک سمجھنے سے محروم رہ جاتے ہیں، کچھ ایسا ہی حال اگلے پچھلے مدعیانِ عقل وعلم کا انسان کو خود اپنے پہچاننے میں رہا۔ فلاطون جیسے فلسفی نے بھی نہ جانے ایسی بھونڈی اور بے پر کی بات کیسے اڑا دی کہ انسان "دو ٹانگوں والا بے پر کا جانور ہے" اس پر ریاضی وفلسفہ کا ایک نامور ماہر[1] دیکھو کس طرح بپھر پڑا کہ:۔

"انسان کیا ہی عجیب الخلقت واقع ہوا ہے! کیا ہی انوکھا! کیا ہی ہیولیٰ! کیا ہی مجموعہ اضداد! نادرۂ روزگار! ساری چیزوں پر فیصلہ صادر کرنے والا

---

[1] بلیز پاسکال (BLAISE PASCAL)

(ج) زمین کا ایک حقیر کیڑا! سچائی کا تحویلدار! بے یقینی اور غلطی کی گندی نالی!

کائنات کی آبرو بھی اور رسوائی بھی![1]"

انسان کی ذات و صفات خلقت و فطرت کے بارے میں بات صرف اس طرح کی شاعرانہ فلسفیانہ پریشانی و حیرانی تک ہی نہیں رہی۔ فرانس کے ایک بڑے نامی گرامی نوبل انعام پانے والے ڈاکٹر کاریل نے پوری ایک کتاب "نامعلوم انسان"[2] کے نام سے لکھ ڈالی کہ انسان نے گو بے شمار علوم و فنون کے کتب خانوں پر کتب خانے بھر ڈالے ہیں لیکن خود یہ یا اس کی انسانیت ہے کیا؟ اس سے جاہل ہی چلا جاتا ہے۔

"گو ہمارے پاس دنیا بھر کے علمائے سائنس و فلسفہ اور اشراقیہ یا سریہ (MYSTICS) کے فراہم کردہ معلومات و مشاہدات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے تاہم خود اپنی (انسانی) ذات و حقیقت کے صرف چند پہلو ہی کچھ گرفت میں آسکے ہیں۔ پوری طرح انسان کو ہم نے نہیں جانا ہے ایسی کچھ پراگندہ یا الگ الگ اجزا کا اس کو ایک معجون مرکب سمجھ رکھا ہے اور یہ اجزا بھی خود ساختہ ہیں۔[3]"

اسی طرح ایک اور بڑے عالم سائنس نے ایک ضخیم کتاب "سائنس کے ناحل مسائل" پر لکھ ڈالی ہے۔ اس میں بھی سائنس کا سب سے ناحل مسئلہ انسان کو قرار دیا ہے کہ:۔

"سائنس دان کسی بحث و مسئلہ میں اس سے زیادہ عاجز و درماندہ نہیں

---

[1] فلاسفی اینڈ ماڈرن سائنس مصنفہ (AMENABLE) طبع ثانی ص۴۳۳

[2] (Dr. ALEXS CARREL — "MAN THE UNKNOWN")

[3] تفصیلی حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو "نظام صلاح و اصلاح" ص۱۱۶ از راقم ہذا۔

جتنا خود انسان کے معاملہ میں۔ وہ ایٹم کو توڑ سکتا ہے۔ بعید سے بعید تاروں کی روشنی کی تحلیل وتجزی کر سکتا ہے، وہ بجلی کو غلام بنا سکتا ہے۔ لیکن یہی سائنس داں جب زندگی کی حقیقت اور اس سے بڑھ کر خود اپنی یا انسان کی حقیقت سمجھنا چاہتا ہے، تو مشکلات ہی مشکلات سے دوچار ہو جاتا ہے نہ زندگی قابو یافتہ (CONTROLLED) تجربہ (EXPERIMENT) کی متحمل (AMENABLE) ہے نہ انسان ہی۔[1]

ایک طرف یہ اعتراف جہل وعجز ہے، دوسری طرف سائنس ہی کا نام لے لگا کر ارتقائی رشتے ناتے سے انسان کو بس ایک زیادہ ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کا یا بڑھیا جانور (HIGHER ANIMAL) اور بندروں کا چچیرا بھائی ہونا گویا ایک مسلمہ واقعہ بن گیا ہے۔ یوں تو انسان کا ارتقائی نسب نامہ بندروں کیا زمین وآسمان کی ساری جاندار و بے جان مخلوقات سے ملایا جا سکتا ہے۔ بظاہر جس مادہ یا مادی عناصر وذرات کی ترکیب وترقی یافتہ صورت ہر جسم اور جسمانی مخلوق ہے، اس کی زیادہ یا سب سے زیادہ ترقی یافتہ یا بدلی ہوئی شکل وصورت، انسانی جسم وجسمانیت کی بھی نظر آتی ہے اور اسطرح انسان کیا ہر اعلیٰ وادنیٰ جسم رکھنے والی مخلوق کا جسمانی رشتہ اور کئی پشتوں میں کہیں نہ کہیں بس کنکر پتھر یا مادی ذرات جیسی اسرے سے بے جان وبے شعور موجودات جا ملے گا۔

لیکن سمجھنے سوچنے کی موٹی بات یہ ہے کہ ایسے عمومی وجسمانی اشتراکات کے باوجود ہر شئے جانی پہچانی اپنے خصوصی نوعی امتیازی صفات وآثار ہی سے جاتی ہے،

---

[1] (ناحل مسائل سائنس) (UNSOLVED PROBLEMS) مصنف (A.W. HASLET) ص ۱۹۵

ان کے باہمی امتیازات واختلافات ہی سے ہر چھوٹے بڑے ادنیٰ واعلیٰ وجود کی قدر وقیمت لگائی جاتی ہے۔ اور غرض وغایت قائم وتعین ہوتی۔ ہے، نہ کہ ان کے مابہ الاشتراکات سے، مٹی اور سونا مادی یا ۔۔۔ذی ذات ہی کی ادنیٰ واعلےٰ صورتیں ہیں پھر بھی نہ مٹی سونے کے بھاؤ بکتی ہے، نہ سونے کو مٹی سمجھا جاتا یا اس سے مٹی کا کام لیا جاتا ہے۔ اگر انسان اپنے "چچیرے بھائی" بندر کو مار ڈالے تو "ہنومان جی" کے تقدس واحترام کے باوجود خود "ہنومان گڑھی" (ہندوستان) کے بھی نئے پرانے کسی قانون کی رو سے قصاص میں اس انسان کو پھانسی نہ دیدی جائے گی۔

غرض ہر جاندار وبے جان کے مقصد ومدعا کا دارومدار تمام تر اس کی ان امتیازی خصوصیات وصفات اور ان ہی لوازم ومطالبات پر ہوتا ہے، جو دیگر موجودات ومخلوقات کے مقابلہ میں صرف اس کے ساتھ مخصوص یا صرف اس کی امتیازی واختصاصی خلقت وفطرت پر مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسان کی خاص الخاص امتیازی خلقت یا اس کی انسانیت کے مدنظر کائنات میں اس کا محل ومقام اور اس کی زندگی کے سارے مسائل کا صحیح حل معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے معلوم ہونے کی کلی بات یہی ہے کہ دوسری تمام مخلوقات کے مقابلہ میں اپنے بالکل انفرادی امتیازی وصف کے لحاظ سے آخر انسان یا اس کی انسانیت وآدمیت ہے کیا؟

جواب دو لفظوں میں ایک ہی ہے کہ انسانیت نام ہے "مجسم نامحدودیت طلبی" کا یعنی دیکھنے میں، تو انسان بے شک بندر یا بے پر کا دو ٹانگوں والا جانور ہی ہے۔ پھر بھی کھانے پینے، رہنے سہنے، جنے جنانے وغیرہ کی خالص حیوانی حاجتوں اور ضرورتوں تک میں دوسرے اعلیٰ سے اعلیٰ حیوانات تک کے برخلاف ـــــــــ کسی حد وانتہا پر

ٹھہرنا نہیں جانتا۔ بلکہ ہر راہ میں "ھل من مزید" کی طلب و تشنگی تیز سے تیز تر ہی ہوتی چلی جاتی ہے

**انسان کی نامحدودیت پسندی**

کچھ حد ہے "نامحدودیت پسندی" کی اس تڑپ کی کہ کھانوں، کپڑوں، مکانوں وغیرہ کی نری مادی وجسمانی یا حیوانی حاجتوں سے متعلق نت نئی ایجادات و مصنوعات نے کہنا چاہئے کہ سارے کرۂ ارض کو ان کی منڈی میں تبدیل کر دیا ہے۔ مختلف قوموں، ملکوں پھر ان کے افراد کے انفرادی ذوق کے کھانوں اور لباسوں ہی کو اگر ایک سلسلہ میں چنا جائے تو میلوں میل کی وسعت گھیر لے۔ ایک دفعہ بمبئی کے عجائب گھر میں غالباً صرف ہندوستان کے رنگا رنگ فقط سرپوشوں (ٹوپیوں پگڑیوں وغیرہ) سے بھرے ہوئے پورے ایک بڑے ہال کو دیکھا۔ ایک سر ہی کو ڈھانکنے کے لئے انسان نے جتنے طرح طرح کے سرپوش بنا ڈالے ہیں، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بس ان کی حد ختم ہو گئی، آگے کوئی نیا اضافہ نہ ہو سکے گا۔ کسی انگریزی اخبار میں مدت ہوئی ایک کارٹون دیکھا تھا کہ پیرس کی کوئی میڈم ٹوپی یا کوئی اور ملبوس خرید کر بھاگی جا رہی ہیں کہ گھر پہنچ کر جلد از جلد استعمال کر لیں ورنہ فیشن نہ بدل جائے! کیا یہ کارٹونی تصویر واقعہ کی کچھ بہت زیادہ مبالغہ آمیز مصوری ہے۔ توالد و تناسل کے سیدھے سادھے حیوانی عمل کے لئے کیا کسی دوسرے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے حیوان نے بھی کوک شاستر کی تخلیق کی۔ لیکن حضرت انسان کی حدود ناپسندی اس میدان میں بھی ملاحظہ ہو، کہیں پڑھا تھا کہ یورپ میں بوسہ بازی کے سیکڑوں طریقے ایجاد ہو چکے ہیں، تعداد ٹھیک یاد نہیں، مگر سیکڑوں ضرور تھی۔

کاشتکاری کا اکتشاف جو انسان نے اپنے ابتدائی تمدنی دور میں کر لیا تھا کہا جاتا ہے کہ یہی اس کے گروہی و تمدنی ارتقا کی بڑی بنیاد ہے۔ دوسرے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے

جانوروں کو ہم دیکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر بندروں ہی کو لیجیے کہ انسان کے کھیتوں باغوں وغیرہ کی پیداوار کو ان سے بچانا کتنا دشوار ہوتا ہے لیکن خود ان بندروں کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ نسل نے آج تک نہ ایک دانہ کی کاشت کی نہ کسی ایک پھل کا درخت لگایا، بخلاف اس کے انسان کی کسی حد پر دم نہ لینے والی فطرت زراعت کے کسی ابتدائی علم و دریافت پر کیا چین لینی آج تک اس کے ہر ہر شعبہ میں طرح طرح کے آلات و وسائل، انواع و اقسام کی ایجادات کا سلسلہ نہ صرف جاری ہے بلکہ کسی حد پر کبھی رکنے والا نہیں، ہمارے ہندوستان کے آم کے ایک پھل ہی کو لو کہ بندر انسان کے لگائے باغوں ہی سے نہیں اس کے ہاتھ سے بھی زبردستی چھین جھپٹ کر بڑے شوق سے کھائے گا۔ مگر اس کی اونچی سے اونچی قسم نے بھی خود آم کا ایک درخت کبھی نہ لگایا، دوسری طرف انسان کی بے قرار فطرت کا یہ عالم کہ اپنی ہی جوار (اودھ لکھنؤ) میں دیکھتے ہیں کہ کسی تخمی یا بیجی آم کی ایک قسم یا اقسام پر کیا قناعت کرتا قلمی کے گوناگوں ذائقوں، صورتوں شکلوں اور قدروں کی بے شمار قسموں پر قسمیں پیدا کر ڈالیں، کاشتکاری و باغبانی کی ترقیاں تو خیر فی الجملہ ضروریاتِ زندگی ہی کی غذائی ترقیاں ہیں شوقیات تک میں گلاب کے ایک پھول ہی کو لو جس کی رنگا رنگ تخلیق کچھ نہیں تو سیکڑوں تک جا چکی ہوگی۔

سواریوں کو دیکھو کہ زمین پر رینگنے اور چلنے والے جانوروں کی طرح پیدا انسان بھی زمین پر چلنے والا چوپایہ نہ سہی، لے پر کا دوپایہ "مویشی" ہی پیدا ہوا تھا۔ نہ پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ سکتا تھا، نہ مچھلیوں کی طرح دریاؤں میں تیر اور سمندروں کی گہرائیوں میں گھس سکتا تھا، لیکن آج بیل گھوڑے اونٹ اور بیل گاڑی، گھوڑا گاڑی، اونٹ گاڑی وغیرہ جانوروں کی سواریوں سے گذرتا اور ریل موٹر بھاپ بجلی پر سوار ہوتا ہوا سیکڑوں ہزاروں میل کی

رفتار سے چیلوں کی طرح پر پھیلائے ان سے سیکڑوں ہزاروں میل بلندیوں پر اڑتا نظر آرہا ہے۔ اور سطح آب، کی معمولی کشتیوں سے گذر کر ہزاروں ٹن کے دخانی جہازوں سے سمندروں کا سینہ چیرتا اور تحت البحر کشتیوں سے، ان کی گہرائیوں میں گھستا پھرتا ہے۔ بلکہ اب تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے یا آسمان پر چکتیاں لگانے کی ان ہونی مثل کو واقعہ بنا رہا ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ چاند پر اس طرح آمد و رفت کرنے کی ہمت باندھے ہے جس طرح زمین پر ایک ملک سے دوسرے ملک کو اڑا اڑا پھرتا ہے[1]۔

یہ تو بظاہر تعمیری و اصلاحی کارنامے ہیں، جو کسی حد پر دم نہیں لے رہے ہیں۔ تخریبی و افسادی کارنامے ملاحظہ ہوں۔ جانور اپنی حفاظت و مدافعت کے لئے قدرت کے دیے ہوئے دانتوں، پنجوں، سینگوں وغیرہ سے آگے بڑھ کر کوئی غلیل غلہ بھی آج تک نہ بنا سکا۔ لیکن انسان لاٹھی ڈنڈے، تیر و کمان سے چل چلا کر ڈھال تلوار توپ بندوق، مشین گن، ٹینک اور بالآخر ایٹم بم، ہائیڈروجن بم یا "جہنم بم" تک آ پہنچا ہے، جس کے ایک ہی وار سے آن کی آن میں جیتے جاگتے شہر کے شہر انسان ہی کا نہیں حیوانی و نباتی پوری زندگی کا مرگھٹ بن جاتے ہیں۔ پھر کیا یہ آخر آخر ہے؟ اور کیا یہ تخریبی و افسادی حدود ناشناسی اس انتہا سے پہلے رکنے والی ہے کہ چشم زدن میں پورا کرۂ ارض صرف تودۂ خاک ہی بن کر رہ جائے۔

غرض ماکولات و مشروبات، مسکونات و مرکوبات کی بعید سے بعید......ضروریات سے لے کر تعیشات، و شہویات، شوقیات و لہویات کے فضولیات بلکہ مہلکات تک اور علوم و فنون کے سنجیدہ شعبوں سے لے کر لہو و لعب، رقص و سرود کی بے شمار بیہودہ سے بیہودہ مشاغل زندگی بلکہ خود زندگی کے دشمن حربیات (آلات حرب) تک زندگی کی ہر

---

[1] یہ کتاب پریس تک بھی نہ جا پائی تھی کہ آج (۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء) امریکہ کے تین ہوا باز چاند پر اتر رہے ہیں۔

بلند و پست، نیک، و بد راہ میں، دیگر حیوانات کے مقابلہ میں انسان کی انسانی و امتیازی فطرت و خلقت یہی پاؤ گے کہ تنوع و ترقی کے کسی کمی و کیفی حدود درجہ پر سکون و قرار یا چین اور ٹھراؤ کا نام نہیں لیتا۔ گو انسان کی "انسانیت" کے یہ نوعی و خصوصی افعال و آثار ہر شخص کا ایسا پیش پا افتادہ تجربہ و مشاہدہ ہیں، جنکی پوری تفصیل کے لئے کتب خانے کے کتب خانے بھی ناکافی ہوں گے۔ تاہم پیش نظر مقصد کی خاطر ان کی نوعیت کو ذرا اجاگر کرنے کے لئے اوپر کی تھوڑی سی تفصیل ضروری تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جسمانی حیثیت سے یہ ظاہر حیوان ہی حیوان ہونے کے باوجود انسان کی "نامحدودیت طلبی" کے ان افعال و آثار یا مظاہر کا اصل منشا و مبدء اس کی خلقی فطرت میں کیا ہے؟ جواب اس کا بھی دو ہی لفظوں میں ہے "شعورِ غیب"

## شعورِ غیب

### عام حیوانات شعورِ غیب سے عاری ہیں

عام حیوانات جو کچھ براہِ راست حواس سے محسوس کرتے ہیں، اس کے ماوراء محسوسات کی تہ میں جو کچھ غیر محسوس چھپا ہوتا ہے، اس کا کوئی شعور نہیں رکھتے۔ اپنے ماحول یا گردوپیش کو جیسا اور جس حال میں پاتے ہیں جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں۔ کسی تغیر و تبدل کا نیا داعیہ ان کے اندر نہیں ہوتا۔ بس اپنی خلقی ساخت و اقتضا یا جبلت کے بالکل بندھے ٹکے عمل اور ردعمل کا ان کے ساتھ معاملہ لاکھوں کروروں سال سے کرتے چلے آرہے ہیں ان کی یہ خلقی جبلت جس طرح اور جس طرف چلاتی ہے، آنکھ بند کر کے اسی طرح اسی طرف

چلے جا رہے ہیں، حدیہ کہ اس راہ کی منزل یا اپنے جبلی افعال وحرکات کے مقصود مدعا تک کا شعور نہیں رکھتے چیونٹیوں، مماکھیوں وغیرہ کے محیر العقول کارناموں سے ہماری انسانی عقل بھی دنگ رہ جاتی ہے تاہم اپنے مقررہ دائرہ سے کسی کا ایک قدم بھی باہر نہیں نکلتا۔ نامعلوم زمانہ سے ان کے کارناموں کی جو حدبندیاں چلی آرہی ہیں، وہ اٹل ہیں، مماکھیاں اپنا چھتا کتنے ہی ہندسی اصول پر تعمیر کرتی ہوں، مگر اس تعمیر میں رائی بھر کوئی ردوبدل نہیں کرتیں۔ ان کی اجتماعی زندگی کا نظام وانتظام اعلیٰ سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔

"ہر کام میں تقسیم عمل کارفرما ہے۔ افراد کے بجائے جماعت کی فلاح وبہبود کا قانون ان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ ان کا چھتا ایک نہایت منظم شہر ہوتا ہے کام کرنے والی مماکھیاں غذا کی تلاش وفراہمی میں باہر نکل جاتی ہیں، کچھ ان میں سے شہد سے بھری ہوئی تھیلیاں لے کر لوٹتی ہیں، کچھ پھولوں کے زیرہ کی ٹوکریاں اپنی پچھلی ٹانگوں پر لاد کر لاتی ہیں، کچھ پانی کی جستجو میں تالابوں کی راہ لیتی ہیں۔ گھر میں رہنے والی مماکھیاں جو کچھ باہر سے آتا ہے۔ اس کو قرینہ سے اپنے ٹھکانے لگاتی اور ذخیرہ کرتی ہیں، اس طرح سب اپنے اپنے فرائض ادا کرتی ہیں بعض نئے انڈوں کے لئے گھر صاف کرتی ہیں، بعض کے ذمہ بچوں کی پرورش گاہوں کا انتظام ہوتا ہے۔ بعض مرمت کا کام کرتی ہیں حفظان صحت اور صفائی کا کام کرنے والی چھتوں کو صاف کرتی اور مردہ لاشوں کو باہر پھینکتی ہیں، بعضوں کا کام ہوا کو صاف کرنا ہوتا ہے، یہ چھتوں میں تازہ ہوا داخل کرنے کے لئے برابر اپنے پر پھٹ پھٹاتی رہتی ہیں

بعض چوکیداری کی خدمت کرتی ہیں اور دن رات پہرا دیتی ہیں۔ یہ باہر سے داخل ہونے والی ہر مکھی کا جھاڑا لیتی ہیں اور کسی اجنبی کو داخل ہونے نہیں دیتیں۔[۱]

آرتھر شپلی (SHIPL) کے بقول "ان کی ساری زندگی خالص اجتماعیت (سوشلزم) پر مبنی ہوتی ہے اور یہ اجتماعی نظام ہمارے انسانی نظام اجتماع سے بہتر و برتر ہوتا ہے۔ اس میں نہ بیکاری ہے نہ ہڑتالیں، نہ دربندیاں.... ان میں ذاتی ملکیت قطعاً نہیں پائی جاتی۔"[۲]

مکھیوں کی یہ سوشلزم انسانی سوشلزم کے مقابلہ میں کتنی ہی برتر و بہتر اور کتنی ہی حیرت انگیز کیوں نہ ہو لیکن ہے قطعاً جامد و غیر متغیر۔ نسلہا نسل اور لاکھوں کروروں سال سے جوں کے توں لکیر کی فقیر چلی آتی ہے۔ بخلاف انسان کی سوشلزم یا اجتماعیت و اشتمالیت کے، دو ملکوں دو قوموں دو نسلوں کا کیا ذکر، ایک ہی ملک، ایک ہی قوم، ایک ہی نسل بلکہ ایک ہی گھر کے دو آدمیوں، ایک ہی باپ کے دو بیٹوں بلکہ ایک ہی شخص کو دو وقتوں میں کوئی اجتماعی یا غیر اجتماعی کام کرنے یا نظام بنانے کو دیدو تو ضرور دونوں میں کچھ نہ کچھ تفاوت و اختلاف ہو جائے گا۔ آج ہی کل دیکھو کہ کتنے ملک ان کی جماعتیں اور افراد سوشلزم ہی کے نام سے کتنے رنگارنگ کے نقشے بناتے اور بگاڑتے اور نت نئی تبدیلیاں ان میں لاتے اور کرتے رہتے ہیں۔

ایک سوشلزم کیا کھانا پینا، رہنا سہنا، توالد و تناسل کون سی چیز ہے جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ جانور بھی اپنی بندھی ہوئی راہ سے اِدھر اُدھر جاتے ہوں، جن جانوروں

---

۱؎ آوٹ لائن ماڈرن بلیف صہ ۲۱۵ ("OUTLINE OF MODERN BELIEF")
۲؎ ایضاً

کی جو غذا، رہنے سہنے، سردی گرمی سے بچنے بچانے اور جینے جنانے کے جو طریقے جبلت یا قدرت نے باندھ دیئے ہیں، جیسے کے ویسے ہی چلے جاتے ہیں۔ شیر کی غذا گوشت ہے تو نباتی موجودات غذائی اعتبار سے اس کے لئے گویا موجود ہی نہیں۔ بکری گھاس پات کھاتی ہے تو گوشت کے قریب نہیں جاتی۔ پھر گوشت یا گھانس کی کچھ صورت بدل کر یا پکا کر کھانے کا کوئی داعیہ ان کے اندر قطعاً ناپید ہے۔ لباس بھی پر، پوستین وغیرہ جو کچھ قدرت نے اول روز سے پہنا دیا ہے وہی ان کا جاڑے گرمی، دن رات کا لباس ہے۔ اسی طرح پناہ لینے یا رین بسیرے کے لئے بھٹ، آشیانہ، درخت جو اور جیسا ٹھکانا قدرتی طور پر جس کے لئے ہے وہی اسکا ازلی ابدی مسکن و مکان ہے۔ خلاصہ یہ کہ حیوانی زندگی کے سارے کاروبار کی خصوصیت ایک ہی حال پر قرار و جمود ہے۔ بس جبلت (INSTINCT) جس طرح اور جس طرف چلاتی رہتی ہے اسی طرح اسی طرف چلتے رہتے ہیں۔ اس راہ کی منزل یا اپنے جبلی افعال و حرکات کے مقصد و مدعا تک کا ادراک نہیں رکھتے، اور گو ان کے بہت سے جبلی افعال کی حیرت انگیزی سائنس کے لئے ایک سربستہ راز ہے، تاہم اتنا مسلم ہے کہ کسی مقصد و مراد پر مبنی کسی جانے بوجھے یا شعوری مقصد و مراد کے ساتھ ان کا ظہور نہیں ہوتا۔ یعنی خود ان کے انجام دینے والوں کو ان کی اس غرض و غایت کا کوئی شعور و ادراک نہیں ہوتا جس کے لئے وہ ان کو انجام دیتے ہیں مثلاً:۔

"بھڑوں کو لو کہ وہ اپنے چھتے میں جن بچوں کے لئے غذا جمع کرتی ہیں ان کو دیکھنا تک نصیب نہیں ہوتا۔ چھتے میں جہاں انڈے دیتی ہیں کیڑوں کو ڈنک مار مار کر بے کار کر کے ڈال دیتی ہیں، پھر خود ماں باپ اس طرح غائب ہو جاتے ہیں کہ لوٹ کر چھتے میں کبھی قدم نہیں رکھتے، اور مارے ہوئے کیڑے نو پید یتیموں کی غذا بننے

کے لئے ان کے پیدا ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے اس صورت میں یہ فعل کسی شعوری پیش بینی یا مقصد شناسی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔[1]

بات وہی ہے کہ کسی راہ کی منزل یا کسی کام کا مقصد وانجام چونکہ ابھی غیب میں ہوتا ہے اس لئے حیوانات کے جبلی کارنامے بجائے خود کتنے ہی حیرت انگیز ہوں لیکن یہ جبلت بہرحال اندھی ہی ہے یعنی اپنے کارناموں کی غیبی غرض وغایت تک کا کوئی شعوری ادراک و احساس نہیں رکھتی۔

## انسان "شعورِ غیب" کا امتیاز رکھتا ہے

بخلاف اس کے انسان کی عین "انسانیت" غیبوں کا احساس یا "شعورِ غیب" ہے اسکی جسمانی وذہنی زندگی کے کسی ادنیٰ واعلیٰ شعبہ میں جو کہیں قیام وقرار یا چین اور ٹھہراؤ نظر نہیں آتا اس کا راز یہی ہے کہ یہ ہر حاضر کے پیچھے چھپے ہوئے غائب اور ہر حال کے آگے پیچھے مستقبل و ماضی کا شعوری احساس وتصور رکھتا ہے گیہوں دیکھنے میں صرف گیہوں ہے نہ آٹا نہ روٹی نہ پوری نہ پراٹھا۔ چاول صرف چاول ہے نہ کھچڑی نہ پلاؤ، نہ بریانی نہ تنجن، دودھ صرف دودھ ہے، نہ گھی نہ مکھن نہ کھویا، روئی صرف روئی ہے نہ سوت، نہ کپڑا نہ کرتا نہ پائجامہ، نہ کوٹ نہ پتلون۔ لکڑی صرف لکڑی ہے نہ دھنی نہ شہتیر نہ دروازہ نہ میز نہ کرسی۔ لوہا صرف لوہا ہے، نہ تلوار نہ بندوق نہ کوئی مشین، مشین کا پرزہ، چاندی صرف چاندی ہے نہ کوئی سکّہ نہ زیور نہ برتن۔ یہ سب کی سب نرے غیوب یا غیبی امکانات ہیں جو مختلف چیزوں کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ جو ذہن ان چھپے ہوئے غیبوں کا شعور رکھتا ہو ظاہر ہے اسی کو ان کے بطن سے برآمد کرنے کی خواہش اور تڑپ ہوگی۔

---

[1] ماڈرن بلیف ص ۲۱۵

مطلب اس تفصیل و تکرار کا اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کرنا کرانا ہے کہ انسان کی ساری "انسانیت" یا اس کا نوعی امتیاز یہی ہے کہ یہ جو کچھ دیکھتا سنتا یا ظاہری حواس سے محسوس کرتا ہے، اس سے بہت زیادہ بالکل طبعی واضطراری طور پر یہ محسوس کرتا ہے کہ ان مرئیات و محسوسات یا ظواہر کے ماوراان کے باطن میں ایسے بے شمار مغیبات پنہاں ہیں، جو براہِ راست قطعاً غیر مرئی و غیر محسوس ہوتے ہیں، پھر بھی وہ ان کو مانتا یا ان پر ایمان اس درجہ اعتماد و یقین کے ساتھ رکھتا ہے کہ زمین پر آنے کے اول روز سے لے کر لاکھوں کروروں سال کی اس کی ساری زندگی نام ہی ہے دیکھی یا محسوس و معلوم چیزوں کی تہ میں ان دیکھے یا نامحسوس و نامعلوم غیبوں یا حال کے ماورا ماضی و مستقبل پر ایمان بالغیب اور اس کو غیب سے شہادت میں لانے یا نامحسوس و ناموجود کو محسوس و موجود بنانے کی ان تھک پیہم جدوجہد کا۔ سائنس اسکے ہر چیز کا صرف حال و حاضر ہوتا ہے۔ نہ ماضی و مستقبل۔ لیکن سعی و طلب اس کی مستقبل کو حال و حاضر میں لانے اور حال کو ماضی سے جوڑنے یا اس کے غیبی مبدء و مرجع کی جستجو رہتی ہے، ظاہر ہے اس کی جستجو کی پوری تشفی ایسے انتہائی مبدء یا ابتدا کو پائے یا مانے بغیر نہیں ہو سکتی جسکے بعد کسی مزید مبدء یا غیب کا سوال ہی نہ رہ جائے۔

## انسان کی صحیح تعریف حیوان مومن ہے!

سارے سائنسی و تاریخی علوم و فنون فلسفیات و نظریات، اکتشافات، و ایجادات، تمدن و تہذیب کے کارنامے اور ہنگامے سب کی سب اس غیب پر ایمان یا اس کے احساس و طلب کی نہ بجھنے بلکہ تیز سے تیز تر ہوتی جانے والی تڑپ اور پیاس ہی کے مظاہرے ہوتے ہیں، یہ پیاس نہ ہو یا بجھ جائے تو پھر بلا شبہہ انسان چوپایہ نہ سہی، دوپایہ حیوان ہی حیوان کے سوا کچھ نہیں ورنہ انسان کو اگر حیوان ہی کہنا ہو تو پھر "حیوان ناطق" و عاقل (RATIONAL) یا حیوان

متمدن (سوشل) وغیرہ کے بجائے اس کی اصل انسانی خلقت ونوعیت کو ظاہر کرنے کے لئے "حیوان مومن" کہنا ہی درست ہوگا۔ یعنی محسوسات یا عالم شہادت سے ماورا نامحسوسات یا عالم غیب کو خلقی وتکوینی طور پر ماننے یا اس پر ایمان رکھنے والا حیوان یہی "ایمان بالغیب" انسان کی اس نامحدودیت پسندی اور لازماً نامحدودیت طلبی کا منشا ومرجع ہے، کہ نہ وہ علم میں کسی ایسی حد پر ٹھہرنا چاہتا ہے، جس کے آگے پھر کوئی نہیں رہ جائے اور نہ قوت وقدرت کے کسی ایسے درجہ پر قانع رہنا، جس کے بعد کوئی چیز اس کی طاقت سے باہر رہ جاتی ہو۔ گویا علم وقدرت وحیات وغیرہ کے جن نامحدود کمالات کو ہم خدا کی ذاتی صفات ہونے کا تصور رکھتے ہیں، انسان نام ہے، ان ہی کو کسبی طور پر حاصل کرنے کی سعی وطلب والے "خدا نما حیوان" کا۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں خدا کا نمائندہ یا اس کا جانشین وخلیفہ اور حضرات صوفیہ کی اصطلاح میں خدا کی ذات وصفات کا "مظہر اتم" کہا گیا ہے، دوسرے لفظوں میں انسان کی انسانیت کی تخلیقی ابتدا جس طرح غیبیات پر ایمان (یومنون بالغیب) سے ہوئی ہے اسی طرح اسکی یہ امتیازی تخلیق فطرۃً ایسی تکمیلی انتہا کو مانگتی ہے، جو اس کی نامحدودیت کی طلب و تشنگی کو علی وجہ الکمال تشفی بخش سکے، اور اسکی قدرت ومشیت یا کسی خواہش وطلب پر کوئی قدغن اور حدبندی قطعاً نہ رہ جائے جو کچھ بھی ہم چاہیں اور مانگیں وہ بلا کسی حدبندی کے پورا ہو جائے یعنی "لکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون" والی جنت کسی نہ کسی طرح سے مل جائے۔

## اعتباری واضافی یا اطلاقی وحقیقی غیب

**غیب کی دو قسمیں** اب انسان جس غیب پر ایمان رکھتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک

اضافی یا اعتباری اور دوسرا حقیقی یا اطلاقی۔ پہلی قسم کا تعلق خود کائنات کے اندر کی مختلف موجودات کے باہمی غیبوں سے ہے، دوسری کا پوری کائنات کے بہ حیثیت مجموعی ماورائی غیب یا غیب الغیوب سے۔ ایک کائنات فطرت کی اندرونی گوناگوں موجودات سے متعلق کیا؟ کیوں کر؟ کس کے لئے؟ کا جوابات دیتی یا ان کی علت و ماہیت کیفیت و غایت کے بارے میں ہماری غیب طلب تشنگی کی تشفی کرتی ہے۔ بالکل سامنے کی مثال لو تم کھانا کھا رہے ہو ایک کتا آکھڑا ہوا تم نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے آگے بھی ڈال دیا۔ کھا وہ بھی لے گا لیکن اس کتے کے اندر روٹی کے غیبوں کا نہ کوئی سوال ہوگا نہ جواب، کہ یہ روٹی کس غلہ کی ہے، وہ کہاں، کیونکر اور کب پیدا ہوتا ہے اس کی پیدائش کے لئے کس قسم کی زمین درکار ہوتی ہے، کھاد کتنی اور کیسی دی جاتی ہے، پانی یا سینچائی کب اور کتنی مانگتا ہے، کھیت کی جوتائی، نکائی، فصل کی تیاری، کٹائی وغیرہ وغیرہ کے کن مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے، آٹا کس طرح پیسا، کس طرح گوندھا، کس طرح روٹی کی صورت میں پکایا جاتا ہے؟ پھر یہ روٹی پیٹ میں جانے کے بعد خون و گوشت وغیرہ یا بدل ما تیحلل کس طرح بنتی ہے؟ اس سلسلہ میں معدہ، جگر، آنتوں وغیرہ کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے یا خون کیسے بنتا اور بدن میں کیسے تقسیم ہوتا ہے۔ دل خون کی صفائی و تقسیم میں کیا وظیفہ انجام دیتا ہے؟ زندگی و تندرستی کی بقا و تحفظ کے لئے پروٹین، حیاتین وغیرہ کی طرح کی جو چیزیں مطلوب ہوتی ہیں وہ گیہوں میں کیا اور کس تناسب سے پائی جاتی ہیں۔ اور آگے بڑھئے تو گیہوں کن کن عناصر سے مرکب ہوتا ہے؟ خود یہ عناصر بسیط ہیں یا مزید مرکب؟ مرکب ہیں تو ان کے ترکیبی اجزا کیا ہیں، خود ان اجزا کی ماہیت کیا ہے؟

کتے نے روٹی کے جس ٹکڑے کو کھا کر اپنی بھوک کی فطرت کا سارا مطالبہ ختم کر لیا تھا، اس ایک ٹکڑے ہی بلکہ گیہوں کے ایک دانہ میں ظاہر و باطن، ماضی و مستقبل کے انسان کے لئے

کتنے ان گنت غیوب یا سوالات چھپے ہوتے ہیں جن کی لپیٹ میں کہنا چاہیئے کہ زمین و آسمان کی ساری کائنات آجاتی ہے اور جن کی پوری تفصیل کی سمائی کے لئے دفتر کے دفتر بھی کافی نہیں ہو سکتے، اور جو نہ اس وقت تک ختم ہو سکتے ہیں جب تک ان غیوب در غیوب کی جستجو میں وہ انتہائی غیب یا غیب الغیوب ہاتھ نہ آجائے جس کے ماورا پھر کسی غیب کا سوال و احساس پیدا ہی نہ ہو۔ گیہوں کا ایک دانہ کیا کائنات کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز، مکھی کا ایک پر، مچھر کا ایک پیر۔ بھی لے لو اور اس کے اندر باہر، آگے پیچھے یا ظاہر و باطن، اول و آخر کے غیبوں کا پورا تفصیلی جائزہ لینے پر آجاؤ تو حیوانیات، حیاتیات، نباتیات و عضویات، طبعیات، فلکیات اور کیمیا وغیرہ سارے سائنسی علوم کا کتب خانہ کھل جائے گا۔ مگر ہوں گے یہ غیوب سب کی سب اس کائنات ارض و سما کے دائرہ کے اندر کے جس کا ایک جز گیہوں کا ایک دانہ یا مچھر اور مکھی کا ایک پیر یا پر ہے۔

**اضافی غیب** مگر جس طرح زمین اور اس کے جمادات و نباتات و حیوانات سے لیکر آسمان کے بے شمار ثوابت و سیارات سب اس ہمارے عالمِ شہادت کے دائرہ کے اندرونی مختلف حصے ہیں، اسی طرح اس کے غیوب بھی تمام اسی کائنات کے مختلف داخلی حصے ہیں جو اس کے اندر ہی داخل ہیں۔ جو چیز ایک جگہ غیب ہے وہی دوسری جگہ شہادت۔ کسی زمان و مکان میں حال و حاضر اور کسی میں ماضی و مستقبل۔ بارش جو آج اور اس وقت بارش ہے، اس سے پہلے اور کل مانسون تھی اور اس سے پہلے آفتاب کی گرمی سے پیدا ہونے والے سمندری بخارات۔ مگر بارش مانسون آفتاب اس کی گرمی اور اس کے بخارات ہیں، بہر حال سب اس دائرہ کائنات کے اندر ہی اندر کے یعنی کائنات کے سارے اندرونی غیوب ہر پھر کر عالم شہادت ہی کا تعمیری و تشکیلی مواد ہوتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے انکی

غیبیت بھی محض اعتباری یا اضافی ہوتی ہے، اس طرح سائنسی علوم اپنے اکتشافات و تحقیقات سے جن غیبوں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں، وہ بھی اصلی و حقیقی یا اطلاقی نہیں ہوتے جن کے آگے پھر کسی غیب کا سوال و احساس نہ رہے، بلکہ تمام تر اضافی و اعتباری غیوب ہی ہوتے ہیں۔

## غیب الغیوب کو پائے بغیر انسانیت مطمئن نہیں ہوسکتی

لیکن انسان کی انسانیت اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لے سکتی جب تک انتہائی و آخری غیب، یا اس غیب الغیوب کو نہ پالے جس کے ماوراء کسی مزید غیب کا سوال یا اس کی طلب و تشنگی سرے سے نہ رہ جائے، وہی اطلاقی یا حقیقی معنیٰ میں بہ حیثیت مجموعی پوری کائنات کا غیب ہوگا اور وہی انسان کی انسانیت کا اصل مدعا و مراد، یا انسانی خلقت و فطرت کی صحیح غذا ہوگی جس کی تڑپ اور تمنا میں یہ اپنی پیدائش کے اول روز سے سرگرداں ہے۔

شیر کی غذا گوشت ہے، اس کے آگے بہتر سے بہتر پھلوں، سبزیوں، ترکاریوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگا دو، ممکن ہے بھوک کی شدت میں وہ منہ بھی مارے، مگر اس کی گوشت طلب خلقت بدستور ناآسودہ و بے قرار رہے گی، اس کے برخلاف گوشت کی ایک سڑی گلی بوٹی بھی اس کے آگے ڈال دو تو گو اس سے اس کا پیٹ بھرے گا نہیں، لیکن اسدی فطرت بے ساختہ اندر سے پکار اٹھے گی کہ ہاں میری صحیح مطلوب غذا یہی ہے، اب جو بے قراری و بے چینی ہوگی وہ صرف اس کی کہ یہی غذا سڑی گلی ناقص و خراب کے بجائے اچھی اور پیٹ بھر ملے۔

انسان خصوصاً آج کے ماڈرن انسان نے اپنی بظاہر ساری بھوک، مادی مطلوبات و لذات، آرائش و نمائش، جاہ و جلال اور غلبہ و اقتدار کو بنا لی ہے مگر بقول کارلائل:-

"ساری دنیا کی دولت و ثروت، آرائش و نمائش اور انواع و اقسام کے کھانے پینے

(وغیرہ ادنیٰ سے ادنیٰ انسان) ایک موچی کو بھی مسرور و مطمئن رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، کیونکہ موچی بھی فقط پیٹ نہیں (جیسا کہ ماڈرن دور بطنیات میں سمجھ رکھا گیا ہے) بلکہ روح بھی رکھتا ہے اور اس کی تشفی کے لئے خدا کی ساری خدائی بلاشرکت غیرے درکار ہے ......... تم اس کو آدھی خدائی دیدو تب بھی وہ اپنے کو مظلوم ترین انسان جانے گا اور بقیہ آدھی خدائی کے مالک سے برسرِ پیکار رہے گا۔[1]

بلکہ ساری خدائی پاکر یہ غریب موچی بھی اس وقت تک غریب ہی غریب رہ کر بے چین رہے گا جب تک ساتھ ہی ساتھ یہ یقین بھی نہ پالے کہ بس اب اس کے علاوہ یا اس کے آگے اور کچھ قطعاً کہیں باقی نہیں رہ گیا ہے۔ کارلائل ہی کے بقول:۔

"انسان کا دکھ اس کی بڑائی ہے ......... اس میں نامحدود کی ایسی طلب اور تڑپ ہے، جس کو وہ اپنی چالاکی و ہوشیاری کے باوجود محدود کے اندر دفن نہیں کر دے سکتا۔"[2]

ظاہر ہے کہ نامحدود کی یہ طلب تمام تر غیب ہی کے احساس و ایمان کا لازمہ ہے۔ اس غیب کا ایک مطلوب ہمارے علم و شہود میں آیا نہیں کہ اس غیب کے آگے کے غیب کی تڑپ پھر تڑپانے لگی۔ ایک امکان وقوع میں آیا نہیں کہ اس کے بعد والے امکان کو واقعہ بنانے کی دھن سوار ہو گئی۔ ایک واقعہ کے اول یا علت کی ٹوہ لگی نہیں کہ اس علت کی علت یا اول کے اول کی فکر لگ گئی۔ بس انسان کی ساری بڑائی، اس کا سارا دکھ "نامحدود" کی یہی وہ خلش و جستجو ہے جو اس وقت تک سکون و قرار نہیں پا سکتی جب تک یہ کائنات کے اندرونی یا اضافی و

---

[1] ("MANUAL OF ETHICS" by J. S. MANCANZI) مترجمہ راقم ہذا بنام "علم اخلاق" صـ ۲۳

[2] علم اخلاق صـ ۳۹۵

اعتباری غیب در غیب، امکان بعد از امکان، اول قبل از اول، آخر بعد آخر کے سلسلہ کو نفاذ و انجام کائنات کے انتہائی کناروں تک پہنچا کر اور پھر ان کناروں کی بھی حد بندیوں کو پھاند کر خود اس غیب الغیوب کو کسی نہ کسی طرح جان یا مان نہ لے، جو انسان سمیت پوری کائنات کے ظاہر و باطن کا مبدء و مرجع یا اول و آخر ہے۔ کائنات کے اندر ہی اندر رہ کر اس کے مختلف موجودات کے اول و آخر ظاہر و باطن کے باہمی یا اضافی و اعتباری غیبوں کا پتہ لگانا ہی مختلف سائنسی یا طبعی علوم و تحقیقات کا دائرہ ہے۔ مگر اس دائرہ سے باہر نکلنے کے لئے پہلے ذرا خود اس کی وسعت اور اس کے اندرونی یا ان آفاقی غیبوں کی نوعیت کا سرسری جائزہ لے دیکھیں جن کی بیسویں صدی کی سائنس نے اب تک نشان دہی کی ہے۔

جس زمین پر ہم آباد ہیں، یہ ہمارے نظام شمسی کا صرف ایک سیارہ ہے جو سورج کے مقابلہ میں مٹر کے ایک دانہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ سورج تو سورج سیارہ مشتری اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہماری جیسی ایک ہزار سے زیادہ زمینیں سما سکتی ہیں۔ پھر آسمان پر جو چھوٹے چھوٹے تارے دکھائی دیتے ہیں ان میں اکثر سورج کے برابر اور بہت سے خود سورج سے اتنے بڑے ہیں کہ ان میں دس ہزار سورج سما سکتے ہیں۔ تارے وہ کہلاتے ہیں جو خود بخود روشن ہیں یعنی جو اس وقت جلتی ہوئی گیس کی حالت میں پائے جاتے ہیں، باقی جو ٹھنڈے ہو چکے ہیں جیسے ہماری زمین اور مریخ وغیرہ وہ سیارے کہے جاتے ہیں۔ اس وقت تک کے معلوم و مشہور سیاروں کی تعداد ۹ ہے۔ ان میں سے بعض سیاروں کے ساتھ ان کے توابع یعنی چاند بھی پائے جاتے ہیں۔ زمین کے ساتھ ایک چاند ہے، مریخ کے ساتھ دو، اور زحل کے ساتھ ۹۔ سورج بھی در حقیقت ایک تارہ ہی ہے جو مختلف عناصر لوہے، المونیم جست نکل وغیرہ کے جلتے ہوئے بخارات یا گیسوں کا بہت بڑا کرہ ہے۔ اس سے آنے والی روشنی

زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ روشنی کی رفتار فی ثانیہ (سکنڈ) ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے

"ہم عالم سے مراد بعض اوقات صرف اپنا ہی کواکبی نظام (جس کا ایک رکن ہمارا آفتاب ہے) اور تاروں کا وہ عظیم مجموعہ لیتے ہیں جس کو کہکشاں کہتے ہیں، لیکن دراصل یہ صرف ایک عالم یا ہمارا عالم ہے۔ اس کے علاوہ بہ کثرت ایسے عوالم پائے جاتے ہیں جو ہمارے اس عالم سے بالکل باہر نہایت دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں۔ ان ہزاروں ہزار عالموں میں ہر ایک اتنا ہی عظیم الشان ہے جتنا کہ یہ ہمارا عالم۔ جدید فلکیات نے ہماری نظر کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ یہی نہیں کہ اس عالم یا کائنات سے متعلق ہمارا علم و تصور مسلسل وسیع تر ہوتا جا رہا ہے بلکہ خود پوری کائنات بجائے خود بھی روز بروز وسیع تر ہوتی یا پھیلتی جا رہی ہے۔ جن بعید ترین اجرام سماوی کو ہم موجودہ بڑی سے بڑی دوربین سے دیکھ سکتے ہیں وہ بھی اتنے بعید فاصلہ پر واقع ہیں کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے حرکت کرنے والی روشنی کو ان اجرام سے ہم تک آنے میں ایک سو چالیس ملین ۱۴۰ (چودہ کرور) سال لگ جاتے ہیں۔ سب سے قریب چاند ہے وہ بھی دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے سورج تقریباً نو کرور تیس لاکھ میل دور ہے۔ تاروں میں قریب ترین تارہ (ALPHA) (PRAXIMA) نوری یا روشنی کے سالوں کے حساب سے چار سال کی دوری پر واقع ہے۔ ہمارا ذہنی تخیل جواب دے جاتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ ایسے سدیم یا سحابے (NEBULA) پائے جاتے ہیں، جو روشنی کے سالوں[1] کے حساب سے سو ملین (دس کرور) سال کی مسافت پر واقع ہیں.... کوئی انسانی ذہن ان فاصلوں کے تصور پر قادر نہیں۔"[2]

---

[1] (LIGHT YEARS)

[2] ماڈرن بلیف حصہ اول ص ۱۵، ۱۶ ملخصاً

ایک طرف صرف ایک سورج کے مقابلہ میں ہماری مٹر برابر زمین کی دنیا کا خیال کرو اور دوسری طرف اس ایک سورج جیسے کروروں دوسرے سورجوں کا جو اس مجموعہ میں پائے جاتے ہیں جس کو کہکشانی نظام کہا جاتا ہے۔ پھر یہ کائنات یا عالم اس کہکشانی نظام پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس جیسے لاکھوں لاکھ سحابے خلا میں تیر رہے ہیں۔ اور ہم سے قریب ترین سحابہ بھی چھ کرور اڑسٹھ ہزار نواسی سال (LIGHT YEARS) کی دوری پر واقع ہے۔ اندازہ لگایئے کہ دور ترین سحابہ کہاں ہوگا۔[1]

وھیل اور ہاتھی وغیرہ جیسے جسمانیت کے لحاظ سے دیو ہیکل حیوانات اپنے کھانے پینے کی معمولی ضروریات زندگی تک ہی جبلت کی باندھی ہوئی حدوں سے ایک قدم باہر نہیں نکال سکتے۔ لیکن انسان کا احساس غیب اور لازماً طلب نامحدودیت یہی نہیں کہ ضروریات زندگی ہی کسی حد پر ٹھہرنے نہیں دیتی بلکہ کسی ناگزیر مادی یا جسمانی ضرورت و حاجت کے کائنات کے ایسے دور افتادہ سے دور افتادہ گوشوں اور کناروں تک پہنچ جانا چاہتا ہے جنکی نامحدودیتوں سے خود اس کا ذہن و دماغ چکرا جاتا ہے۔ تاہم اس سر چکرا دینے والی دوریوں اور مسافتوں کے یہ سارے دور افتادہ سے دور افتادہ گوشے... بہر حال اسی کائنات کے باہم دگر وابستہ مختلف اندرونی غیبوں کے حصے ہیں۔ اور یہ سوال اپنی جگہ جوں کا توں ہے کہ خود اس پوری انتھاہ ناپیدا کنار مجموعی کائنات کا مبدء و منتہا اول و آخر یا انتہائی غیب کیا ہے جس کے یہ سارے کے سارے بے حد و بے شمار اندرونی عوالم محض مختلف مظاہر ہیں؟

لیکن انسانی ذہن کو اپنی تمام بلند پروازیوں اور فلک پیمائیوں کے باوجود پھر پھر کر رہنا بہر نوع ذہن کو تھکا دینے والی اس کائناتی وسعت کے اندر ہی اندر پڑتا ہے۔ اور اس کے

---

[1] رسالہ سائنس جولائی و اگست ۱۹۴۵ء حیدر آباد

اندر ہی اندر کے انتہائی غیب کے متعلق اپنے مشاہدات و تجربات اور ان ہی پر مبنی سائنسی اختبارات سے وہ صرف یہی کر سکتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری جاندار و بے جان یا شعور و بے شعور اندرونی موجودات کا مشترک سرچشمہ یا مابہ الاشتراک اور قدر مشترک معلوم کرتے کرتے جتنی دور تک بھی جا سکتا ہو چلا جائے، دیکھئے اس میں بھی ہم یقین یا ظن کی خود سائنسی راہ سے کہاں تک جا سکے ہیں؟

آگے ۱۹۵۹ء کی ایک تازہ کتاب[1] بھی پڑھ لیں کہ:۔

"اجرام سماوی میں سب سے قریب ہمارے علم و مشاہدہ کے لئے نظام شمسی ہے اس کے بعد چند ہزار ملین روشنی کے سالوں تک علمائے فلکیات کا سائنسی مشاہدہ و مطالعہ اور کام دیتا ہے۔ پھر آگے روشنی اور ریڈیو کی لہریں اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ اب اور آگے کیا ہے"

ساتھ ہی یاد رکھنا چاہیئے کہ:۔

"مثلاً آفتاب کو جب ہم کسی وقت دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا آفتاب ہوتا ہے اس طرح قریب ترین جس ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے"

باقی خود اپنی کہکشاں سے آگے (EXTRAGALACTIC)

"جن نسبتہً قریب کے پڑوسی ستاروں کا روشنی اور ریڈیو کی لہروں کے واسطے سے مطالعہ کرتے ہیں یہ لہریں ملینوں سال پہلے سے سفر کرتی آرہی ہوتی ہیں"

---

[1] "فرد اور کائنات" ("THE INDIVIDUAL AND THE UNIVERSE" by A. C. LOVELL) مصنفہ اے۔ سی لوول

..... لہذا ان کی نسبت ہماری اطلاع و علم بھی اتنا ہی پرانا یا فرسودہ ہو چکتا ہے۔ (OUT OF DATE) اس طرح آج کے مشاہدات پر مبنی ہماری معلومات ہزاروں ملین سال کی فرسودہ (OUT OF DATE) ہوتی ہیں۔"

آج ہماری دوربینیں اتنی طاقتور ہیں کہ:۔

"غالباً وہ قابل مشاہدہ (OBSERVABLE) کائنات کی آخری حدوں تک رسائی پا چکی ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ سائنسی علم کے اعتبار سے ہم کائنات کی قابل رسائی حدوں تک پہونچ چکے ہوں لہذا کائنات کی تعمیر و تشکیل سے متعلق (COSMOLOGICAL) جو مضمرات ان میں پنہاں ہیں وہ پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔"

ہم سے قریب ترین ستارہ بھی اتنی دُور ہے کہ:۔

"اس کی روشنی ہم تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے۔"

"ہم جس کہکشانی نظام میں واقع ہیں، بیسویں صدی کی دوربینوں کے ذریعہ اس کے ستاروں کی تعداد تقریباً دس ہزار ملین معلوم ہوئی ہے......

پھر بھی ہماری یہ کہکشاں بجائے خود صرف ایک مقامی کہکشانی نظام ہے جس کے علاوہ اور بے شمار کہکشانی نظامات پائے جاتے ہیں۔"

ان سے بھی ماورا سحابیے (NEBULA) پائے جاتے ہیں جن کے معلوم کرنے کے لئے:۔

"بیسویں صدی کی امریکہ کے کوہِ وِلسن (MOUNT WILSON) کی

دوربین درکار تھی جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ سحابے بھی دراصل ستارے ہیں، جو کہکشاں سے بے انتہا دور فاصلوں پر پائے جاتے ہیں، اینڈرومیڈا (ANDROMEDA) سحابہ سے جو روشنی ہماری دوربین تک پہنچتی ہے اوہ بیس لاکھ سال سے گزر رہی ہوتی ہے ہم خلا (Space) میں جہاں بھی دیکھیں یہ سحابے موجود ملتے ہیں۔

اور صرف کائنات کے ان حصوں، کا ہم اپنی جدید دوربینوں کے ذریعہ مطالعہ کر سکے ہیں اور نہ یقینی طور پر ہزار ملین بلکہ غالباً بلینوں (BILLIONS) بےشمار سحابے (نیبولے) پائے جاتے ہیں جو سب کی سب بجائے خود ہزاروں ملین ستاروں سے بنے ہوئے کواکبی (STELLOR)* نظامات (SYSTEMS) ہیں"

اور سنئے کہ :-

"جس قدر خلا یا مکان ۔ (SPACE) میں ہم پیچھے (RUEDE) کی طرف بڑھتے جاتے ہیں کہکشانوں کا پھیلاؤ (EXPANSION) بھی برابر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ہمارے روزانہ مطالعہ کا ایک مجموعہ یا تارہ منڈل (CONSTELLATION) جس کا نام سگنوس (CYGNUS) ہے یہ ایک سکنڈ میں دس ہزار میل کی رفتار سے برابر پیچھے ہٹتا جا رہا ہے"

اجرام سماوی کی سائنسی یا اس فلکیاتی طلسم ہوش ربا میں اصل بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ اس اتھاہ کائنات کا اصل اطلاق "غیبِ غیب" بدستور دور ہی دُور اور غیب ہی غیب رہتا ہے۔

"اگرچہ ہمارے مکان و زمان کی اتنی وسعتوں اور ماضی کی طرف اتنے فاصلوں

بلکہ ہم کچھ نہ کچھ کھوج لگا چکے ہیں پھر بھی ہمارے پاس اس مسئلہ کا کوئی آخری جواب نہیں کہ جب کائنات پیدا ہوئی اس وقت کیا صورت تھی؟

اصل یہ ہے کہ اس طرح کے سوالات میں ہم سائنسی مشاہدہ کی دنیا سے نکل کر فلسفیانہ نظریات و قیاسات کی دنیا میں جا پڑتے ہیں۔[1]

اور فلسفی کا بھی یہ حال پاتے ہیں کہ ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں

ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں (حضرت اکبر)

# آفاقی غیوب کی تھاہ

بظاہر زمین سے آسمان تک کی تمام مرئی و محسوس موجوادت و مخلوقات میں جو چیز مشترک نظر آتی ہے وہ ان کا جسم یا جسمانیت ہے۔ ہمارے انسانی تخیل و تصور کو تھکا اور چکرا دینے والے بڑے بڑے سماوی اجسام و اجرام سے لے کر ریت کا چھوٹا سا چھوٹا ذرہ اور بڑے سے بڑے دیو ہیکل جانوروں سے لے کر چھوٹی سی چیونٹی اور اس کا نہ دکھائی دینے والا منہ جس کے کاٹنے سے ہم چونک پڑتے ہیں، یہ سب کی سب دیکھنے میں ٹھوس مختلف اجسام یا جسم و جسمانیت ہی کی مختلف صورتیں معلوم ہوتی ہیں۔ گویا جس طرح ریت کا کوئی ٹیلہ ریت ہی کے چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہوتا ہے، اسی طرح پوری کائنات یا اس کی تمام ارضی و سماوی موجودات جسمانیت ہی کے ذرات کے مختلف ڈھیر یا مجموعے کہے جا سکتے ہیں۔

---

[1] یہ کتاب، بالا "فرد اور کائنات" سے ص۔ تک کے جستہ جستہ اقتباسات ہیں۔

دو ہزار سال سے زیادہ ہوئے کہ کائنات کے اسی عام یا عامیانہ جسمانی تصور نے یونان میں بلند بانگ، مادیت کے علمی فلسفہ کی صورت اختیار کی۔

"تم پتھر کے ایک ٹکڑے کو پیس کر خاک بنا دے سکتے ہو۔ چمچے بھر پانی کو جتنے قطروں میں چاہو بانٹ سکتے ہو جیسے نازک سے نازک آلات تمہارے پاس موجود ہوں برابر ان کو تقسیم در تقسیم کرتے چلے جا سکتے ہو۔ لیکن بالآخر کہیں نہ کہیں اس سلسلۂ تقسیم کو رک جانا پڑے گا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ مادہ (یا تمام اجسام) ایسے ہی آخری انتہائی ناقابل تقسیم ذرات سے مرکب ہے جن کی اب مزید تقسیم و تجزی نہیں ہو سکتی۔ یونانی لفظ "ایٹم" اسی ناقابل تقسیم ذرہ کا نام ہے۔ جو نامتناہی زمان و مکان میں حرکت کرتے کرتے اتفاق سے آپس میں مل کر مختلف قسم کے مرکبات (یا اجسام) کو جنم دیتے ہیں، جن کا نام ہماری دنیا یا کائنات ہے۔"

ایٹم ... (سالمہ[1]) کے اس سادہ و سطحی یونانی تصور کو کوئی دو ہزار سال بعد گذشتہ (انیسویں) صدی کے اوائل میں ہنچسٹر کے مشہور ماہر کیمیا جان ڈالٹن نے از سر نو باقاعدہ سائنسی مفروضہ (HYPOTHESIS) کی حیثیت عطا کی۔ پانی وغیرہ کسی جسم کو حصہ تقسیم در تقسیم کرتے ایسے انتہائی جز یا ذرہ تک پہنچا دیا جائے کہ اب اگر اس کی مزید تقسیم و تجزی کی جائے تو اس کا پانی پن یا مائیت ختم ہو جائے تو اس کو پانی کا سالمہ (مکسرہ) (MOLECULR) کہا جائے گا، اب اس سالمہ (مکسرہ) کو اگر مزید توڑا یا منکسر و منقسم

---

[1] ان ہی ایٹم کو دیمقراطیس کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر عربی میں دیمقراطیسی اجزا یا ان کو ناقابل تقسیم کیے جانے کی بنا پر اجزاء لا یتجزیٰ کہا جاتا ہے، مگر مکسرہ یا مالیکول کے مقابلہ ان کو سالمہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا جیسا کہ نحوی اصطلاح میں جمع سالم کی اصطلاح جمع مکسر کے مقابلہ ہے۔

کیا جائے تو اس سے جو اجزا بر آمد ہوں گے وہ بسیط عنصری اجسام یا ذرات ہوں گے مثلاً پانی کے ایک مکسرہ کو اس طرح توڑنے یا کسر و انکسار سے آکسیجن نام عنصر کا ایک "اور ہائیڈروجن نام عنصر کے دو سالمے یا ایٹم بر آمد ہوں گے۔ بہ الفاظ دیگر جس کو ہم پانی کہتے ہیں اور جس کو مدتوں بجائے خود بسیط عنصر خیال کیا جاتا رہا وہ دراصل کیمیاوی طور پر آکسیجن اور ہائیڈروجن کے دو عنصروں سے مل کر بنا ہے اور ہمارے پرانے عناصر اربعہ کے بجائے اب ہائیڈروجن و آکسیجن سے عناصر کی تعداد ۹۰ تک پہنچ چکی ہے، اس طرح ایٹم نام ہے اب کسی

"کیمیائی عنصر کے چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کے ان ذرات یا (جوہروں)......."

کو ابھی کسی نے دیکھا نہیں، طاقتور سے طاقتور خوردبین سے بھی ان کو دیکھنا ناممکن ہے

یہ بال کے دس لاکھویں حصہ سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں، البتہ ان کے غیر مرئی

ہونے کے باوجود ہم ان کو تول اور ناپ سکتے ہیں"

ان ہی جوہروں...... کو زمین سے آسمان تک کی پوری مادی یا جسمانی کائنات کی تعمیری اینٹیں قرار دیا جاتا ہے، ان ہی دو یا زیادہ سالمات سے مل کر معمولاً ان سے بڑا وہ ذرہ بنتا ہے جس کو مکسرہ کہتے ہیں، سالمات معمولاً الگ الگ نہیں پائے جاتے (بلکہ کسی نہ کسی جسم کے سالمہ (مکسرہ) ہی کی شکل میں پائے جاتے ہیں) اگر کسی مکسرہ کو تحلیل یا منکسر کیا جائے تو اس کے جوہر (سالمات) کسی اور مکسرہ کے ساتھ یا آپس ہی میں مل جانا چاہتے ہیں۔

"مختلف حسابوں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک سالمہ (مکسرہ) ایک انچ کے

دو لاکھویں حصہ سے بھی بہت زیادہ چھوٹا ہونا چاہیئے، اسی طرح ایک تجربہ حساب

سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ تیل کے ایک سالمہ (مکسرہ) کا قطر ایک انچ کے پانچ کروڑویں

حصہ سے بھی کم ہوتا ہے۔

نیل کے ایک دانہ سے ایک ٹن پانی رنگ جاتا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس ایک دانہ میں نیل کے کروروں مالیکیول (مکسرات) پائے جاتے ہیں، جو سارے پانی میں پھیل کر اس کو رنگ دیتے ہیں، اسی طرح مشک کا ایک دانہ پورے کمرہ کو سالہا سال کے لئے معطر بنا دیتا ہے، بایں ہمہ دس کروڑواں حصہ بھی اس کی جسامت کا ضائع نہیں ہوتا۔ اس طرح مادہ کے ان ذرات کے انتہائی صغر یا چھوٹائی کو ظاہر و ثابت کرنے کے سیکڑوں طریقوں یا تجربوں سے کام لیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض تجربات کی بنا پر تعین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اوسطاً سالمہ (مکسرہ) کا قطر ایک انچ کے بارہ کرور پچاس لاکھویں $\frac{1}{125......}$ حصہ سے بھی کم ہوتا ہے۔"

اب ہر مالیکیول (مکسرہ) چونکہ خود ایٹموں (سالمات) کا مجموعہ ہوتا ہے۔

"اس لئے لازماً سالمہ یا ایٹم خود مکسرہ سے بھی چھوٹا ہوتا ہے، مختلف سالمات وزن و حجم کے اعتبار سے باہم بہت مختلف ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ اگر ایک ایک سالمہ کو یکے بادیگرے رکھا جائے تو ایک انچ خط کے لئے چالیس کروڑ سالمات درکار ہوں گے اور ایک گرام وزن کے لئے کم از کم سونے کے کرور کھرب (TRILLIUN) ایٹموں کی ضرورت ہوگی۔"

مکسرات کی سرعت رفتار کا اندازہ اس سے کرو کہ:۔

"ہائڈروجن کا ایک مکسرہ سالمہ ایک سکنڈ میں ایک میل سے زیادہ حرکت کر جاتا ہے۔ ساکن یا بند ہوا کا مکسرہ رائفل کی گولی سے زیادہ تیز رفتار ہوتا ہے اور ایک انچ کے ہر بیس ہزارویں حصہ کی مسافت پر یہ دوسرے سے ٹکراتا ہے اور ان

ٹکروں کی بنا پر ہر سکنڈ میں پانچ ارب مرتبہ اپنا رات بدل لیتا ہے[۵]"

جان ڈالٹن نے گذشتہ صدی کے بھی اوائل ہی میں ایٹم کی سالمیت یا اس کے ناقابل تقسیم و تجزی ہونے کا جو دعویٰ کیا تھا اور جو سائنسی حلقوں میں مسلمہ حقیقت بن چکا تھا وہ اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا اور ۱۸۹۵ء ایٹم کی سالمیت ہی نہیں، سچ یہ ہے کہ مادہ کی مادیت ہی کے حق میں موت کا پیغام ثابت ہوا۔ انسان کی عیب طلب فطرت ہی کا لازمہ توحید یا وحدت طلبی بھی ہے، یعنی وہ عیب بعد از عیب کو تلاش کرتے کرتے کسی ایسے آخری عیب کو پالینا چاہتا ہے جو اس اتھاہ کائنات کی حد و شمار سے باہر کثرتوں کا واحد سرچشمہ یا ان کے تنوعات اور رنگا رنگیوں کی وحدت ہو، بالفاظ دیگر سارے موجودات کو وجود واحد میں تحلیل کر لینا یا اس کا مظہر جان لینا چاہتا ہے۔

"ماہرین کیمیا کا اب تک خیال تھا کہ قریباً [۲]۹۰ قسم کے مختلف ایٹم یا مادہ کی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں، مگر اس کثرت اقسام سے کوئی مطمئن نہ تھا، سائنس ہمیشہ وحدت و بساطت کی جویاں رہتی ہے ....... مگر ماہرین کیمیا چونکہ ان مختلف قسم کے عناصر یا سالمات کو مزید بسائط میں تحلیل نہ کر سکے تھے، اس لئے ان کو ناقابل تقسیم ایٹم کہتے تھے، تاہم اس امید میں سائنس داں برابر لگے تھے کہ کوئی نہ کوئی ایسا اساسی مادہ منکشف ہو کر رہے گا جس سے تمام مختلف عناصر کے ایٹم مرکب ثابت ہوں، جو ایسا ابتدائی جوہر ہو گا جس سے مادہ کی مادی مختلف و متنوع صورتیں رونما ہوئی ہیں۔ پراوت (PRAUT) نے اسی وقت ایسا

---

[۱] یہ مختلف مختصر اقتباسات "ماڈرن بلیف" کے حصہ چہارم کے ص ۲۲۱ سے ص ۲۲۴ تک سے ملخصاً لئے گئے ہیں

[۲] اب ان کی تعداد ۱۰۴ تک پہنچ گئی ہے

اشارہ کیا تھا جبکہ ڈالٹن نے از سرِ نو سالمات کا انکشاف کیا تھا۔

اس امر کے انکشاف کا کہ جواہر..... ناقابل تقسیم و ناقابل نفوذ ازلی ابدی ذرات

نہیں، پہلا قدم عکس ریز شعاعوں (X-RAYS) کا انکشاف تھا۔

یہ شعاعیں ہیں کیا؟ یہ نہ مادہ کی کوئی صورت ہیں، نہ مادی ذرات بلکہ اشعاع

یا شعاع افشانی و تابکاری (RADIATION) کی ایک صورت یا قسم ہیں۔

یا روشنی کی ایک ایسی نئی قسم جو اجسام کے اندر تک نفوذ کی غیر معمولی قوت رکھتی ہے[1]

یہ شعاع افشانی یا تابکاری برقی امواج پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کی نوعیت ہماری

معمولی روشنی ہی کی ہوتی ہے۔ البتہ ان کا طولِ موج بہت ہی کم ہوتا ہے۔

سب سے پہلے یہ معلوم ہوا کہ ریڈیم اور یورینیم جیسی دھاتوں سے تین قسم کی شعاعیں

نکلتی ہیں جن کا نام الفا بیٹا اور گاما رکھا گیا۔ ان میں سے سب سے زیادہ اہم و

دلچسپ بیٹا شعاعیں ہیں..... ان ہی کا نام آگے چل کر الکٹران (ELECTRON)

یعنی برق پارے یا برقی ذرات پڑا۔ یہ جسم و جسمانیت[2] سے آزاد (DISEMBODIED)

برق یا بجلی ہوتے ہیں، جو اس شعاعی صورت میں مادہ کے ایٹم سے آپ سے آپ آزاد

ہو جاتے ہیں..... اور اب ان کو مختلف وسائل یا طریقوں سے ہم خود بھی ایٹم

سے جدا کر سکتے ہیں۔ پوری کائنات میں جہاں کہیں جس قسم کا بھی کوئی ایٹم یا مادہ

پایا جاتا ہے وہ ان برق پاروں (منفی برق کی اکائیوں یا واحدوں) ہی سے بنا ہوتا

ہے جن کا مرکز مثبت برق کی اکائیاں ہوتی ہیں جن کو پروٹان کہا جاتا ہے۔

---

[1] جو پتھر گوشت وغیرہ ہر طرح کے ٹھوس کثیف یا غیر شفاف اجسام تک میں گھس جاتی ہے۔

[2] الکٹران کا متعین منفی مقدار برق متعین مقدار مادہ کمیت (MASS) کیساتھ ساتھ ایک حجم یعنی کروی جسم بھی ہوتا ہے۔

الکٹرون کا جداگانہ وجود صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جبکہ وہ کم از کم
چھ سو میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہو، ورنہ پھر جو پہلا ایٹم اس کو مل جاتا
ہے، اس میں مدغم ہو جاتا ہے۔ یہ برقی ذرات (الکٹران) دس ہزار سے لے کر ایک لاکھ
میل تک فی سکنڈ تیز رفتاری سے حرکت کر سکتے ہیں ....

یہ الکٹران چھوٹے سے چھوٹے معلوم ایٹم سے بھی ہزاروں گنا چھوٹے ہوتے ہیں
تازہ ترین پیمائشوں کی رو سے ہر ذرہ کی کمیت (Mass) ہائڈروجن کے
ایٹم کی $\frac{1}{1845}$ ہوتی ہے۔ ان برق پاروں کے انکشاف سے مادہ کے آدھے اسرار
کی کلید ہاتھ آگئی ہے۔ برقی رو (CURRENT) جس کو کچھ ہی دن پہلے تک
فطرت کا ایک نہایت ہی پراسرار مظہر خیال کیا جاتا تھا، اس کی توجیہ ان برق پاروں
کی تیز رفتاری سے ہو گئی ؎

غرض زمین و آسمان کے لاتعداد اجسام و اجرام جن کو ہم آنکھوں دیکھا جیسا ٹھوس جانتے
تھے، نہ صرف یہ کہ وہ ایک بال کے لاکھویں حصہ سے بھی زیادہ باریک ان دیکھے ایٹم نام کے
ذرات سے مرکب ہیں، بلکہ خود یہ ...... ایٹم جو ابھی گئی صدی کے آخر آخر تک بجائے خود
بالکل ٹھوس جامد ناقابل کسر و انکسار اور ہر طرح قطعاً ناقابل نفوذ تصور کئے جاتے تھے،
آپ نے دیکھا کہ اب یہ ایک بال کے دس لاکھویں حصہ سے بھی زیادہ باریک اپنے سے بھی
ہزاروں گنا چھوٹے ذرات سے مرکب ثابت ہوئے ...... اور جس طرح ؎

"ستارے، انسان، موٹر، مکھی، چیونٹی، مچھلی، سمندر، چڑیا اور ہوا، ہر چیز اور سارا
مادہ ایٹموں میں تحلیل ہو جاتا ہے، اسی طرح سالمات منفی مثبت برقی پاروں
(CHARGES) یعنی مادہ برق یا بجلی کے سوا کچھ نہیں"

کہا جاتا ہے کہ سالمہ کی اس تحلیل یا ایک مزید غیب در غیب کی دریافت نے کائنات کی نسبت نفس خیالات ہی میں عظیم انقلاب نہیں برپا کر دیا بلکہ طرز فکر ہی کو سرے سے اتنا بدل ڈالا ہے، کہ کائنات کی تعمیر میں مادہ سے بے انتہا زیادہ حصہ خلا یا کہنا چاہیئے کہ عدم مادہ کیا، سرے سے عدم کا ہے، مادی سالمات اسی خلا یا غیر مادی خلا یا عدم مادہ میں تیرتے پھرتے ہیں۔

پھر "ہر سالمہ میں بھی بہت زیادہ حصہ خلا ہی خلا کا ہوتا ہے نسبتہً اتنا زیادہ جتنا مختلف ستاروں کے مابین (لاکھوں میل کا) مثلاً انسانی جسم کی ترکیب و تشکیل میں جتنے الکٹران، پروٹان شریک یا داخل ہیں ان کو اگر اس طرح دبا اور آپس میں بالکل ملا دیا جا سکے کہ درمیان میں کوئی جگہ یا خلا نہ رہے تو اس کی حیثیت بس ایک ایسے چھوٹے سے دھبہ کی رہ جائے گی جس کا دیکھنا بھی دشوار ہوگا۔ ہر سالمہ چھوٹے پیمانہ پر گویا ایک نظام شمسی ہوتا ہے جس میں آفتاب (مرکز یا پروٹان) کے گرد سیارات یا الکٹران حرکت کرتے رہتے ہیں اور ان کے مابین نسبتہً اتنی ہی خلا یا خالی جگہ پائی جاتی ہے جتنی مختلف سیاروں اور آفتاب کے درمیان۔"

لیکن سالمہ کو چھوٹے پیمانہ پر نظام شمسی کے مماثل قرار دینا گو ایک حد تک درست ہے... تاہم بقول ایڈنگٹن (EDDINGTON) کے یہ بس ایک بھونڈا نمونہ یا مثال ہی مثال ورنہ سچ یہ ہے کہ سالمہ کے اندرونی حقیقت کا معاملہ کچھ ایسا ہے جو انسانی ذہن کی رسائی سے باہر ہے۔

اوپر کے جستہ جستہ ناتمام اقتباسات کا مدعا اس نام نہاد خود مادی کائنات کا کوئی تفصیلی سائنسی جائزہ نہیں، بلکہ خود سائنس وہ بھی صرف اس کی موجودہ رسائی کی حد تک اس کی بے پایاں وسعت و پہنائی اور اس کے اندر ہی اندر کے اضافی غیوب در غیوب کی جو نوعیت معلوم کر سکی ہے، اس کا ایک بہت دھندلا خاکہ زیر بحث مقصد کے لئے پیش کر دینا

ہے، اور سائنس ہی کی زبان سے اس کو چند سطروں میں پھر ذہن نشین کرتے چلیں کہ ایک سرے پر:-

"اس کی بے پایاں وسعت، ناقابل تصور فاصلے، وہم وخیال میں نہ سمانے والی سحابوں کی جسامت، سورج اور ستاروں کے افسانائی قدوقامت۔ دوسرے سرے پر لاانتہا صغر یا چھوٹائی کا یہ عالم کہ سالمہ ویسا ہی ناقابل تصور حد تک چھوٹا ہے جیسا کہ سحابہ ناقابل تصور حد تک بڑا۔ پانی کے ایک قطرہ میں اربوں کھربوں سالمات پائے جاتے ہیں، پھر اس سالمہ کے اندر اس سے بھی چھوٹے چھوٹے الکٹران یا برقی ذرات ہوتے ہیں جن کے مابین نسبتہً ایسی ہی بڑی بڑی خلائیں یا فاصلے پائے جاتے ہیں۔ جیسے آفتاب اور اس کے سیاروں کے مابین۔ پھر سالمہ کی بجائے خود اتنی تنگ اور اتنی فراخ دنیا کے اندر عقل کو بوکھلا دینے والا ایک مسلسل ڈرامہ جاری ہے"[1]

اور اس ڈرامہ کے ایکٹر اب صرف الکٹران و پروٹان دو ہی نہیں رہ گئے ہیں، بلکہ الکٹران و پروٹان کے انکشاف کے بیس سال بعد سالمی ذرہ کی ایک اور قسم کا پتہ چلا جس کو نیوٹران سے نامزد کیا گیا..... پھر دو سال بعد ایک اور قسم کے ذرّات کا پتہ چلا جن کو پازیٹران کا نام دیا گیا۔ آگے چل کر کون کہہ سکتا ہے کہ اور کیا کیا پتہ نہ چلے گا، اور ہوں گے وہ بھی صرف اضافی غیب یا اس کائنات کے اندر ہی کے غیب در غیب، جس میں ابھی ہم خود اپنی زمین تک کے بے شمار غیبوں سے جاہل ہی جاہل ہیں۔ اور صرف اپنے نظام شمسی کے ایک چاند تک رسائی کے لئے کمندیں پھینک رہے ہیں، اور ایک سیارہ مریخ کے متعلق چہ می گوئیاں

---

[1] ماڈرن بلیف حصہ چہارم ص ۲۳۵

ہو رہی ہیں کہ اس میں زندگی ہے یا نہیں اور ہماری طرح کی کوئی ذہین مخلوق بھی ہے یا نہیں اور ہے تو اپنی ذہنی و حواسی ساخت وغیرہ کے اعتبار سے کیسی ہے۔ پھر یہ تو صرف ایک ہی نظام شمسی اور اس کے صرف ایک ہی بیچارے کی بات ہے۔ ہزاروں لاکھوں شمسی نظاموں، کہکشانوں، سحابیوں میں کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے حالات کے اعتبار سے دوسری کیسے کیسے ذہن و حواس والی مخلوقات نہ پائی جا سکتی ہوں!

یہاں پھر سوچنے کی پہلی بات وہی ہے کہ انسان اگر نرا جانور ہی تھا تو زمین پر ہوا اور پانی کے دوسرے جانوروں کی طرح کھانے پینے، رہنے سہنے کے جن قدرتی سامانوں تک دست رس ہوتا ان ہی پر گذر بسر کرتا۔ بہت سے بہت اگر یہ صرف اعلیٰ درجہ کا یا بڑھیا جانور ( HIGHER ANIMAL ) تھا تو زیادہ سے زیادہ کھانے پینے رہنے سہنے وغیرہ کی حیواتی ضروریات ہی دوسرے ادنیٰ جانوروں کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کی یا بڑھیا پیدا کر لینے پر قانع رہتا مثلاً کاشتکاری و باغبانی سے مختلف قسم کے غلے ترکاریاں اور پھل وغیرہ پیدا کر لیتا، ادنیٰ جانوروں کی طرح کچا کھانے کی جگہ ان کو پکا و کا کر کھا لیتا، سردی گرمی سے بچاؤ کے لئے کپڑے اور رہنے سہنے کے لئے گھر بنا لینا، غرض دوسرے حیوانات ہی کی طرح جسمانی و حیوانی ضرورتوں ہی کی فراہمی پر اکتفا کرتا۔ اور آگے بڑھتا تو جسمانی و مادی ضروریات و حاجات سے گذر کر ان ہی کے تنوعات و تعیشات کی دوڑ میں آگے سے آگے بڑھے چلے جانے پر حریص رہتا۔

مگر عجیب بات ہے کہ ابھی اس خالص حیوانیت کی راہ میں انسان بیسویں صدی سے دس بیس ۲۰ سو دو سو سال نہیں، ہزاروں سال پیچھے تھا کہ اس کا خالص علمی و نظری شعور غیب زمین اور اس کی غائی حیوانی و جسمانی حاجات و تعیشات کو ترقی دینے والے غیبوں کو چھوڑ کر

آسمان کے ایسے غیبوں اور بھیدوں کی جستجو میں لگ گیا، جن کو اس کی خالص حیوانی و مادی احتیاجات و مطالبات سے دور کا بھی کوئی علاقہ معلوم نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابھی انسان اپنی حیوانی ضرورتوں کی تکمیل و ترقی کے بالکل ابتدائی دور میں تھا کہ چار ہزار سال قبل کلدانیوں کے ہاتھ سائنسی علوم کا آغاز علم ہیئت یا فلکیات سے ہو گیا تھا۔ زمین پر کھانے پینے رہنے سہنے یا بقائے حیات کی ادنیٰ و معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے سے ذرا دم لینے پایا تھا کہ آسمان پر سورج، چاند، تاروں کے غیبی اسرار کی ٹوہ میں لگ گیا۔ گویا جیسے اس کی ظاہری حیوانیت کے اندر سے انسانیت پکارنے لگی کہ تجکو تیری اس زمین یا دنیا کا راز بھی آسمان پر یا کہیں اس سے بھی ماورا ملے گا! آج بیسویں صدی میں کہا جاتا ہے کہ ایک طرف خود زمین کے بارے میں انسانی معلومات ابھی عشر عشیر بھی حاصل نہیں، اور اتنے ناقص ہیں کہ زلزلوں، طوفانوں، آتش فشاں پہاڑوں وغیرہ تک کے متعلق اتنا علم نہیں حاصل کر سکا کہ ان کی آئے دن کی تباہ کاریوں کی پیشین گوئی کر کے وقت پر پیش بندی کر سکے۔ لیکن دوسری طرف فلک پروازی کے نراز حیوانی یا مادی زندگی کی ضروریات سے بظاہر بالکل دور از کار اور انسانی ذہن کو بوکھلا دینے والی فلکیاتی کائنات کی وسعتوں کا اندازہ ابھی اور ہی کچھ ہو چکا۔ پھر یہ فلک پروازی اربوں کھربوں نوری سالوں والے فاصلوں تک جا کر بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ اور آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ کائنات کی یہ وسعت روز بروز برابر اور بھی آگے ہی آگے پھیلتی یا وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔[1]

---

[1] اس روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی جانے والی اتھاہ کائنات کے متعلق ایک بالکل تازہ بتازہ (۳۱ مارچ ۱۹۶۴ء) کی پاساڈینا سے چلی ہوئی اخباری اطلاع پڑھی کہ ماہرین فلکیات نے فضائے بسیط میں دور اتنے فاصلے پر کوئی شئے اتنی تیزی سے حرکت کرتے دیکھی کہ کائنات (باقی صفحہ ۹۳ پر)

نپاساڈینا ۱۳ر مارچ ۔ ماہران فلکیات نے فضائے بسیط میں دور اتنے فاصلے

پر کوئی شئے اتنی تیزی سے حرکت کرتی دیکھی ہے کہ کائنات کی عمر وجسامت کے تمام

موجودہ نظریات متزلزل ہو گئے ہیں۔

ماؤنٹ ولسن اور پالومر رصدگاہوں کے ایک ماہر فلکیات ڈاکٹر مارٹیس شمڈ

نے کہا۔ یہ چیز اتنی حیرت انگیز ہے کہ ہمارے تمام آلات کوڑے کے ڈھیر پر پھینک

دینے کے لائق رہ گئے ہیں۔

ریڈیائی ماہر فلکیات ڈاکٹر مسن میتھو اور ڈاکٹر شمڈ نے اس شئے کو دریافت

کیا ہے اور اس میں بیحد تیز روشنی اور ریڈیائی لہریں پھوٹ رہی ہیں۔

خیال ہے کہ یہ شئے ایک ایسی کہکشاں یا کہکشاؤں کا مجموعہ ہے جو پھٹ رہا

ہے اور یہ شے اتنی دور ہے کہ انسان نے اس سے زیادہ فاصلے پر کوئی شے

نہیں دیکھی ہے اور اتنی تیزی سے چل رہی ہے کہ جس کا اندازہ محال ہے یعنی

تقریباً روشنی سے نصف رفتار سے۔

اور یہ آخرالذکر چیز ہے کہ جس نے ماہران فلکیات کے تمام وہ آلات بیکار کر دیئے

ہیں جن سے وہ کائناتی پیمانے پر زمانہ و فاصلہ کا تعین کرتے ہیں۔

اب تک ماہران فلکیات جس تکنیک سے کائناتی رفتار و فاصلے کو ناپتے

---

(باقی صفحہ ۸۴ کا) کی عمر وجسامت کے تمام موجودہ نظریات متزلزل ہو گئے...... یہ چیز اتنی حیرت انگیز ہے کہ ہمارے تمام آلات کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دینے کے لائق رہ گئے ہیں...... یہ شئے ایک ایسی کہکشاں یا کہکشاؤں کا مجموعہ ہے جو پھٹ رہا ہے اور اتنی دور ہے کہ انسان نے اس سے زیادہ فاصلہ کی کوئی شئے نہیں دیکھی۔

رہے ہیں اس کو سائنس کی زبان میں "ریڈ شفٹ" کہا جاتا ہے جو چیز جتنی تیز
رفتار سے چلتی ہے اتنی ہی اس شئے سے موصول ہونے والی روشنی قوس قزح
کے سرخ نکلنے کی طرف ہٹتی جاتی ہے"۔

اگر سائنس کے نام کی ہیبت و مرعوبیت نہ ہو تو ان ہوش ربا باتوں کے آگے
"طلسم ہوش ربا" کی بھی حقیقت کیا رہ جاتی ہے! ہمارے موضوع کے لئے کام کی بات
یہ ہے کہ یہ "طلسم ہوش ربائی" کائنات بھی ہماری ہی کائنات، یا اس نظام موجودات کا
سلسلہ ہے جس کے شمسی نظام کے صرف ایک حقیر سیارہ زمین پر ہم آباد ہیں اور جس کی بساط
خود ہمارے سورج کے مقابلہ میں بھی مٹر کے ایک دانہ سے زیادہ نہیں تو پھر پوری ناپیدا کنار
کائنات کے مقابلہ میں اس کی بے بساطی کو صفر کے سوا کیا تصور کیا جائے! مگر یہ پھر بھی
یہ صرف ہماری کائنات یا ہمارا عالم شہادت ہی اور اس کی لاتعداد نوری سالوں والی
دوریوں پر پائے جانے والے اجرام سماوی بھی تمام تر اسی ہمارے عالم شہادت کے
دور سے دور افتادہ گوشے ہیں، اور اس عالم شہادت کے جن ہوش ربا غیبوں تک ہماری
علمی یا سائنسی تحقیقات کچھ شمہ بھر رسائی پا سکی وہ سب کی سب بہر حال اس عالم شہادت کے
اندر ہی اندر کے غیوب ہیں۔

لیکن انسان کی غیب طلبی کی پیاس تو اب بھی جوں کی توں رہی اور سوالوں کے
سوال سب سے بنیادی اس سوال کا جواب تو بدستور باقی رہا کہ اس ہماری پوری اتھاہ
کائنات یا ارض و سماوات کے پورے کے پورے عالم شہادت کا مجموعی حیثیت سے
اول و آخر یا ماضی و مستقبل کا سب سے ابتدائی اور سب سے انتہائی غیب کیا ہے؟
جو اس بیسویں صدی کی سائنس و عقل کے لئے بھی وہی ہے جو اولین انسان کے لئے

تھا کہ:۔

"اول و آخر این کہنہ کتاب افتادہ است"

یہ کتاب کائنات ہم کو ملی ہی اس حال میں ہے کہ نہ اس کے اول کا پتہ ہے نہ آخر کا۔ اور ہمارے لئے سب سے اہم و اقدم غیبوں کا غیب اس کائنات کے اول و آخر یا آغاز و انجام ہی کا غیب ہے۔ اس لئے کہ بغیر اس کے جانے پائے ہم خود اپنے انسانی مقصد و انجام یا محل و مقام ( MAN'S PLACE IN NATURE ) کو اس کے اندر کیسے معلوم و متعین کر سکتے ہیں۔

پوری کائنات یا عالم شہادت کے اول و آخر کے انتہائی غیب اور اس کے ظاہر کے انتہائی باطن کے سوال کو حل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو خود عالم شہادت کی اندرونی شہادتوں اور عام عقلی و تجربی، سائنسی و علمی طریقہ ہی سے اس کا کھوج لگایا جا سکے۔ یا انسانی عقل و تجربہ سے ماورا براہِ راست کوئی دوسرا ذریعۂ علم ہو۔ ایسی "کہنہ کتاب" کی یہ مثال مثال کے درجہ میں بہت اچھی ہے جس کے اول و آخر کے اوراق ندارد ہوں۔ ایسی کتاب کے مصنف، زمانۂ تصنیف، مقصد تصنیف وغیرہ کے سوالوں کے حل کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ خود اس کتاب کی زبان، خط، مضامین و مباحث وغیرہ کی اندرونی شہادتوں کی چھان بین سے قیاسی طور پر جہاں تک ہو سکے ان سوالوں کا جواب حاصل کیا جائے، دوسرا ہر شک و شبہ سے پاک قطعی و یقینی طریقہ یہ ہو گا کہ خود مصنف کی لکھی ہوئی براہِ راست کوئی ایسی کتاب کسی ذریعہ سے مل جائے جس میں خود اس نے ان سوالوں کا جواب دے دیا ہو۔

کتاب کائنات کی اندرونی شہادتوں کی نوعیت یہی ہو سکتی ہے کہ جو بظاہر طرح طرح کی بے شمار چیزیں اس کے اندر موجود ہیں، خود ان موجودات ہی کی علمی و سائنسی یا تجرباتی و

اضطراری تحقیق و تفتیش، تحلیل و تجزی سے ان کی بے شمار کثرتوں کے پس منظر میں چھپی ہوئی کسی ایسی وحدت کو معلوم کریں جو ان بے شمار کثرتوں کا اولین مبدء و ماخذ معلوم ہوتی ہو اور پھر اس کو یا اس نوعیت کی کسی اور اعلیٰ وحدت کو پورے عالم شہادت کا انتہائی غیب یا اول و آخر مبدء و مرجع فرض کرلیں۔

# خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی

عروج ماہ کو انساں سمجھ گیا لیکن
ہنوز عظمت انساں سے آگہی کم ہے

(نسوا اللہ فانساھم انفسھم)

(انسان جس کو خدا نے خود اپنی خدائی خلافت سے نوازا تھا اس کی خدا فروشانہ بغاوت یا حماقت کی سزا "خود فراموشی" یا عین اپنی "انسانیت" کو بھلا دینے کے سوا ہو ہی کیا سکتی تھی)

اس عالم شہادت کی موجودات میں اگر ہم پہلے خود اپنے وجود کو لیں تو اس کے ظاہر و باطن کے نمایاں طور پر دو الگ الگ رخ جسم و نفس (BODY AND MIND) کے نظر آتے ہیں۔ ان میں بالذات و براہ راست علم و شعور ہم کو اپنے نفس ہی کا حاصل ہے۔ یا یوں کہو کہ ہم عالم شہادت کی جن چیزوں کا بھی کسی طرح کوئی علم و ادراک رکھتے ہیں تو ان کے ساتھ بلکہ ان سے پہلے ہم کو خود اپنی یا علم و ادراک والی ذات و نفس کا بالکل براہِ راست وجدانی و بدیہی علم و شعور حاصل ہوتا ہے، باقی اپنی اس ذات سے باہر خارج کی جس دنیا کا ادراک و احساس جو کچھ ہوتا ہے اسی علم و ادراک والی ذات کے واسطہ سے یا اسی کی بدولت۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ

بہت کچھ اسی کی تخلیق یا کم از کم شریک تخلیق ہونے کی بدولت۔ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ اس لئے عقل ومنطق کی صحیح راہ یہ تھی کہ عالم شہادت کے اول و آخر ظاہر و باطن یا اس کے مبدء و مرجع کے انتہائی غیب یا غیب الغیوب کی کھوج کا مبدء، اور نقطۂ آغاز اپنی علم وادراک والی ذات و ذہن ہی کو بنا کر آگے بڑھا جاتا۔

مگر انسان کو "انسانیت" کی صحیح راہ سے گمراہ کرنے والی سب سے بڑی بھول یہی خود فراموشی ہوئی کہ خود اپنی یا اپنے ذہن و نفس کی نوعیت و حقیقت پر غور و فکر سے کام نہ لیا جس کا علم یا وجدان و شعور بلا احتیاج دلیل بالذات و بداہتہً حاصل تھا۔ اسلئے محض حواسی مغالطہ کھا کر تمام مادی و جسمانی محسوسات کو زیادہ حقیقی و یقینی گمان کر بیٹھا جن کا بظاہر جسمانی آلاتِ حس کے وسائط در وسائط اور مفروضات در مفروضات کے ذریعہ شعور ہوتا تھا، دھوکا یہ لگا کہ جسمانی موجودات کو تو وہ اپنی کھلی آنکھوں دن دوپہر خارجی زمان و مکان میں موجود و متحرک دیکھ رہا ہے تو پھر ان آنکھوں دیکھی چیزوں بلکہ خود اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلادے۔ مگر اس کا خیال نہ کیا کہ ان محسوسات کی تعمیر و تشکیل یا تخلیق میں خود احساس کرنے والے ذہن کا کچھ حصہ تو نہیں اور ہے تو کیا اور کتنا؟ بس عقل و فکر کی آنکھیں بند کئے خالی یہی نہیں یقین کر لیا کہ خارج میں صرف جسم اور جسمانیات ہی موجود نہیں بلکہ ان کے وجود و حرکت کے لئے خارج ہی میں جگہ اور وقت یا مکان و زمان بھی موجود ہے جس میں یہ پائے جاتے اور ادھر اُدھر حرکت کرتے رہتے ہیں۔

خود فراموشی کی اس خود فریبی نے جب جسم یا مادہ اور زمان و مکان کی گاڑی کو ذہن یا نفس و روح کے گھوڑے کے آگے جوت دیا تو پھر آپ بھی ذرا الٹے چل کر گھوڑے سے پہلے جسم و جسمانیات یا مادہ و مادیات کی زمان و مکان والی کائناتی گاڑی کی خود سائنسی جانچ پڑتال کے نتائج دیکھ لیں۔ ابھی اوپر خود اپنے جسم یا ۵، ۶ فٹ کے لمبے چوڑے ڈیل ڈول ہی میں جسم و جسمانیت

یا مادہ و مادیت کا جو حصہ ہے اس کی بساط دیکھ چکے کہ اگر ہمارے پورے جسم کے برقی ذرات کو "اس طرح دبا کر آپس میں ملا دیا جائے کہ درمیان میں کوئی جگہ یا خلا نہ رہ جائے تو اس کی حیثیت بس ایک حقیر سے دھبّہ کی رہ جائے گی جس کا دیکھنا بھی دشوار ہوگا۔" انسانی جسم و جسمانیت یا مادہ کی اس بے بساطی کی تصویر ایک اور تازہ ۱۹۵۷ء کی سائنس کی کتاب[۱] میں ملاحظہ ہو:۔

"انسانی وجود جن ایٹم یا جواہر سے بنا ہے ان کے مرکز و مدار کے تمام برقی ذرات کو اگر بالکلیہ آپس میں ملا دینا ممکن ہو (کہ درمیان میں کوئی خلا یا جگہ باقی نہ رہے) تو نہ ہماری ہڈیوں کا پتہ ہوگا (نہ ان پر چڑھے ہوئے گوشت پوست کا) نہ عضلاتی و اعصابی بافتوں کا اور نہ ہمارے "سرِ پُر غرور" کا۔ بس ہلکا یا دھندلا سا نشان رہ جائے گا۔"

انسان کی انسانی سائنسی حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہاں یہ حقیقت خوب یاد رکھنے کی ہے کہ اس کی تخلیق و تشکیل میں مادہ کا حصہ صفر کے ایک نقطہ سے زیادہ نہیں، باقی جو کچھ اس کے ۵،۶ فٹ کے وجود میں ہے وہ خالی مکان یا خلا (SPACE) جو ظاہر ہے نہ مادہ ہے نہ مادی۔ بہ الفاظ دیگر انسان کی انسانیت کی تعمیر میں اس غیر مادی خلا یا مکان کو اتنا عظیم دخل ہے کہ اگر اس کو درمیان سے نچوڑ لیا جائے تو آپ اور آپ اور خود بڑے سے بڑے سائنس دانوں نیوٹن، ڈارون، آئینسٹائن وغیرہ کے سرے سے اس "سرِ پُر غرور" ہی کا نام و نشان نہ رہ جائے گا جس کے ساختہ پرداختہ نظریوں یا دریافتوں پر ان کو ناز ہوتا ہے باقی خود اس خلا یا مکان کی حقیقت آگے آتی ہے،

اب ذرا اپنے جسم ہی کی طرح پوری مادی کائنات کے جسم سے بھی خلا یا درمیانی جگہ کو نکال نچوڑ کر اندازہ فرمالیں کہ اس میں مادہ و جسم کی بساط کیا رہ جاتی ہے۔ مگر پہلے پوری کائنات کی وسعت

---

[۱] (آباد کائنات) ("THE INHABITED UNIVERSE" BY D. D. DEMPSTER AND K. W. GALLAND) مطبوعہ نیویارک۔

کو ایک مرتبہ از سرِ نو پیش نظر کرلیں:۔

"خالی آنکھ سے جو ستارے دیکھے جا سکتے ہیں ان کی تعداد دس ہزار سات سو (۱۰،۷۰۰) ہے، باقی بڑی بڑی دُور بینوں سے سات کرور (ستر ملین) تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور فوٹو گراف میں یہ تعداد ہزاروں ملین تک جا پہنچتی ہے۔ لیکن مدہوش کر دینے والے یہ اعداد اصل میں بیرونی خلا میں شروع ہوتے ہیں، جہاں کروروں (ملینوں ملین) سحابیے اور اربوں ارب (ملیرڈون ملیرڈ) ستارے پائے جاتے ہیں...... انسانی ذہن کو چکرا دینے والے یہ اعداد و شمار کسی پاگل دماغ کی پیداوار معلوم ہونے لگتے ہیں......"

پاگل دماغ کی اس پیداوار کے آگے ہی سنیں کہ:۔

"یہ ناقابلِ یقین اعداد و شمار بھی بجائے خود ہیچ در ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں جب ہم ان کے مقابلہ میں کائنات کی اس وسعت و پہنائی کا خیال و اندازہ کرتے ہیں کہ ان اربوں کھربوں ستاروں، کہکشانوں، سحابیوں وغیرہ کی بساط کائنات کی وسعت میں ایسی ہے جیسے اگر زمین کو ایک بالکل خالی کرہ فرض کر لیا جائے تو اس میں ایک ذرہ کی ہوگی۔"[۱]

پھر خلا یا عدم مادہ کے مقابلہ میں ریت کے ایک ذرہ برابر اس بے بساط مادہ کی جس حقیقت تک خود سائنس اب تک جا سکی ہے، اس کی تفصیل بھی اوپر ہی آپ پڑھ آئے، ماحصل جس کا یہ ہے کہ مادی کائنات کی نسبت ہمارا تصور جو یہ تھا کہ آنکھوں سے جس طرح ہم اس کو لمبا چوڑا ٹھوس دیکھتے ہیں کچھ اسی طرح کے ایٹم نام ٹھوس ذرات سے اس کی ابتدا ہوئی ہے ابھی انیسویں صدی

---

[۱] (ہماری دنیا اور اس کی شروعات) BY "OUR WORLD AND ITS BEGINNINGS" (GOUSLAW FOCHLER HAUKE) ص ۲۳ مطبوعہ روڈ ہام پریس لندن۔

کے اواخر تک کی سائنسی دنیا کا یہ مسلمہ بنا ہوا تھا کہ یہ اٹیم یا سالمات بجائے خود اتنے ٹھوس اور سالم ہیں کہ ان کی اب نہ مزید تقسیم و تجزی ہو سکتی ہے، نہ ان کے اندر باہر کی کوئی چیز داخل ہونے کی قطعاً کوئی گنجائش ہے، اور پوری کائنات کی تعمیری اینٹیں یہی اٹیم یا سالمات ہیں۔

مگر آپ نے دیکھا کہ ان اینٹوں کی توڑ پھوڑ سے کچھ اور اندرونی اینٹیں ایسی برآمد ہو گئیں جن کو مادہ کا نام دینا بھی دشوار ہو گیا اور کہا جانے لگا کہ مادہ "غیر مادی" (IMMATERIAL) ہو کر رہ گیا ہے۔

# آنکھوں دیکھا جھوٹ

یا

# مادہ و مادیت کی چیستاں

اب آگے بڑھنے سے پہلے اوپر کے بعض جدید بلکہ جدید ترین سائنسی معلومات و مسلمات کے تجزیہ سے ان کے کچھ لوازم و مضمرات کا بھی ذرا جائزہ لے لیں۔

مادیت یا مادہ پرستی کی بنیاد جس سب سے بڑے عام مگر عامیانہ مغالطہ پر ہے، وہ یہی تو ہے، جس کا اوپر بھی کچھ ذکر آچکا کہ آدمی کی خود اپنے جسم اور اس سے باہر جس چیز پر بھی نگاہ پڑتی ہے، زمین سے لے کر آسمان تک اپنے ہی جیسے جاندار یا بے جان ہر طرف شش جہت میں اجسام ہی اجسام تو دکھائی دیتے ہیں، پھر ان ہی کے مجموعہ کا مختصر یا علمی نام ہی تو مادہ ہے جس کی طرح طرح کی آنکھوں دیکھی ان گنت صورتوں، شکلوں سے پوری کائنات بھری پڑی ہے،

اس آنکھوں دیکھے مادہ یا مادی اجسام کے عام و عامیانہ مغالطہ کی پہلی پردہ دری تو سائنس کے ہاتھوں یہ ہوئی تھی کہ یہ دکھائی دینے والے یا مرئی و محسوس اجسام دراصل جن حقیقی عنصری یا مادی اجسام سے مرکب ہیں، وہ بجائے خود ایسے انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات (اٹیم)

ہیں جن کو کوئی انسانی آنکھ تو کیا دیکھ پائی، طاقتور سے طاقتور خوردبین سے بھی ان کو دیکھنا ناممکن ہے اور یہ ایک بال کے دس لاکھویں حصہ سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں۔[۱]

فرمائیے بال کے دس لاکھ حصے کئے جائیں تو اس کے ایک حصہ کو غریب جسم کی آنکھ کیلئے یا طاقتور سے طاقتور خوردبین سے دیکھ سکنے کا سوال دور رہا، ذہن کی آنکھ بھی محض فرض کر لینے کے سوا کوئی واضح تصور کیا قائم کر سکتی ہے؟ مادہ کی یہ رہی سہی ان دیکھی حقیقت بھی اب بیسویں صدی کی سائنسی دنیا میں اتنی فرسودہ ہو چکی ہے کہ بال کے دس لاکھویں حصہ کے برابر یہ چھوٹا سے چھوٹا ذرہ بھی الکٹران وغیرہ ایسے مزید برقی ذرات میں تحلیل ہو کر کہ اس کی جسمیت یا کمیت (MASS) مثلاً ہائڈروجن کے کسی ایٹم کو اٹھارہ سو پینتالیس ۱۸۴۵ حصوں میں تقسیم کیا جائے تو بس ایک حصہ کے برابر ہو گی یعنی $\frac{1}{1845}$

فرمائیے بال کے دس لاکھویں حصہ کے بھی ۱۸۴۵ حصہ کو فرض کر لینے کے سوا موجود کہاں تک تصور کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ہیزن برگ کو کہنا ہی پڑا "کہ ان بنیادی ذرات مثلاً نیوٹران کو وجود تک سے متصف کرنا (یعنی موجود تک کہنا) دشوار ہے۔ جدید کوانٹم نظریہ کی رو سے یہ ابتدائی ذرات بالآخر ریاضیاتی صورتیں (FORMS) ہی کہی جا سکتی ہیں یعنی فیثاغورث کے اعداد کی طرح کی صورتیں"[۲]

پھر ان ذرات کی مادیت کبھی جسم و جسمانیت سے آزاد (DISEMBODIED) برقی شعاعوں کی بتائی گئی ہے یعنی "پوری کائنات میں جہاں کہیں بھی جس قسم کا کوئی بھی ایٹم یا مادی ذرہ پایا جاتا ہے وہ ان برقی ذرات (بالفاظ دیگر منفی برق کی اکائیوں) ہی سے بنا ہوتا ہے جس کا

---

۱؎ دیکھئے اوپر صفحہ ۷۲

۲؎ دیکھو اس کی کتاب "فزکس اینڈ فلاسفی" ص ۷۵

مرکز مثبت برق کی اکائیاں ہوتی ہیں جن کو پروٹان[1] کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد الکٹران و پروٹان کے علاوہ نیوٹران پازیٹران وغیرہ اور بھی مزید برقی ذرات دریافت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ حال ہی میں نیوز (NEWS) (۹ رجولائی ۱۹۶۴ء) کی ایک اخباری اطلاع میں پڑھا کہ :-

"سائنسدانوں نے ایک نیا مادی ذرہ دریافت کیا ہے، جو مادہ کا بنیادی جز ہے، لیکن جس کا وجود ایک سکنڈ کے ایک کھربویں حصہ کے ایک سویں حصہ کی مدت تک ہی رہتا ہے۔

اس ذرہ کو "سی نا ٹ" کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہ ذرہ (من جملہ ان ۹ بنیادی ذرات کے ہے جو آج تک دریافت ہو چکے) پوری کائنات میں مادہ کی بنیاد ہے"۔

لیکن مادہ کی یہ بنیاد بھی اپنا بنیادی وجود بھی صرف ایک سکنڈ کے کھربویں حصہ کے سویں حصہ ہی تک باقی رکھ سکتی ہے"۔

دیکھا آپ نے کہ ایک طرف کرۂ ارض اور اس کی موجودات سے لے کر ان گنت انتھاہ اجرام سماوی سحابوں کہکشانوں، پھر ان کے کروروں شمسی نظاموں کی انسانی ذہن و تصور کو چکرا دینے والی مہیب و مدہوش جسمانیت یا مادیت ہے، اور دوسری طرف اس مادہ کی بنیادی حقیقت کی حقیقت بال کے دس لاکھویں حصہ کی ہے اور پھر اس حصہ کی بھی مزید اجزائے ترکیبی الکٹرانوں وغیرہ کی مقدار (MASS) یا مادیت کی حقیقت ایکے مقابلہ میں بھی اٹھارہ سو پینتالیسویں حصہ کی نکلی۔ پھر اس کی حقیقت بھی جسم و جسمانیت سے آزاد برقی شعاعوں یا برق کی منفی مثبت پاروں (NEGATIVE POSITIVE CHARGE) کی رہ گئی۔ باقی خود برق یا بجلی کی حقیقت کیا ہے؟

---

[1] پروٹان $\frac{1}{10^{13}}$ دریافت ہوئی ہے۔ کی جسمانیت ہائیدروجن کے سا (MOL CULE) $\frac{1}{10^{-8}}$ CM کی $\frac{1}{100000}$ (تقریباً)

یہ ابھی تک سائنس کو بھی معلوم نہیں اور جو کچھ معلوم ہوگی اس کی حقیقت بھی کیا معلوم کہ معلوم ہوگی،
مادہ کی مادیت کی یہ سائنسی طلسم ہوش ربا یا اس کے ذرات بجائے خود ہمارے ذہن کے لئے خواہ
کتنے ہی ناقابل تصور حد تک چھوٹے سے چھوٹے ہوں تاہم یہ بات قابل تصور ہی تھی کہ یہ جمع ہو کر
ناقابل تصور حد تک بڑے سے بڑے ایسے اجسام کی ایسی صورت اختیار کر لے سکتے ہیں، جن کی
تعمیر و تشکیل بالکلیہ ان مادی ذرات ہی سے ہوئی ہو۔ اور اس بنا پر ان کو، بجا طور پر بالکلیہ مادی ہی
مادی سمجھا جائے جیسا کہ اوپر ہی معلوم ہو چکا کہ مثلاً ایک انچ طویل خط کو بنانے کے لئے چالیس کروڑ
ایٹم درکار ہوں گے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ اوپر ہی آپ یہ بھی پڑھ آئے کہ مثلاً آپ کے ۵، ۶ فٹ لمبے جسمانی
ڈیل ڈول کے ان مادی ذرات کو دبا کر آپس میں اگر اتنا ملا دیا جائے کہ درمیان میں کوئی فاصلہ یا
خلا قطعاً نہ رہ جائے تو اس کی حیثیت بس ایک ایسے حقیر دھبہ کی سی رہ جائے گی جس کا دیکھنا
بھی دشوار ہوگا۔"

ایک اور مثال ایڈنگٹن جیسے مسلم و مشہور ماہر سائنس نے میٹر کی دی ہے کہ یہ اپنی سائنسی
حقیقت کی رو سے بہت زیادہ خلا ہی خلا ( EMPTINESS ) ہے جس میں منتشر طور پر
پھیلے ہوئے بے شمار برقی رو والے ذرات ( ELECTRIC CHARGES ) نہایت
تیز رفتار سے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں لیکن ان سب کی مجموعی جسامت (ہمارے محسوس
میٹر کی جسامت کے دس کھربویں حصہ سے بھی کم ہے۔[1]

غرض اجرام سماوی یا ستاروں، کہکشانوں، سحابوں وغیرہ اربوں کھربوں میل کا طول و عرض

---

[1] مقدمہ ( SIR ARTHUR EDDINGTON—"NATURE OF THE /orld" )
PHYSICAL WORLD" )
صہ ۱۲

رکھنے والے آسمانی اجسام کا ذکر ہی کیا، خود زمین پر آنکھوں دیکھے سیکڑوں ہزاروں میل لمبے چوڑے سمندروں اور ہمالیہ جیسے پہاڑوں کے اجسام یا ان کی جسمانیت کو مادی یا مادہ کا کارنامہ جاننا خود سائنس کی بتائی ہوئی مادہ کی مسلمہ حقیقت کی رو سے آنکھوں دیکھا ہمایانی جھوٹ ہی جھوٹ نکلا تو پھر جاندار اجسام کی زندگی اور زندگی سے بھی بڑھ کر انسانی اجسام کے فکری و شعوری اعمال وافعال کو اس مادہ سے دور دور کی بھی کیا نسبت ہو سکتی ہے جس کی نسبت ابھی ابھی سائنس ہی کی کتاب میں پڑھ چکے کہ سائنسی مادہ کے جو ذرات انسان کے جسم میں پائے جاتے ہیں ان کے درمیان سے اس جگہ یا مکان (SPACE) کو بالکلیہ خارج کر دیا جا سکے، تو نہ ہماری ہڈیوں اور ان پر چڑھے ہوئے گوشت کا کوئی پتہ ہوگا اور نہ عضلات و اعصاب کا اور نہ اس "سر پر غرور" کا جس کی کرامت سائنس و فلسفہ علوم و فنون تمدن و تہذیب کے سارے انسانی مفاخر باور کئے جاتے ہیں، بلکہ ان سب کے بجائے سائنس جس کو مادہ کہتی ہے، اس کا صرف ایک مٹا مٹا سا نشان رہ جائے گا۔

یعنی چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے جاندار و بے جان مرئی و محسوس اجسام کی جسمانیت اور ان کی زندگی و شعور وغیرہ تک کی ساری سرگرمیاں مادہ کے ذرات کی نہیں بلکہ ان سے اربوں، کھربوں گنا زیادہ ان کے درمیان میں پائی جانے والی غیر مادی خلا یا مکانی وسعت اور پھیلاؤ کی رہین منت ہے، اس لئے اصل مسئلہ اب خود خلاء و مکان کی حقیقت و نوعیت کا ہے۔

لیکن پہلے ذرا ایک بات سنتے یا پھر دہراتے چلیں کہ مادہ یا مادی کائنات کے تصور میں یہ انقلابی بھونچال دراصل لاشعاعوں یا عکس ریز (X-RAYS) کی دریافت سے آیا۔

"یہ لاشعاعیں ہیں کیا؟ یہ مادہ کی کوئی صورت نہیں۔ نہ یہ مادی ذرات ہیں، بلکہ تابکاری ( RADIATION ) کی ایک صورت یا قسم ہیں۔ یا روشنی کی ایک ایسی نئی قسم جو نفوذ کی غیر معمولی قوت رکھتی ہے۔ یہ برقی لہروں پر مشتمل اور اپنی نوعیت میں ہماری معمولی روشنی ہی ہوتی ہے۔"[1]

سب سے پہلے یہ معلوم ہوا کہ ریڈیم اور یورینیم جیسی دھاتوں سے تین قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں، جن کو الفا بیٹا اور گاما شعاعوں کا نام دیا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ و اہم بیٹا ( BETA ) شعاعیں ہیں ان ہی کا نام آگے چل کر الکٹران ہوا...... اور ان کو مختلف طریقوں سے سالمہ یا ایٹم سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ پوری کائنات میں جہاں کہیں بھی جس قسم کے بھی مادہ کا کوئی سالمہ پایا جاتا ہے وہ الکٹران یا منفی برق کی وحدات سے بنا ہوتا ہے، جس کا مرکزہ (نیوکلیس ( NUCLEUS ) برق کی مثبت وحدات پروٹان اور غیر برقی ذرات نیوٹران پر مشتمل ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مادہ یا مادی ایٹموں کی "سالمیت" یا ان کے ٹھوس ناقابلِ تقسیم و ناقابلِ فنا ہونے کا خود سائنسی مسلمہ و یقین فنا و مردہ ہو چکا ہے۔ اور سارا مادہ یا اس کے مادی سالمات (ایٹم) منفی و مثبت برقی پاروں ( CHARGES ) میں تحلیل پا کر مادہ بالآخر برق ہی برق کے سوا کچھ نہ رہا، اس طرح آپ نے دیکھا کہ انسان کی غیب پسند و غیب طلب انسانی فطرت بلکہ عین انسانیت ہماری محسوس و مرئی یا آنکھوں دیکھی ساری مادی و جسمانی کائنات کو خود سائنس ہی اپنی تحقیق اور انکشافی راہوں سے سراسر فریب نظر بنا کر رہی، یعنی جو کچھ ہم کو محسوس ہوتا یا دکھائی دیتا ہے، وہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے، اور سچ وہ ہے جو غیب میں ہے یا حواس اور

---

[1] ص ۲۲ حصہ چہارم۔

آنکھوں سے چھپا ہوا ہے اور دکھائی نہیں دیتا اس سے بڑھ کر یہ کہ جو کچھ دکھائی نہیں دیتا وہ ہماری دکھائی دینے والی جسمانی و مادی دنیا سے اپنی حقیقت و نوعیت میں اتنا مختلف ہے کہ اس کو مادہ کے بجائے سرے سے غیر مادی (IMMATERIAL) توانائی و تابکاری وغیرہ کا نام دینا پڑتا ہے۔ کچھ اور سن لیں:۔

"آج کل سائنس دان بار بار جو یہ دہراتے ہیں کہ موجودات یا اشیاء دراصل وہ نہیں جو ہمارے حواس سے محسوس ہوتی ہیں، ہم کو مادہ کے ٹھوس جوہر ہونے کا عامیانہ خیال اپنے ذہن سے نکال دینا چاہیئے...... مادی دنیا انتہائی تحلیل کے بعد غیر مادی ثابت ہو چکی ہے۔ موجودہ سائنس میں مادہ کی جوہریت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ یہ کوئی نظریہ نہیں سائنس کا مسلمہ بن چکا ہے...... معمولی عقل و فہم نے مادہ اور زمان و مکان سے کائنات کا جو نقشہ بنایا تھا وہ سارا کا سارا سائنس نے منسوخ اور قلم زد کر دیا ہے لیکن اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ظواہر کی تحلیل نے زیادہ عمیق حقائق کو بے نقاب کر دیا ہے"[1]

## چیستاں در چیستاں

مادہ و مادیت کی یہ چیستاں ابھی ختم نہیں ہوتی۔ ایک لحاظ سے مادہ یا مادی و جسمانی موجودات سے بھی بڑھ کر ہمارے لئے یقینی بلکہ بدیہی وجود جگہ اور وقت یا مکان و زمان کا تھا اس لئے کسی جسم یا جسمانی چیز کے موجود ہونے کا ہم اس کے بغیر کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کسی نہ کسی جگہ اور وقت میں پائی جاتی ہو، جو چیز نہ کسی جگہ ہو نہ کسی وقت، وہ موجود کیا سرے سے معدوم ہی ہوگی۔ انسان تو انسان زمان و مکان کا وجود حیوان تک کے لئے اتنا بدیہی و وجدانی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کھانے کے وقت دو چار مرتبہ کوئی کتا آ کھڑا ہو جب اس کے آگے روٹی یا ہڈی کا کوئی ٹکڑا ڈال دو، تو وہ پھر روز ہی اسی وقت اسی جگہ آ کھڑا

---

[1] ص ۱۶ حصہ اول۔

ہوگا۔ بلکہ فکر و فلسفہ والی ایک جماعت دہریوں کے نزدیک تو "دہر یا زمانہ" موجود کیا سارے موجودات کا خالق و خدا ہی جانا جاتا تھا۔

لیکن فکری و فلسفیانہ چیستانوں میں پڑے بغیر ذرا اپنی سیدھی سادی معمولی سمجھ سے سوچ کر دیکھو کہ ایسی جگہ اور وقت یا مکان و زمان جو نہ خود مادہ یا توانائی ہو نہ اس میں مادی و غیر مادی یا تابکاری و توانائی کوئی شئے سرے سے پائی جاتی ہو۔ تو اس کو بجائے خود مستقل بالذات کسی معنی میں سرے سے موجود بھی تصور کر سکتے ہو۔ یعنی ایسا زمان و مکان جو نہ بذات خود مادہ یا توانائی ہو نہ اس کے اندر مادہ یا توانائی نام کی دوسری کوئی خارجی شئ پائی جاتی ہو تو خود اس کے پائے جانے کے کیا معنی رہ جاتے ہیں۔ یا اس کے وجود و عدم میں کیا فرق تمہارا ذہن کر سکتا ہے؟

زمان و مکان کے متعلق عہد حاضر کے سب سے نامور عالم سائنس آئنسٹائن کے شہرۂ آفاق نظریۂ اضافیت کا کماحقہ سمجھنا سمجھانا تو کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ ریاضیات جاننے والوں ہی کے بس کی بات ہے[1] تاہم اس کے عمومی نتائج کا جو بیان و اندازہ کیا کرایا جاتا ہے، اس کی رو سے نہ صرف مادہ ہی کی طرح زمان و مکان کے ہمارے عام و عالمگیر پرانے تصورات کا خاتمہ ہو چکا، بلکہ ان دونوں کے ایک دوسرے سے الگ الگ مستقل بالذات وجود کا بھی کوئی وجود نہیں رہ گیا حتیٰ کہ ان کی وحدت کے درمیان اب حرف عطف کے فصل تک کی گنجائش نہیں رہی۔ "زمان و مکان" کہنے کے بجائے دونوں کو ایک خط فاصل کے ساتھ ملا کر "زمان۔ مکان" کہا جانے لگا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نام نہاد مادہ کا بھی اس "زمان و مکان" سے جداگانہ کوئی وجود نہیں رہا تینوں بلکہ

---

[1] رفیق قدیم ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی حیدرآبادی (دکن) سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی وحال وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی (پاکستان) جو اعلیٰ ریاضیات اور آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت کے خصوصی عالم ہیں، میں نے جب ان سے اس کو سمجھنا چاہا تھا تو بس یہی جواب ملا تھا۔

توانائی وانرجی سمیت چاروں بالکلیہ ایک ہی ثابت ہو کر رہے، یعنی یہ جو ہم ایک چشم دید واقعہ کے طور پر جانتے تھے کہ مختلف قسم کی مادی یا جسمانی چیزیں جو مختلف جگہوں، وقتوں یا مقاموں اور زمانوں میں اس طرح پائی جاتی ہیں کہ یہ چیزیں زمان و مکان سے اپنا جداگانہ وجود رکھتی ہیں اور خود زمانہ اور جگہ بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ چیزیں ہیں، یہ سب سراسر غلط ہی غلط اور دھوکا ہی دھوکا ہے اور نفس الامری حقیقت یہ ہے کہ زمان و مکان اور اس میں پائی جانے والی چیزیں سب بالکل ایک ہی یا باہم پیوستہ (INTERWOVEN) وجود ہیں۔ جسم اور جسمانیات بلکہ خود جگہ یا مکان جو ہماری انسانی سمجھ کی رو سے نہیں، بلکہ ہزاروں سال کی طبعیات و ریاضیات اور فلسفہ سب ہی کی رو سے اپنے پھیلاؤ یا بعد یا امتداد کے صرف تین رُخ رکھتے تھے، لمبائی، چوڑائی گہرائی یا طول و عرض اور عمق۔ آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت نے زمانہ کو بھی مکان ہی کا چوتھا بُعد ثابت کر دکھایا اور ہماری دنیا سہ ابعادی (THREE DIMENSIONAL) کے بجائے دراصل چار ابعادی ہے۔ مثلاً یہ قلم جس سے میں لکھ رہا ہوں، اس میں صرف لمبان چوڑان اور گہراؤ ہی نہیں پایا جاتا، بلکہ جس کو ہم "وقت و زمانہ" کی حیثیت سے ان تینوں سے مختلف جداگانہ شئی جانتے ہیں وہ بھی طول و عرض اور عمق کی طرح ان ہی کے ساتھ پایا جانے والا محض ان کا چوتھا بُعد ہے۔

معمولی انسانی عقل و فہم اور ادراکات و احساسات سب کے سراسر خلاف خود ہماری سامنے کی اس دنیا یا عالم شہادت کے ان غیبوں کے متعلق وہی غالب کی زبان میں بار بار اس کے سوا کیا کہا جائے کہ "ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود"

آگے ذرا ان نہ سمجھ میں آنے والے غیبوں کو خود آج کی بیسویں صدی کے سائنس دانوں کی زبان سے خوب اچھی طرح کان لگا کر سن لیں کہ اس صدی کی نہ

"سائنس نے اس کو پوری طرح واضح وثابت کر دیا ہے کہ اس عالم شہادت یا ظاہر کے باطن یا تہ میں پائی جانے والے (غیبی) حقیقت اس سے بالکل ہی مختلف ہے، جیسی ہم اب تک سمجھتے چلے آ رہے تھے۔ جن چیزوں کو ہم حقیقی خیال کرتے تھے۔ وہ محض انسانی ذہن کی ساختہ پرداختہ نکلیں۔ جس حقیقت کو ہم زمان (TIME) اور مکان (SPACE) سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ایک ایسی ناقابل تصور کوئی شئی ہے جس کو صرف عالم ریاضیات ہی بیان کر سکتا ہے[1]"

آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت سے قبل سمجھا جاتا تھا کہ:۔

"زمان ومکان گویا ایک ڈھانچہ یا قالب ہے جس کے اندر یہ ازلی وابدی کائنات واقع ہے۔ لیکن اضافیت کے نظریہ کی رو سے کسی ایسی چیز کا جس کو مطلق اور مستقل بالذات زمان ومکان کہا جا سکے سرے سے کوئی وجود نہیں۔ رہا ہمارے روزمرہ کے زمان ومکان کا تصور تو وہ ہمارے انفرادی تجربہ سے ماخوذ یعنی ایک طرح کا بس مقامی زمان ومکان ہے۔"

"ہم سمجھتے تھے کہ دو چیزوں کے درمیان کا فاصلہ یا دو واقعات کے درمیان کا زمانہ کوئی محدود ومتعین شئی ہے یہ خیال بھی غلط نکلا۔

اور نظریۂ اضافیت کی بنا پر زمان ومکان کا یہ ڈھانچہ غائب ہو کر سہ ابعادی دنیا کی جگہ چار ابعادی دنیا لے لیتی ہے۔ یہ چوتھا بُعد زمان ہے۔ زمان ومکان مستقل ومطلق حقیقتوں کی حیثیت سے کوئی وجود نہیں رکھتے..... بلکہ دونوں ایک ہی متحد اور غیر منفک حقیقت ہیں۔ جس کو "زمان مکان" کہنا چاہیئے، اور اب تو آئنسٹائن کے نظریہ کے

---

[1] ماڈرن بلیف حصہ ۴، ص ۲۷"

مطابق) زمان و مکان کے مستقل بالذات وجود کو ثابت کرنے کے لئے جتنے اختبارات کئے گئے سب ناکام ثابت ہوئے نہ سائنس کو اپنی تحقیقات کے لئے مستقل و مطلق زمان و مکان کا وجود فرض کرنے کی کوئی ضرورت رہی ہے۔

یہ مطلب نہیں کہ زمان و مکان کے ہمارے روزمرہ کے تصورات کا خاتمہ کر دیا گیا وہ بدستور انفرادی تجربہ کے ڈھانچہ یا مقامی زمان و مکان کی حیثیت سے اپنی جگہ قائم ہیں۔ کائنات فطرت (نیچر) کے لئے وہ بجائے خود کتنے ہی بے معنیٰ ہوں لیکن ہمارے لئے اب بھی وہ بامعنیٰ ہیں[1]...... تاہم اگر مادہ وہ مادہ نہیں رہا جو ہم معمولی عقل و فہم سے سمجھا کرتے تھے، تو زمان و مکان اس سے بھی بہت کم وہ زمان و مکان باقی رہ گئے جو ہم اس سے پہلے سمجھا کرتے تھے"

آج بیسویں صدی کی جدید سائنس میں عام آدمی کے لئے سب سے دشوار بلکہ ناممکن اضافیت ہی کے نظریہ کو سمجھنا ہے، اعلیٰ ریاضیات میں پوری مہارت رکھنے والا ذہن ہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس نظریہ کی رو سے ہمارے عام تصور والے۔

"نہ مطلق زمان کا کوئی وجود رہ گیا ہے، نہ مکان کا۔ مستقل بالذات یا بجائے خود موجود، نہ زمان پایا جاتا ہے نہ مکان۔ پھر یہ غیر مستقل زمان بھی نہ مکان کے بغیر پایا جا سکتا ہے، نہ مکان زمان کے بغیر۔ دونوں قطعاً لا ینفصال ہیں۔ دونوں بالکلیہ ہم وجود اور ایک دوسرے پر موقوف ہیں۔ ان ہی سے وہ دنیا بنتی ہے جس کو چار ابعادی زمان مکان سلسلہ[2] (SPACE-TIME CONTINUUM) کہتے ہیں۔

---

[1] ایضاً ص ۹۵ ، ۹۶ [2] تسلسل کے بجائے کتاب ہذا کے فاضل مقدمہ نگار "سلسلہ" جو استعمال یا تجویز فرمایا ہے اصطلاح بننے کی شان اس میں زیادہ ہے۔

یہ خالصۃً ایک ریاضیاتی تصور یا نظریہ ہے، اور ریاضیاتی نظریوں کے لئے کوئی طبعی مظروف یا مشمول (CONTENT) نہیں پیش کیا جا سکتا اضافیت ریاضیاتی علامتوں (SYMBOLS) میں جو کچھ بیان کرتی ہے ہمارا تخیلہ اس کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتا۔[۱]

اور جب یہ معلوم ہو چکا کہ ریاضیاتی سائنس صرف علامتوں کی زبان میں گفتگو کر سکتی ہے تو پھر ہم کو یہ کیسے بتلا سکتی ہے کہ وہ غیر مرئی نا قابل فہم و گرفت (ELUSIVE) حقائق بجائے خود کیا ہیں، جو ہماری تحقیق و تعبیر کا موضوع بنے ہوتے ہیں۔ اس طرح محسوس و مرئی (یا مادی) کائنات کی نسبت ہمارے خیالات میں جو بھونچال آیا ہے، وہ ہمارے معمولی خیالات کو نہ صرف درہم برہم کر ڈالتا ہے بلکہ ذہن کو یہ باتیں بالکل مہمل نظر آتی ہیں۔

"کہا یہ جاتا ہے کہ زمان۔ مکان، سلسلہ" (جس کا نام رکھا گیا) ساری زمین و آسمان کی چیزیں اس میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ یہ زمان و مکان" ایک فعال کارگذار[۲] (ACTIVE PERFORMER) ہے علمائے ریاضیات کے نزدیک یہ زمان مکان، سلسلہ ہی وہ خمیر (STUFF) ہے جس سے تمام موجودات بنے ہیں...... ان برقی ذرات کا آخری سرچشمہ بھی یہی "زمان، مکان"...... ہو سکتا ہے، جن کو ہم الکٹران پروٹان کہتے ہیں، یہی پوری کائنات کی اساس و ابتدائی اصل و بنیاد ہے..... اور ریاضیاتی طبیعات کی مزید تحقیقات کا جدھر رخ ہے، اس کی رو سے زمان و مکان اور مادہ سب کے ایک ہی غیر منفک و نا قابل انفصال وحدت قرار پا جائیگا

---

[۱] ایضاً ص۱۱۵ [۲] "الدہر ہو اللہ" کی معنویت کی طرف ایک اشارہ۔ گو ظاہر ہے کہ اس "ہو اللہ" یا "الدہر" کی حقیقت بھی بجائے خود غیب ہے، اور انسان کیلئے ایمان بالغیب کے کسی طرح اس ناسوتی عالم میں بھی چھٹکارا نہیں۔

امکان ہے جو بڑی ترقی ہوگی۔ زمان و مکان کو تو نظریۂ اضافیت نے ناقابل تحلیل طور پر ایک کر ہی دیا ہے۔ نیز اس کی رو سے انرجی اور ماس (مادہ) بھی اصلاً متحد یا ایک ہی ہیں۔ دراصل "زمان۔ مکان" خود مادہ کا ایک تعمیری (CONSTRUCTIVE) جز ہے اور خلا یا خلائی کائنات کا لفظ ایسا ہی بے معنی جیسے بے شہریوں کی ریاست یا بغیر پیروؤں کا مذہب[1]"

"زمان و مکان اور مادہ سب کے ایک ہی غیر منفک و ناقابل انفصال وحدت قرار پا جانیکا کا امکان جو بڑی ترقی سمجھی گئی تھی معلوم ہوا کہ یہ ترقی اب واقعہ بن چکی ہے۔۔

"۱۹۱۵ء میں آئنسٹائن کی اضافیت کے عمومی (جنرل) نظریہ نے اس پرانے خیال کا خاتمہ کر دیا کہ مکان SPACE کسی یکساں سپاٹ (CHARACTERLESS UNIFORM) خلا VACUUM) کا نام ہے۔ اور ثابت یہ ہوا کہ اس مکان میں مسلسل نقطہ بہ نقطہ بدلتی ہوئی خمیدگی (CURVATURE VARYING FROM FOINT TO POINT) پائی جاتی ہے!....... نہ یہ آئنسٹائن والا مکان وہ اسٹیج رہا جس پر طبعیات (فزکس) کا ڈراما کھیلا جاتا ہے، بلکہ یہ خود ڈراما کھیلنے والوں میں ہے[2]"

ہماری کائنات کی تعمیر و تشکیل میں مادہ اور توانائی (انرجی) یا تابکاری (ریڈی ایشن) (RADIATION) جن دو چیزوں کا نام لیا جاتا ہے یہ دونوں "مکان۔ زمان" نام تسلسل کی خمیدگیوں، شکنوں یا ناہمواریوں اور جھریوں کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ مکان اور اس کی ان جھریوں یا سلوٹوں کی کچھ نوعیت و تفصیل صف اول کے ایک بڑے نامور سائنسداں

---

[1] ایضاً [2] دیکھو وہٹاکر (WHITTAKER) ان۔اواس کی کتاب "مکان و زمان" ص ۱۰۲

سر جیمس جینز (Sir James Jeans) کی زبانی ایک مثال سے سنو:۔

"خلاصہ یہ کہ نظریۂ اضافیت نے ہمارے لئے جس کائنات کا انکشاف کیا ہے،

اس کی سادہ و مانوس بہترین مثال غالباً صابن کے ایسے بلبلہ (SOAP BUBBLES)

ہی کی ہے جس کی سطح ناہمواریوں (IRREGULARITIES) اور سلوٹوں

(CORROGATION) سے بھری ہوئی ہے۔ کائنات اس بلبلہ کا اندرونی حصہ

نہیں بلکہ اس کی سطح ہے۔

اور ہم کو یہ بات برابر یاد رکھنی چاہئے کہ صابن کے بلبلہ کی سطح میں جبکہ صرف دو بعد

(DIMENSIONS) ہوتے ہیں کائنات کے بلبلہ کی سطح میں چار بعد پائے

جاتے ہیں تین مکان (SPACE) کے اور ایک زمان (TIME) کا۔

اور وہ جوہر (SUBSTANCE) جس سے یہ حباب یا بلبلہ پھول کر بنا ہے

(Is blown up) یعنی صابن کی جھلی (soap films) وہ

خالی مکان (EMPTY SPACE) ہے جو خالی زمان (EMPTY TIME)

سے جڑا ہوا ہے[1] (WELDED UP)۔

"خلائے محض" (EMPTINESS) سے ابھرنے والے اس بلبلہ کی سطح

جن ناہمواریوں، جھریوں، سلوٹوں یا شکنوں سے بھری ہے ان ہی کی دو قسموں

میں سے ایک کو تابکاری اور دوسری کو مادہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور ان ہی دو کو

ہماری پوری کائنات کے تعمیری اجزا سمجھا جاتا ہے"[2]

---

[1] مشہور کتاب "پراسرار کائنات" ('The mysterious Universe') ص ۱۲۹

[2] ایضاً ص ۱۴۱

ایک چند سال پہلے (۱۹۶۱ء) کی چھپی ہوئی کتاب[1] سے سمجھے بے سمجھے کچھ اور سن لیں:۔

"زمان و مکان، مادہ و حرکت توانائی (انرجی) اور علیت سب کے گئی صدی تک کے پرانے تصورات کی عہد حاضر میں بنیادی طور پر کایا پلٹ ہو چکی ہے۔ گرچہ الفاظ پرانے ہی استعمال ہوتے ہیں لیکن معنیٰ و مطلب بالکل بدل گئے ہیں۔ موجودہ طبعیات (فزکس) کے مادہ اور پرانے روایتی مادی جوہر (SUBSTANCE) میں مشکل ہی سے کوئی مشابہت باقی رہ گئی ہے۔

"قدیم طبعیات میں مکان کو ایک سہ ابعادی ہم جنس (HOMOGENEOUS) ظرف خیال کیا جاتا تھا جو اپنے طبعی مظروفات سے بالکل جداگانہ مستقل بالذات خود اپنا وجود رکھتا تھا۔ ساکن یا غیر متحرک تھا۔ اپنے پھیلاؤ یا وسعت میں غیر متناہی بھی تھا۔ اور نامتناہی حد تک قابلِ تقسیم و تجزی بھی۔ اب عمومی نظریۂ اضافیت کی روشنی میں مکان کے ان سارے خواص کو خیرباد کہہ دینا پڑا ہے۔ نہ یہ ہم جنس یا متجانس رہا ہے نہ جامد و ساکن، نہ اپنے مظروفات سے جداگانہ موجود بلکہ اس کی نامتناہیت (گو نامحدودیت کا نہیں) کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔"

اور سنئے:۔

"اضافیت کے عمومی نظریہ میں خلا و ملا (THE FULL AND EMPTY) کے فرق و امتیاز کا بھی شدت سے انکار کیا گیا ہے...... حالانکہ اس امتیاز پر جوہر فرد یا ذرہ (CORPUSCLE) کے روایتی تصور کی بنیاد تھی...... اس امتیاز کے بغیر کسی ذرہ کا نام لینا ہی بے معنیٰ ہو جاتا ہے۔ بلکہ کوئی ایسی متعین حدود

---

[1] (Philosophical Impact — Contemporary Physics) مقدمہ ص۱۱

ہی نہیں رہ جاتیں جو ذرہ کو اپنے آس پاس کی خلا سے جدا کرتی ہوں، بلکہ ہم کو یہ تک کہنے کا حق نہیں رہ جاتا کہ مادہ کسی جگہ میں (MATTER IN SPACE) ہے جبکہ مادہ جگہ مکان یا صحیح معنیٰ میں "زمان۔ مکان" کی مقامی ناہمواریوں میں تحلیل پا چکا" صـ۲۸۸ اور لیجیے، جن کو کبھی مادہ کے ٹھوس ذرات سمجھا جاتا تھا:۔

"ان میں سے بعض ذرات ایسا دفعتہً غائب ہو جانے والا ٹھہراؤ (DURATION) رکھتے ہیں کہ ان کیلئے ذرات کا لفظ استعمال کرنا بھی قطعاً گمراہ کن ہے کیونکہ یہ لفظ ناقابل تحلیل طور پر سختی و پائداری کے معنیٰ سے وابستہ ہے۔ اسلئے ان ذرات کو ذرات کے بجائے وقوعات (EVENTS) یا زیادہ سے "وقوعاتی ذرات" (EVENT PARTICLES) کہنا درست ہوگا جیسا کہ وہائٹ ہیڈ نے تجویز کیا ہے۔"

پھر:۔

"اس خورد بینی ذرہ کا نہ صرف یہ کہ دو مرتبہ مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ شروڈنگر[51] نے زور دیا ہے، بلکہ ایک مرتبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ ہیزنبرگ[52] کے اصول...... سے ثابت ہوتا ہے...... تو پھر اب ذرہ کے پرانے تصور میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے جبکہ اسکے صورت گر صفات و خواص...... تک ایک ساتھ نہیں پائے جا سکتے۔"

"مادہ کے تصور میں ایسی بنیادی تبدیلیوں کا حرکت کے پرانے تصور پر بھی بڑا اثر پڑا ہے، حرکت کا پرانا مفہوم جو ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال یا ہٹنے کا نام تھا وہ صرف اس لئے ممکن تھا کہ مادہ کا کوئی ٹکڑا زمانہ میں (یا زمانی طور پر) مستقلاً قائم رہ کر (persisting through time) اپنے کو ایک وضع یا مقام سے اسلئے

---

۵۱ Schrodinger    ۵۲ (Heisenberg)

الگ کر سکتا تھا کہ جس وضع یا مقام میں وہ پہلے تھا اس سے حرکت کر کے دوسرے مقامات یا اوضاع اختیار کرلے۔ لیکن اگر مادہ کا کوئی ذرہ خود زمان۔ مکان" ہی کا ایک خاص زیادہ پیچیدہ حصہ ہے، تو پھر وہ اپنے کسی ایسی چیز سے کیسے الگ یا جدا کر سکتا ہے جس سے کہنا چاہیئے کہ اس کی عین ذات بنی ہے" صفحہ ۳۸۹

ہوتا یہ ہے کہ:۔

"جب ہم کسی مادی جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے دیکھتے ہیں، تو فی الواقع وہ کسی جوہری ذات (ENTITY) کا ایک جگہ سے دوسری جگہ انتقال نہیں ہوتا بلکہ مقامی شکن یا خمیدگی (LOCAL CURVATURE) ایک جگہ سے غائب ہو کر اپنے مستقل یا قریبی حصہ میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

باقی:۔

"یہ خود ہماری آنکھ کے دیدہ کی حرکت کا تسلسل ہوتا ہے جو بعینہ ایک ہی شئی کے مکان میں گذرنے (یا جگہ بدلنے) کا التباس پیدا کر دیتا ہے"۔

غرض یہی نہیں کہ آج کی سائنس یا طبیعیات (فزکس) کے مادہ اور پرانے روائتی مادی جوہر میں بس نام کے اشتراک کے سوا مشکل ہی سے کوئی دوسری چیز مشترک یا مشابہت کی باقی رہ گئی ہے بلکہ اب مادہ کی حقیقت اگر صرف" مکان۔ زمان" کی شکنوں یا جھریوں کی رہ گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مادہ کا خود اپنا ذاتی یا مستقل وجود ہی سرے سے کوئی نہیں رہ گیا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی کپڑے کی شکنوں کا اپنا وجود کپڑے کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لہذا اصل سوال اب نظریۂ اضافیت والے" مکان۔ زمان" کی حقیقت و نوعیت کا ہے جس کا ان سطروں کی تحریر تک کوئی قابل فہم واضح جواب نہ کسی کتاب سے ملا ہے نہ یونیورسٹیوں وغیرہ

کے جن اساتذہ و ماہرین تک رسائی ہو سکی ان سے یہ عقدہ کھلا۔

اوپر غیب کی جو دو قسمیں کی گئی تھیں ایک حقیقی اور ایک اضافی یعنی ایک زمین و آسمانی پوری کائنات کا غیب بہ حیثیت مجموعی۔ دوسرے اس محسوس یا نامحسوس سائنسی کائنات شہادت کے اندرونی موجودات کے باہمی غیوب۔ مذکورۂ بالا جستہ جستہ سمجھے بے سمجھے اقتباسات سے جو کچھ ملا یا سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ جس کو ہم مادی عالم شہادت یا روزمرہ کے مشاہدات یا سائنسی تجربات کا عالم جانتے ہیں، وہ عصری سائنس کی راہ سے بجائے خود غیب ہی غیب بنتا چلا جارہا ہے اس سلسلہ میں مادہ کی مادیت کے قلعہ کے ایک اور بڑے شگاف کو ذرا اور دیکھتے چلیں۔

## مادیت کے قلعہ کا ایک اور بڑا شگاف

ہمارے اس عالم شہادت یا نام نہاد عالم مادی کے غیبوں میں آج کی سائنس الکٹران پروٹان وغیرہ جن مادی ذرات تک رسائی پا سکی ہے ان کے اندر چھپا ہوا ایک اور ایسا غیب سامنے آیا ہے جس نے مادہ کی مادیت کے ساتھ اس کی علیت یا علت و معلول کے اٹل دھوبی قانون کے قلعہ کو بھی کہنا چاہیے کہ مسمار ہی کر چھوڑا ہے۔ بے علم و ارادہ ٹھوس ٹھس، اندھے بہرے مادہ کو زمین سے آسمان تک اور جمادات و حیوانات سے انسان تک ساری مخلوقات و موجودات کے خلق و وجود کا مبدء و ماخذ ماننے کا لازمی نتیجہ علت و معلول کے اندھے بہرے اٹل قوانین کو بھی قبول کر لینا ہی تھا۔ اس بنا پر پہلے پہل یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ایٹم کے اندر جو الکٹران وغیرہ دریافت ہوئے ہیں وہ بھی بندھے ٹکے علت و معلول کے ضابطہ و طریقہ ہی کے مطابق حرکت و عمل کرتے ہوں گے لیکن آگے چل کر جو کچھ معلوم ہوا اس سے ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور ماہرین کو پتہ چلا کہ ابھی اور غیبی اسرار پوشیدہ ہیں۔[1]

---

[1] ماڈرن بلیف ("Modern Belief") حصہ چہارم ص ۲۳

"ابھی تک مادی دنیا میں علت و معلول کا قانون نہایت سختی سے کارفرما سمجھا جاتا تھا اور سارے طبعی واقعات و حوادث بالکلیہ علیت کے جبری قوانین پر مبنی یقین کئے جاتے تھے علل و معلولات کے سلسلہ میں کہیں کوئی خلل و رخنہ نہیں سمجھا جاتا تھا.... لیکن ۱۹۲۷ء میں اس خیال کو سخت دھکا لگا اور ماہرین طبعیات نے دیکھا کہ قطعی و کلی علیت کو مادی دنیا سے خیرباد کہنا پڑا"

اور اس حد تک خیرباد کہہ دینا پڑا کہ بعض رجالِ سائنس خصوصاً ایڈنگٹن جیسی مسلمہ سائنسی شخصیت کا زیادہ زور اس پر ہے کہ "قانون علیت ختم ہو چکا اور اب اس کو ترک ہی کر دینا چاہئے، اس لئے کہ سارے قرائن اس کے ہیں کہ اٹل علیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو چکا"[1]

اب آگے ایک اور نامی گرامی عالم سائنس سرجیمس جینز[2] ( Sir James Jeans ) کی زبانی ذرا اس کی تاریخ و تفصیل بھی ملاحظہ ہو۔

"گلیلو اور نیوٹن کی عظیم سترھویں صدی کی یہ بڑی عظیم کامیابی و فتح مان لی گئی تھی کہ کائنات میں ہر مابعد کا تغیر و تبدل یا تخلیق اپنے ماقبل کا ناگزیر نتیجہ و لازمہ ہوتا ہے حتیٰ کہ ساری کائنات فطرت (نیچر) کی پوری تاریخ آخر تک لازمی و ناگزیر نتیجہ اس مبدء یا ابتداء کا ہے جس میں یہ پہلے دن تھی۔

اس تصور ہی کا لازمہ وہ تحریک تھی جس نے ساری مادی کائنات کو بس ایک مشین بنا اور سمجھ لیا تھا۔ یہ صورت حال انیسویں صدی کے آخر تک مسلم اور جاری رہی اور ساری نیچرل سائنس کا واحد مقصد اس کائنات کو مشینی ساخت (میکانکس) میں

---

[1] ماڈرن بلیف ( "Modern Belief" ) ص ۲۸۶

[2] دیکھو اس کی مشہور کتاب "پر اسرار کائنات" ( Mysterious Universe ) ص ۲۷، ۲۸، ۲۹

تبدیل و تحویل کر دینا بن گیا۔"

"اس طرح قانون علت و معلول کی ہر توسیع اور میکانکی تعبیر کی ہر کامیابی نے ارادہ کی آزادی یا اختیار (FREEWILL) کو اور زیادہ دشوار بنا دیا جب پوری کی پوری کائنات فطرت ہی قانون علیت کے تابع ہے، تو زندگی یا حیات (کی کوئی صورت یا انسان) آخر اس سے مستثنیٰ کیوں؟"

مثلاً اگر ابوجہل نے ابوبکرؓ سے مختلف رویہ اختیار کیا تو وہ غریب اسکے سوا کچھ اور کر ہی نہ سکتا تھا۔ وہ مختلف خارجی محرکات کے تحت جن پر اس کو کوئی قابو و اختیار نہ تھا ایسا ہی کرنے پر بالکل بے بس تھا۔

"پھر اسی انیسویں صدی کے آخر مہینوں میں برلن کے ماکس پلانک (MAX PLANK) نے کوانٹم نظریہ کی بنیاد ڈالی، جو بالآخر ترقی کر کے جدید طبعیات (فزکس) کا ایک عظیم ہمہ گیر اصول قرار پا گیا، جس نے آگے چل کر سائنس کے میکانکی عہد کا خاتمہ کر کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔"

ابتدا میں پلانک کے نظریہ سے صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ کائنات فطرت میں تسلسل کا عمل کارفرما نہیں۔ لیکن ۱۹۱۷ء میں آئنسٹائن نے بتایا کہ پلانک کا نظریہ دراصل بہت زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے۔

"یہ اس قانون علت و معلول ہی کو اپنی فرماں روائی کے تخت سے اتار دینے والا ہے جس کو اب تک کائنات کے ایک ہمہ گیر رہنما اصول کا مقام حاصل تھا، پرانی سائنس کا یہ قطعی اعلان و دعویٰ تھا کہ فطرت (نیچر) سلسلۂ علل و معلولات کے بندھے ہوئے قوانین سے باہر ایک قدم نہیں نکال سکتی۔ علت "الف" کے بعد

ناگزیر طور پر "ب" کے معلول ہی کو پیدا یا ظاہر ہونا چاہیے"۔

اس کے بجائے:۔

"نئی سائنس اب صرف اتنا دعویٰ کر سکتی ہے کہ "الف" کے بعد "ب" "ج" وغیرہ یوں تو بے شمار امکانات ہیں، البتہ اتنا صحیح ہے کہ ان میں "الف" کے بعد "ب" کا ہونا "ج" کے مقابلہ میں اور "ج" کا "د" کے مقابلہ میں اغلب ہے"۔

غرض اس اغلبیت یا ظن غالب کے سوا کسی خاص نام نہاد علت کے بعد کسی خاص نام نہاد معلول ہی کے پیدا ہونے کا حکم نہ تو قطعیت کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے، نہ اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ بلکہ "یہ خداؤں ہی کے ہاتھ میں ہے جو بھی خدا ہوں"[1] This is a matter (which lies on the knees of gods whatever gods there be")

"بہرحال سردست تو قطعی علیت کی نئی طبیعات کے نقشہ، کائنات میں کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے لہذا پرانے میکانکی نقشہ کے بجائے اس نئے نقشے میں زندگی و شعور اور اس کے صفات ارادہ واختیار وغیرہ کی گنجائش زیادہ نکل آئی ہے"[2]۔

قانون علت کے وجوب و قطعیت یا ہمہ گیری کے تصور کا دارومدار اصل میں مادہ یا مادی اشیا کے باب میں اس تصور پر تھا کہ ہر شئی اپنی کچھ نہ کچھ ذاتی نوعیت و فطرت یا خاصیت رکھتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس خاصیت و فطرت ہی کے مطابق اس سے خاص خاص قسم کے بندھے ٹکے فطری لوازم و نتائج ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن:۔

"کوانٹم طبیعات نے اب اس طرح کی باتوں کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ مثلاً فلاں شئی (اپنی ذات و نوعیت کے اعتبار سے) ایسی اور ایسی ہے اور یہ یہ خاصیت

---

[1] ایضاً ص ۳۲ [2] ایضاً ص ۴۳

رکھتی ہے اس کے بجائے یوں کہنا پڑتا ہے کہ بس ایسی ایسی اغلبیت (یا ظن غالب) ہے[1]۔"

یعنی وہی کہ "قوانین صرف عددیاتی (STATISTICAL) ہی بنائے جا سکتے ہیں...... مثلاً کسی بڑی آبادی کی شرح پیدائش جاننے کے معنی یہ بالکل نہیں کہ فلاں خاص خاندان میں اولاد ہو گی یا نہ ہو گی ...... عددیاتی قوانین صرف بڑے بڑے مجموعوں پر صادق آتے ہیں کہ اُن کے افراد پر[2]"

دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ ان عددیاتی قوانین کی نوعیت اندھے بہرے بے علم و ارادہ نام نہاد مادہ کے طبعی و فکری افعال و خواص کے اٹل یا قطعی قوانین کی نہیں، بلکہ کچھ ایسے عمومی انتظامی قوانین کی سی ہے جو کسی ارادہ و اختیار والے مثلاً حاکم یا حکومت کے قوانین کی ہوتی ہے کہ عام طور پر یا "اغلبیت" کے ساتھ تو ان ہی پر عمل ہوتا ہے لیکن افراد کے استثنا کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔

"اگر ارادہ و اختیار پر مبنی کسی قدرت کو کارفرما مانا جائے تو اعدادی قوانین اور بھی چیستان ہی چیستان بن جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک ایٹم کے اندر آٹھ الکٹران گردش کرتے ہیں اور دوسرے کے اندر سات تو بس سے آکسیجن اور نائٹروجن کا فرق پیدا ہو جاتا ہے[3]۔"

---

[1] دیکھو آئنسٹائن اور انفلڈ (INFIELD) کی کتاب "طبیعات کا ارتقا" ("THE EVOLUTION OF PHYSICS") صہ ۲۹۲ [2] ایضاً صہ ۲۸۴

[3] سر آرتھر ایڈنگٹن (SIR ARTHUR EDDINGTON) کی کتاب (طبعی کائنات کی نوعیت) ("THE NATURE OF PHYSICAL WORLD") صہ ۲۹۱

اور اگر اشیا کی طبعی و فطری خاصیات کا قصہ ہی ختم ہو گیا تو فطرت اور فوق الفطرت (سپر نیچرل) کا فرق و امتیاز آپ سے آپ بے معنیٰ ہو جاتا ہے، اس حقیقت کو ایڈنگٹن (EDDINGTON) جیسے عظیم و مسلم سائنس داں کی زبان سے سُن لیں:۔

"سائنس کی تحقیقات سے اشیا کی کسی اندرونی ذاتی ولا ینفک خاصیت یا ماہیت و نوعیت (نیچر) کا پتہ نہیں چلتا......[1]

اس طرح:۔

"ایک اہم نتیجہ خارجی دنیا میں قانون علت کے ختم ہو جانے کا یہ نکلتا ہے کہ فطرت اور فوق الفطرت کے درمیان کوئی واضح فرق باقی نہیں رہتا......

اسی سلسلہ میں ایک بڑی دلچسپ مثال ایڈنگٹن (EDDINGTON) ہی نے اور دی ہے کہ سائنس کے غیر مرئی یا ان دیکھے قوانین (جیسے کہ مثلاً نیوٹن (NEWTON) کے قانون کشش) کی حیثیت وحشی غیر متمدن قوموں کے غیر مرئی دیبی دیوتاؤں یا بھوتوں پریتوں کی سی ہے:۔

"کائنات کا وہ نظریہ جو کشش جیسے غیر مرئی قانون کی کارفرمائی کو قبول کرتا ہے کیا کچھ بھی اس سے زیادہ سائنسی ہے، جو وحشی انسان ہر ایسی چیز کو جس کو کچھ اسرار پاتے ہیں غیر مرئی دیبی دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں"

البتہ اتنا فرق ہے کہ:۔

"نیوٹنی طبیعات والا یہ کہہ سکتا تھا کہ اس کے قانون کشش والا دیوتا بندھے

---

[1] ایضاً ص ۲۰۳

ہوئے قوانین علت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس لئے اس کو غیر ذمہ دار، لاابالی

دیوتاؤں وغیرہ سے تشبیہ دینا درست نہیں.....“

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اتنا تو وحشی انسان بھی مان لے گا کہ اس کے دیبی دیوتا

کسی نہ کسی حد تک عادت پسند مخلوق ہیں، اس لئے کچھ نہ کچھ بجا طور پہ یہ قیاس کیا

جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ان کا عمل کیا ہو گا۔ البتہ بعض اوقات ان سے اپنے

خصوصی اختیار و ارادہ کا بھی اظہار ہو گا۔

بس یہی وہ ناقص استواری یا یکسانی ہے، جو پہلے دیوتاؤں وغیرہ کو ان کے

بھائی کشش کی طرح طبیعات کی ایک حقیقت ماننے سے باز رکھتے تھے....

لیکن جب ہم اس نتیجہ پر پہنچ چکے کہ بالکلیہ قطعی علت و معلول کا عمل کہیں بھی

پایا نہیں جاتا تو ہم پھر آپ سے آپ وحشیوں کی غیر مرئی دیوتاوں کے لئے

دروازہ کھول دیتے ہیں[1]۔“

اصل میں علت و معلول کا قانون ساری مادی کائنات سے غائب اس لئے ہو گیا کہ اس

کائنات کے تعمیری مادہ کے جو ذرات:۔

”بنیادی اینٹیں (الکٹران، پروٹان وغیرہ) ہیں خود وہی سرے سے کسی علت و

معلول کے قانون کی تابع نہیں معلوم ہوتیں۔ حتیٰ کہ ان کے سارے حالات کا

علم ہو بھی جائے تو بھی ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ فلاں ذرہ ایک سکنڈ، ایک منٹ یا

ایک سال بعد کیا کر رہا ہو گا (What might be doing) اور آئندہ

کیا، اس وقت بھی تعین کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ کوئی ذرہ کس طرح عمل

---

[1] ایضاً ص ۳۰۹

کر رہا ہو گا۔"[1]

یا بقول ایڈنگٹن کے :۔

"جس طرح زندگی کا ناقابل اعتبار ہونا ضرب المثل ہے اسی طرح اٹیم کے کوانٹم کا دوسرا جست بھی ناقابل اعتبار ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا اور کدھر ہو گا۔ تاہم کثیر تعداد کی نسبت بر بنائے اوسط پیشین گوئی کی جا سکتی ہے اور زندگی کے بیمہ کمپنی کی بچت اسی طرح قابل اعتماد ہے جس طرح ۱۹۹۹ء کا گہن۔"

جب "خشت اول ہی میں علت لاپتہ ہے تو پھر ایسی ہی اینٹوں سے تعمیر شدہ دیوار ثریا تک بھی چلی جائے تو بھی اس میں علت و معلول کا قانون کہاں ڈھونڈھے مل سکتا ہے حالانکہ ابھی گئی صدی تک کی شہرہ آفاق لاپلاسی مادیت کا دارمدار تمام تر لاپلاس (LAPLACE PIERRE SIMON) نامی بڑے فرنچ سائنس دان کے اس بلند بانگ دعوے پر تھا کہ :۔

"اگر کسی خاص متعین وقت یا لمحہ میں کائنات کی متعین حالت معلوم ہو جائے یا کائنات کے تمام ترکیبی مادری ذرات کی کسی خاص وقت جو خاص اجزائی ہیئت اور حرکات ہوں وہ معلوم ہو جائیں تو کائنات کے ماضی و مستقبل کی پوری تاریخ قطعیت کے ساتھ معلوم ہو جائے گی۔"

بالفاظ دیگر مستقبل بالقوہ حاضر یا حال ہی میں موجود ہوتا ہے لیکن :۔

"اس لاپلسی نقطۂ کائنات کا کوئی جز سرے سے علی حالہ برقرار نہیں رہا ہے...

---

[1] ("Unsolved problems of science") (سائنس کے ناحل مسائل) مصنفہ ہاٹل (HATELL) صہ ۱۳

(یعنی) کسی ایسی چیز کا وجود ہی نہیں رہا جس کو کائنات کی کسی لمحہ کی خاص حالت کہا جاسکے، نہ کوئی ایسی شئی جس کو ذرات کی خاص وقتی ہیئت سے تعبیر کیا جائے[1]"۔

لگے ہاتھوں علت و معلول ہی کے ہمہ گیر قانون سے وابستہ کہنا چاہیے کہ سب سے زیادہ مقبول عام و خاص نظریۂ ارتقا کو بھی ٹھکانے لگاتے چلیں۔

ڈارون کا یہ نظریہ بھی دراصل گذشتہ صدی تک کے مادہ و مادیت کے ان تصورات ہی کا شاخسانہ تھا، جو اب موجودہ صدی میں فرسودہ چکے ہیں۔ یعنی یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ بے جان و بے ذہن اور بے شعور مادہ ہی اپنے بے تمیز و بے ارادہ افعال و خواص اور ان کے قوانین علت و معلول کی راہ سے آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے زندگی ذہن اور شعور سب کچھ بن گیا۔ لیکن اب سائنسی تحقیقات نے ہمارے اس عالم شہادت کے اندرونی غیبوں میں جہاں تک رسائی پائی ہے اسکی رو سے نہ مادہ، مادہ باقی رہا نہ جس زمان و مکان میں وہ پایا جاسکتا تھا وہ زمان و مکان، وہ زمان و مکان ہی رہا اور نہ علت و معلول کے پہلے والے اٹل قوانین ہی اٹل رہے۔

"زمین پر زندگی و شعور پیدا ہونے کے جس میکانکی نظریہ کو ڈارون کے مادہ پرست پیرووں نے انیسویں صدی کے آخر میں پھیلایا۔ اس کا ماحصل یہ تھا کہ مادہ اور زمان و مکان تو اساسی حقائق ہیں، باقی اور جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، سب ان ہی سے ماخوذ اور ان ہی پر مبنی ہے۔ ابتدا میں مادی سالمات کے سوا کچھ نہ تھا، جو زمان و مکان میں مارے مارے پھرتے تھے۔ خاص خاص طبعی قوانین کے تحت ان ہی سالمات نے بالآخر زمین کی صورت اختیار کرلی۔ اور اس طبعی عمل کے دوران میں ہی ایک خاص

---

[1] (عصری طبیعات کے فلسفیانہ پہلو "Philosophical Aspect of Contemporary Physics")

سطح یا منزل پر زندگی کا ظہور ہوا جس کے متعلق ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ پہلے پہل اس کا کہاں اور کسی صورت میں ظہور ہوا۔ اس نظریہ کی اہم بات بس یہ ہے کہ زندگی کا ظہور تمام تر سالمات پر طبعی قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے۔"

"زندگی ایک مرتبہ پیدا ہو کر پھر یکے بعد دیگرے مزید پیچیدگیاں اختیار کرتی گئی۔ اسی دوران عمل میں ایک خاص منزل پر ذہن پیدا ہو گیا اور یہ ذہن یا نفس بھی زندگی ہی کی طرح محض سالمات کے پیچیدہ مجموعوں پر طبعی قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے۔ غرض اس نظریہ کے مطابق زندگی اور ذہن دونوں محض سالمات کے خاص خاص پیچیدہ مجموعوں کا نام ہیں[1]۔"

یہ تہ بہ تہ مفروضات ہی مفروضات کے اس "افسانہ زنی" کے سوا کیا ہوا کہ "چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند"۔ اور یہ "افسانہ زنی" انیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ ختم نہیں ہو گئی بلکہ بیسویں صدی میں بھی خود سائنسی راہوں سے خود مادہ کی مادیت، اسکی علیت اور زمان و مکان سب کے انیسویں صدی تک والے مفروضات کا خاتمہ ہو چکا ہے، پھر بھی بہتیرے سائنس ہی کا نام لے لگا کر "مرغ کی ایک ٹانگ" کی رٹ بدستور لگائے جاتے ہیں۔ اصل میں اُسکا تعلق کسی منطق و عقلیت سے زیادہ مادہ پرستانہ ذہنیت سے ہے۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی یہاں اس ذہنیت والے سر آرتھر کیتھ SIR Arthur keith جیسے ایک نامور سائنسداں کی زبان سے ایک ہی جملہ سن لیں کہ:۔

"نفس (MIND) کا دماغ سے وہی تعلق ہے جو ہنسی کا چہرے کے عضلات سے، چہرے کو مفلوج کر دو تو ہنسی بھی غائب ہو جاتی ہے، اسی طرح دماغ

---

[1] ماڈرن بلیف ("Modern Belief") حصہ سوم صفحہ ۱۳۰

سے آکسیجن نکال دو تو نفس کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔"

حالانکہ ان ہی سر آرتھر کا پرانی مادیت کی سب سے بڑی پناہ گاہ خود ارتقا کے بارے میں ابھی دس سال پہلے (۱۹۵۳ء) ہی کا دو ٹوک اعتراف ہے کہ :-

"ارتقا نہ صرف ناثابت بلکہ ناقابل ثبوت ہے، باقی ہم اس کو مانتے صرف اس لئے ہیں کہ اس کا واحد بدل صرف نظریہ تخلیق ہے جو ناقابل فہم ہے۔"[1]

رہی ناقابل فہم ہونے کی دلیل تو وہ درحقیقت اس مادہ پرستانہ ضد و ذہنیت کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ بس خدا کو کسی طرح نہ ماننا پڑے خواہ اس کے بجائے بے دلیل سے بے دلیل بات کو مان لینا پڑے، یہی مختوم القلب وہ ذہنیت ہے کہ "میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے"۔

ورنہ دلیل اگر اسی کا نام ہے کہ "چہرہ کو مفلوج کر دو تو ہنسی بھی غائب ہو جاتی ہے" تو اس کے لئے سائنس دان ہونے کی کیا ضرورت، اندھا بھی جانتا ہے کہ آنکھ جاتی رہی تو بینائی بھی غائب ہو گئی۔ کان کے پردے نہ رہیں تو شنوائی غائب ہو جاتی ہے۔ زبان کاٹ لی جائے تو گویائی غائب ہو جائے گی، اسی طرح اس واقعہ سے کون احمق انکار کرے گا کہ ہمارے سارے ذہنی یا نفسی اعمال و افعال، معمولی احساسات و ادراکات کیا اعلیٰ سے اعلیٰ سائنسی و فلسفیانہ افکار تک ــ کا بظاہر جسم ہی کے ظاہری و باطنی اعضاء و جوارح سے ایسا تعلق ہے کہ جہاں جسم غائب ہوا یا اس پر موت طاری ہوئی، ڈارون اور سر آرتھر (Sir Arthur Keith) سب ہی غائب ہو جاتے ہیں، لیکن جاہل سے جاہل کے اس عامیانہ مشاہدہ یا علم سے یہ عالمانہ نتیجہ کس منطق سے نکلا کہ دو چیزوں کی وقتی یا ظاہری غیر منفک معیت دونوں کی عینیت یا ان کی حقیقت کے بعینہٖ ایک ہونے کی قطعی دلیل ہے، اور آں حالیکہ خود کیتھ صاحب

---

[1] ماہنامہ زندگی (رام پور) بابت جولائی ۱۹۶۳ء صہ ۳۷

ہی کو اور اگلی ہی سطر میں یہ اعتراف ہے کہ :۔

" ہم حیات کی انتہائی حقیقت کو نہیں جانتے۔ اس سے بھی زیادہ اس امر سے جاہل ہیں کہ مادہ نے پہلے پہل زندگی کی صورت کیوں کر اختیار کی۔ لیکن ساتھ ہی مادہ سے الگ ہم کو حیات کا کوئی علم نہیں۔"

گویا بس یہ عدم علم یا جہل ہی اس امر کی بالکل کافی دلیل ہو گئی کہ حیات کا ماخذ و مبدا بھی قطعاً مادہ سے الگ کوئی چیز نہیں۔ اور اس طرح چونکہ :۔

" جاندار مادہ کی سادہ سے سادہ شکل میں بھی حسی قوت ( Sentient Power ) موجود ہے، جو شعور نفس کی ابتدا ہے (لہذا) انسانی دماغ میں بھی ابتدائی قوت قوتِ احساس اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے جو دراصل اتنی ہی قدیم ہے، جتنا پروٹوپلازم ( Protoplasm ) "

دیکھا آپ نے عدم علم کے عالمانہ مفروضات پر منطقی جتیں کہ چونکہ مادہ سے الگ ہم کو حیات کا کوئی علم نہیں، اس لئے حیات عین مادہ ہے اور پھر چونکہ ذی حیات یا جاندار مادہ کے ساتھ اس کی سادہ سے سادہ شکل میں حسی قوت پائی جاتی ہے لہذا ڈارون اور سر آرتھر جیسے ذہنی کمالات والے بھی بالآخر اپنی حقیقت میں بے جان و بے حس مادہ کے سوا کچھ نہیں۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

غنیمت ہے کہ اب "سر آرتھری" سروں کی اس مادہ پرستانہ ذہنیت کو اکابر سائنس میں بھی کوئی خاص قبول حاصل نہیں رہا بلکہ خود اپنے ہمسر سر آلیور لاج ( Sir Oliver Louge ) ہی کے متعلق اور عین اپنے مذکورہ بالا خیالات کے دوران اظہار میں اعتراف کیا ہے کہ :۔

"میرے دوست سر آلیور لاج جو مادہ کی ساخت کا علم مجھ سے زیادہ رکھتے ہیں ان کی رائے میں نفس اپنی حقیقت میں مادی نہیں، بلکہ کوئی غیر مادی شئے ہے جو انسانی دماغ کو عارضی طور پر کچھ دن کے لئے اپنا گھر بنا کر موت کے وقت اس سے آزاد ہو جاتی ہے"[1]

## نئی مادیت بصورت نظریہ ارتقاء

سر آرتھر کے مذکورۂ بالا ان خیالات ہی کی بنا پر ہم سے یہ یقین کرنے کو کہا جاتا ہے کہ :-

"ذہن یا نفس جسمانی اساس رکھتا ہے اور یہ اساس دماغ ہے۔ یہی دماغ فکر و شعور، سوچ سمجھ اور اختیار و ارادہ سب کا محل ہے۔ اور اس دماغ کے اندر اربوں خلایا (cells) کا جو عمل جاری ہے نفس اسی کا ظہور ہے"

لیکن سوال یہ ہے کہ آیا یہ سراسر مادیت ہے یا ایک جاندار وجود کے افعال نفس کا محض مادیانہ بیان (description) یعنی مادہ یا مادی دماغ کے تعلق سے کس طرح ان افعال نفسی کا ظہور ہوتا ہے۔

باقی دماغ کے اربوں خلایا (cells) میں جو جان یا زندگی پائی جاتی ہے چونکہ خود اس کی انتہائی حقیقت نامعلوم ہے، نہ سائنس کی سمجھ میں یہی آتا ہے کہ مادہ نے پہلے پہل زندگی کی صورت کیسے حاصل کی یا شعور کی اصل کیا ہے تو لازماً نفس و ذہن کی انتہائی حقیقت بھی نامعلوم ہی رہی"

لہذا اس نظریہ کو ہم چاہیں تو "نو مادیت" (NEO-MATERIALISM) یا "نئی مادیت" کا نام دے سکتے ہیں یعنی :-

---

[1] خلاصہ از ماڈرن بلیف صفحہ ۳۰ باب ۵ جلد چہارم۔

"ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ نفس یا ذہن کا جاندار مادہ کی جسمانی دنیا میں کیسے ظہور ہوتا ہے، اس کے آگے ہم خود مادہ کی انتہائی ساخت و حقیقت تک کو نہیں جانتے، بلکہ علم طبیعیات کو تو ابھی نفس کے ان اجزا کے خواص ہی کی نسبت بہت کچھ جاننا ہے جن سے مادہ مرکب ہے۔"

"ہم یہ سمجھانا نہیں چاہتے کہ مذکورہ بالا تمام باتیں تمام ماہرین کے مسلمات ہیں ..... تاہم ہمارے نزدیک اتنا بالعموم مسلم ہے کہ دماغ نفس نہیں، بلکہ آلۂ نفس ہے، جو نفس کی موثر فاعلیت کو بروئے کار لاتا ہے۔"[1]

اس نئی مادیت کو پرانے معنی کے پیش نظر گو سرے سے مادیت کا نام دینا ہی بے معنی ہے تاہم پرانی یا نئی نام نہاد اس مادیت کی بدولت جو غلط در غلط خیال نظریۂ ارتقا کے نام سے پھیل گیا ہے اس نے ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت اختیار کر لی ہے، اس لئے اس کی حقیقت کو ذرا اچھی طرح سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک نظریۂ ارتقا کے اس نفس الامری واقعہ کا تعلق ہے کہ فلاں شئی اپنے سے پہلے کی فلاں شئی کی ترقی یافتہ صورت یا سطح ہے، عامی سے عامی آدمی کا دن رات کا مشاہدہ ہے جو کسی سائنسی یا فلسفیانہ تحقیق و تدقیق کا محتاج نہیں ــــ قدرتی و مصنوعی جاندار و بے جان جمادات و نباتات اور حیوانات تمام موجودات و مخلوقات میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ارتقا کا یہ عمل ہر طرف علانیہ جاری ہے، ہر اعلیٰ صورت پہلے کی ادنیٰ صورت کے مقابلہ میں بظاہر مادی یا جسمانی عناصر و اجزا ہی کی مزید پیچیدہ صورت ہوتی ہے۔ تناور سے تناور درخت اس کے بے شمار برگ و بار، پھول پھل سب کی سب دیکھنے میں اس کے حقیر تخم ہی کی تدریجاً ترقی یافتہ

---

[1] ماڈرن بلیف ص۲۰

مختلف سطحیں یا صورتیں ہوتی ہیں۔ پھر بھی یہ ترقی یافتہ صورتیں اور ان سے بڑھ کر ان کے افعال وخواص خود تخم سے کتنا زمین و آسمان کا فرق و اختلاف رکھتے ہیں۔ ایسا فرق و اختلاف جس کا تخم میں دور دور پتہ نہیں ہوتا۔ اگر سنترہ یا آم کے بیج کو ہم نے سنترہ یا آم بنتے دیکھ نہ لیا ہوتا تو کیا محض اس بیج کے کسی خورد بینی معائنہ یا اس کے عناصر و سالمات وغیرہ مادی اجزار کی تحلیل و تجزی سے کوئی بڑا سے بڑا سائنس داں بھی پیش بینی کر سکتا تھا کہ ان سے سنترے یا آم کا سا درخت اور اس کی پھل پھول پیدا ہوں گے۔ بلکہ اگر سنترے کے بیج سے آم کا سا درخت اور پھول پھل پیدا ہوتے دیکھتے اور آم سے سنترے کا سا، تو ہم بالعکس سنترے کے بیج کو آم کا اور آم کے بیج کو سنترے کا بیج بے تکلف اسی طرح قرار دیتے، جیسے آج سنترے کے بیج کو سنترہ کا اور آم کے بیج کو آم کا جانتے ہیں۔

اس لئے بنیادی سوال یہ ہے کہ ارتقائی اعلیٰ صورت و سطح پر ادنیٰ کے مقابلہ میں جو تفاوت و تخالف بلکہ بہتیری صورتوں میں تضاد تک پایا جاتا ہے۔ اس کا حقیقی ماخذ یا سرچشمہ کیا ہے؟ خود "سائنس اور ماڈرن تھاٹ" ("Science and Modern Thought") کی زبان سے سنو کہ زندگی یا ذہن و نفس کیا معنیٰ پانی تک کے صرف اجزاو عناصر معلوم کر کے ان سے پانی بننے کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

"فرض کرو ہم تمام مختلف قسم کے مادی ہوات یا سالمات (MOLECULES) کی الگ الگ تحقیق سے ان کے خواص و افعال کے متعلق سب کچھ جان لیتے ہیں تو کیا ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ یہ بتا دے سکیں کہ ان کے کسی خاص مجموعہ سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ مثلاً کیا ہم یہ بتا دے سکیں گے کہ ہائڈروجن کے دو سالمے آکسیجن کے سالموں سے مل کر وہ چیز بن جائے گی جس کو ہم پانی کہتے ہیں اور

جس میں فلاں فلاں صفات پائی جائیں گی؟ یعنی آکسیجن اور ہائڈروجن کے جداجدا
خواص جان لینے سے ان سے مرکب یعنی پانی کے خواص کا قیاس و استنباط
کرلیں گے"؟

درآں حالیکہ پانی کے افعال و خواص کا نہ کوئی پتہ ہائڈروجن میں ملتا ہے، نہ آکسیجن
میں، نہ ان دونوں کے علٰحدہ علٰحدہ بجائے خود کسی مطالعہ و تحقیق یا تخیل و تصور کی کسی پرواز
سے یہ پیش گوئی کرسکتے تھے کہ دونوں فلاں تناسب میں مل کر پانی کے وہ افعال و خواص
نمودار ہوجائیں گے جن سے پیاس اور آگ بجھائی جاسکے گی یا جس کے برسنے سے خشک
زمین پر سبزہ کا مخملی فرش بچھ جائے گا اور ہر طرف روئیدگی کی بھرمار ہو جائے گی، بلکہ وہی
پانی جو پیاس سے مرتے ہوئے کو زندگی عطا کر دے سکتا ہے اس کا جز ہائڈروجن زہر بن کر
کام تمام کردے سکتا ہے۔

نظریہ ارتقا کی بحث و سلسلہ میں فرق و تفاوت ہی نہیں، اجزائے ترکیبی اور ان
سے مرکب میں تضاد کی سب سے لاینحل پہلی گتھی حیات کا مسئلہ ہے کہ سرے سے قطعاً بیجان
مادہ اپنے ذرات یا عناصر کی کسی پیچیدہ سے پیچیدہ ترکیب و امتزاج سے بھی جاندار
کیسے بن جاسکتا ہے؟ اس کی بدولت سائنس دانوں کو اتنی دور تک کی کوڑی لانا پڑتی ہے کہ
ممکن ہے زندگی کسی دوسرے سیارہ سے کسی طرح ہمارے سیارہ زمین پر آگئی ہو!

یا پھر برگسان (BERGSON) کو یہ مشکل حل کرنے کے لئے ارتقا کی تہ میں
کوئی نہ کوئی مستقل ذی حیات محرک (VITAL IMPULSE) ایسا کارفرما ماننا پڑا
جو ارتقائی تخلیقات کا موجب ہوتا ہے اور اپنے اس نظریہ کا نام تخلیقی ارتقا رکھا تاہم
اس کی نوعیت فلسفیانہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ڈارون کے عضوی ارتقا کے بجائے خود

علم حیات کے ماہر ایک بڑے سائنس داں لارڈ مارگن نے فجائی ارتقا (EMERGENT EVOLUTION) کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ اس دعوے کے مطابق خالص سائنسی خیال ہے۔

اس نظریہ کی رو سے ایک مستقل روحانی (SPIRITUAL) اصل یا مبدء ایسا پایا جاتا ہے جو مادہ سے تعلق پیدا کر کے عمل ارتقا کی رہنمائی کرتا ہے فجائی کی اصطلاح سے مارگن مراد یہ لیتا ہے کہ ارتقا کی خاص خاص سطحوں یا منزلوں پر جاندار عضویوں میں ایسے نئے صفات و خواص اور قوتوں کا اچانک ظہور ہو جاتا ہے، جو اس ظہور سے قبل جرثومہ یا جنین یا ترقی کی کسی اور سطح پہ پہلے سے موجود نہیں ہوتے بلکہ ارتقا کے دوران میں ناگہانی یا فجائی طور پہ نمودار ہو جاتے ہیں (EMERGE) مثلاً زندگی اور ذہن ارتقا کے دوران میں اس کی ایک خاص سطح یا منزل پر اچانک ظاہر ہو گئے۔ خود مارگن کے الفاظ یہ ہیں کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سطح سے دوسری سطح کی طرف جست (JUMP) کا عمل ہوتا ہے اور ہر جست میں نئے خواص ایک مرتب و متعین ترقی کے ساتھ نمودار ہو جاتے ہیں۔" اسی کو وہ فجائی[1] ارتقا کا نام دیتا ہے[2]"

غرض یہ کہ ارتقا کے دوران میں اس کے مختلف مراتب و مدارج پر جو نئے خواص و صفات ابھر آتے ہیں وہ ڈارونی ارتقا کے مطابق کسی مادی یا میکانکی عمل کا نتیجہ نہیں ہوتے،

---

۱؎ جس کو قرآن کی زبان میں "کن فیکونی تخلیق" کہا جا سکتا ہے۔

۲؎ ص ۱۲۹ تا ص ۱۳۱ ماڈرن بلیف حصہ سوم ص ۲۰۲ و ص ۲۰۳ حصہ چہارم۔

بلکہ مارگن اس کو کسی پس پردہ روحانی فاعلیت (SPIRITUAL AGENCY) کا کارنامہ قرار دیتا ہے۔ ماحصل برگساں اور مارگن دونوں ہی کے نظریات کا یہ نکلتا ہے کہ خود بے جان و بے ذہن مادہ سے جان و ذہن کا پیدا ہو جانا کسی طرح نہ فلسفہ کی راہ سے سمجھ میں آنے والی بات ہے، نہ سائنس کی جب تک کوئی ذی حیات اور روحانی مبدء خود مادہ کے ماوراء نہ مانا جائے، تاہم اس میں شک نہیں کہ سر آرتھر کیتھ (Sir Arthur Keith) کے سے کٹر قائلین مادیت اب بھی موجود ہیں اور ہمیشہ ہی رہ سکتے ہیں جو یہ سمجھتے سمجھاتے رہے ہیں کہ نفس یا ذہن کا (مادی) دماغ سے وہی تعلق ہے جو ہنسی کا چہرے کے عضلات سے۔ چہرے کو مفلوج کر دو تو ہنسی بھی غائب ہو جاتی ہے، اسی طرح دماغ سے آکسیجن نکال لو تو نفس کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔" ورنہ بقول برٹرنڈرسل (BERTRAND RUSSELL) کہ حقیقت یہ ہے کہ اندھی بہری "گذشتہ نسل کی ناتراشیدہ مادیت کی موجودہ طبعی سائنس سے کوئی تائید بالکل نہیں ہوتی بشرطیکہ طبعیات مادہ کے وجود کو فرض نہ کرتی ہو۔ جیسا کہ واقعہ معلوم ہوتا ہے۔"[۱]

"پوری پوری" ناتراشیدہ مادیت یا میکانیت کا اعلان تو یہ ہے کہ (زندگی تو زندگی) مادی دماغ ہی ذہن یا نفس ہے اور نفس دماغ ہی (یا بھیجا) ہے حالانکہ:۔

"آج تک کسی قسم کا کوئی ایک ثبوت بھی اس بات کا نہیں پیش کیا جا سکا کہ نفس یا ذہن مادہ ہی کی ایک ذیلی و ذہنی پیداوار ہے یعنی وہ مادہ جس کو ہم بطور ایک جسمی جوہر کے جانتے ہیں۔ نہ کسی نے کبھی یہ بتلایا کہ وہ کیمیائی یا میکانکی تغیرات کیا ہیں، جن سے فکر اور ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ نفس و جسم میں باہمی تعلق و تعامل کا پایا جانا بالکل مسلم ہے۔ اور موجودہ سائنس بھی زیادہ سے زیادہ بس یہیں تک

---

[۱] دیکھو حوالہ بالا

جا سکتی ہے۔"

باقی اس سے آگے کی مشکل کو حل کرنے کے لئے:۔

"اس زمانہ میں عام طور سے جو کچھ تسلیم کیا جاتا ہے، وہ ڈاکٹر برنہارڈ بے ونک (Bernhard Bawink) کے الفاظ میں کم و بیش یہ ہے کہ اغلب یہ ہے کہ نہ نفس محض دماغ کا فعل ہے اور نہ دماغ نفس کا محض آلہ کار، بلکہ دونوں کسی نامعلوم تیسری[1] (ذات و حقیقت) کے کارنامے ہیں اور اسی لئے دونوں باہم کسی نہ کسی طرح مربوط و وابستہ ہیں۔ کیوں کر وابستہ ہیں، یہ ہم نہیں جانتے۔"

یا پھر:۔

"فکر حاضر ہی کا رجحان زیادہ اس طرف ہے کہ نفس اصلاً آزاد یا تخلیقی (AVERO CAUSA) ہے اور شعور دماغ کا محض فعل نہیں بلکہ شعور ہی دماغ کو بطور اپنے ایک آلہ کار کے کام میں لاتا ہے۔۔۔۔"

"نفس کی خاص خصوصیت اس کا تخلیقی ہونا ہے۔ اسکی توضیح کرنے کے لئے ڈاکٹر بیوتنگ کی ایک کتاب کا یہ اقتباس بے محل نہ ہوگا "یہ بالکل قطعی بات ہے کہ پوری کائنات فطرت میں کوئی گھڑی یا بجلی گھر انسان اور اس کے ذہن کے بغیر ہرگز وجود میں نہیں آسکتا، یہ چیزیں بالکل ہی نئی ہیں، جن کے مماثل کوئی چیز موجود نہیں جانداروں میں بھی نہیں۔"

بقول ٹامسن (Sir Joseph) Thomson اور گیڈیز کے کہ افعالِ ذہن یا

---

[1] ضد کی اور بات ہے، ورنہ نفس و دماغ کیا معنی کائنات کی کسی تخلیق کی بھی توجیہ کسی تیسری ذات کی "کن فیکون" کارفرمائی کے بغیر ناقابل فہم ہے۔

ذہنیت کو کسی بھی شعبدہ کے ذریعہ میکانیت سے برآمد نہیں کیا جاسکتا۔[1] بالفاظ دیگر کوئی مشین یہ نظریہ نہیں قائم کرسکتی کہ وہ مشین ہے۔[2]

### مادیت اور ارتقائیت کے متعلق خود اپنے اشکالات

مادیت اور ارتقائیت کے تضاد و تناقض خود راقم سطور طالب علم کے ذہن میں کچھ موٹے موٹے اشکالات و سوالات پچاس سال پہلے ندوہ کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، جو ہنوز حل طلب ہیں، مادیت خواہ نئی ہو یا پرانی اور مادہ خواہ مادہ رہا ہو خواہ برق یا توانائی و تابکاری بن گیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ زمین سے آسمان تک کے اربوں کھربوں اجرام سماوی اور جمادات سے لے کر نباتات و حیوانات اور انسان تک ان گنت گوناگوں مخلوقات کو عمل ارتقا کے ذریعہ پیدا کرنے میں یہ مادہ اپنی ذات و صفات سے خود ہی کافی تھا یا کسی بیرونی فاعل و عامل کے فعل و عمل یا مداخلت کا محتاج ہے؟ اگر اس کی ذات و صفات بلا اعانت غیر نے خود ہی عمل ارتقا کی ابتدا کرکے اس کو انتہا تک پہنچانے کے لئے کافی تھیں اور یہ ذات اپنی صفات کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ سے موجود یا ازلی و قدیم تھی جیسا کہ مادیہ یا مادہ پرست عام طور سے خیال کرتے رہے ہیں، تو پھر بڑا سوال یہ ہے کہ ارتقا کی ابتدا یا اس کی طرف پہلا قدم اٹھانے میں یہ ازلی یا قدیم مادہ کسی خاص وقت یا زمانہ کا کیوں منتظر رہا اور پہلا قدم بالآخر کب اور کیوں اٹھا؟ اگر کہا جائے کہ محض بخت و اتفاق سے اٹھا، تو بخت و اتفاق کی کوئی وجودی حقیقت نہیں۔ اور عدم وجود سے کوئی وجودی فعل و اثر پیدا ہونا ناممکن و ناقابل تصور ہے۔ باقی عام محاورہ میں اتفاق نام ہے کسی فعل و اثر کے سبب و علت کے عدم علم کا نہ کہ عدم وجود کا۔ لے دے کر ایک ہو! آسمانی

---

[1] ("Mentality cannot be juggled out of Mechanism")

[2] ماڈرن بلیف حصہ چہارم ص

قابل فہم رہ جاتا ہے کہ جب سے مادہ موجود ہے یعنی ازل ہی سے مادہ میں وہ ابتدائی تعبیر بھی موجود تھا جو بتدریج بالآخر انسان کے ارتقائی وجود و آفرینش کی صورت میں رونما ہوا۔

اور عمل تدریج کے لئے ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ مدت درکار ہوتی ہے لیکن صورت زیر بحث میں یہ ظاہر" اس لئے ظاہر نہیں بلکہ قطعاً غامض ہے کہ کسی بھی عمل تدریج یا ارتقا کے لئے جتنی بھی زیادہ سے زیادہ طویل کیا نامحدود مدت بھی درکار ہو، قدیم و ازلی مادہ کو ازل یا ہمیشہ ہی سے حاصل ہے۔ لہٰذا ارتقا کی انتہا انسان کو بھی ابتدا یا ازل ہی سے موجود ہونا چاہئے تھا۔

یا پھر یہ مانا جائے کہ مادہ میں عمل ارتقا کی تخلیق کسی بیرونی عامل و خالق کی مداخلت سے ہوئی یا خود مادہ ہی سرے سے قدیم و ازلی نہیں بلکہ حادث یا مخلوق ہے جس کے معنی مادیت کا قصہ ہی تمام ہو جانے کے ہیں یعنی نام نہاد مادیت اور ارتقائیت کے ضدین کو جمع نہیں کیا جاسکتا یا مادہ کے قدم و ازلیت سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یا ارتقائی تخلیق سے، باقی نظریۂ ارتقا کی سب سے دکھتی رگ وہی ہے جس پر ڈاکٹر سی۔ ڈی براڈ ( C. D. BROD ) نے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف عضوی ترقی کے قائل ہونے کے باوجود انگلی رکھ دی ہے کہ یہ کوئی منطق نہیں کہ "چونکہ 'ج' 'ب' سے اور 'ب' 'الف' سے نمودار ہوا ہے لہٰذا 'ج' 'الف' ہی کی بدلی ہوئی یا اس کے دوسرے بھیس کے سوا کچھ نہیں"۔ بالفاظ دیگر محض ارتقا کی تاریخ جان لینے سے کہ "الف" کے بعد 'ب' اور 'ب' کے بعد 'ج' نمودار ہوا ان عوامل کی حقیقت و نوعیت کی کوئی کلید ہرگز ہاتھ نہیں آجاتی جو بالآخر زندگی اور ذہن کی صورت میں رونما ہوتے ہیں۔ "تم کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ انتہا ابتدا ہی کا اک بدلا ہوا بھیس یا روپ ہے"[1]

پھر ارتقا کا سارا ڈراونی افسانہ تو بیسویں صدی کی سائنس کا پلٹ سے پہلے کی

---

[1] ماڈرن بلیف MODERN BELIEF حصہ نہم ص ۵۲۲

یا مادہ اور زمان ومکان وغیرہ کے متعلق نیوٹنی عہد کے فرسودہ تصورات کی باتیں ہیں، جب مخلوق وغیر مخلوق حادث وقدیم کسی نہ کسی مادہ کسی واقعی وحقیقی زمان ومکان میں پایا جانا اور خود زمان کا ایک دوسرے سے اور مادہ سے جداگانہ وجود مسلمات ہی کیا بدیہیات میں داخل تھا، لیکن اب بیسویں صدی کی خود سائنسی تحقیقات واکتشافات کے ہاتھوں جب نہ مادہ، مادہ رہا جو گویا کھلی آنکھوں رات دن دکھائی دیتا ہے نہ اس زمان نہ مکان کا نظریہ اضافیت کے مسلم ہو جانے کے بعد ایک دوسرے سے مستقل بالذات وجود رہا جس میں زمین و آسمان کی ساری موجودات کو بھی گویا ہم کھلی آنکھوں ہی موجود دیکھ رہے ہیں۔

اسی سلسلہ میں اسی فروری (۱۹۶۰ء) کے پہلے ہفتہ میں کسی فرد واحد سائنس داں کی زبان سے نہیں، بلکہ نیویارک میں منعقد ہونے والی سائنس دالوں کی ایک پوری کانفرنس کے مجمع میں ایک ماہر سائنس داں نے اپنے مقالہ میں جزء لایتجزیٰ (ایٹم) کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ مکان کا وہ جزء ہے جہاں "یہاں" اور "وہاں" کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ اور "قبل وبعد" کا فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ گویا تجربہ کرتے کرتے ایک نوبت ایسی آجاتی ہے کہ جب اور جہاں مکان وزمان دونوں ناپید ہو جاتے اور مادہ قوت (انرجی) میں تحلیل ہوتے ہوتے عدم وفنا کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔" (صدق ۲۴ر فروری بحوالہ انگریزی روزنامہ نیشنل ہیرلڈ)

یہ کہنا چاہیے کہ بعینہ وبلفظہ وہ نتیجہ ہے، جو سائنس سے قطعاً نابلد راقم ہذا خود اکابر سائنس کی عام فہم درجنوں کتابوں کی ورق گردانی سے سال ڈیڑھ سال پہلے نکال چکا تھا کہ در اصل مکان وزمان اور مادہ کا سرے سے ذہن سے باہر کوئی وجود ہی ثابت ہونا دشوار ہو گیا ہے۔

بلکہ اب تو صاف کہا جانے لگا ہے کہ :-

"انیسویں صدی کے سائنس دانوں کے نزدیک نفسیاتی مظاہر کی توجیہ دماغ (Brain) کی طبیعیات و کیمیا (کیمسٹری) سے بالآخر ہو جا سکتی تھی۔ لیکن کوانٹم نظریہ کی رو سے اب اس کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ اور نفسیاتی واقعات کی تشریح طبعیات و کیمیا اور ارتقا کو ملا کر بھی نہیں ہو پاتی"[1]

اور سن لیں کہ جو مادہ پرست ہے۔

"اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کو ہر بات کی توجیہ کے لئے بس ایک مادی ڈھانچہ دستیاب ہو جائے ان کو قدرتاً مادی دماغ یا بھیجا ذہن (mind) کا بنا بنایا ایسا ہی مادی ڈھانچہ نظر آیا....... وہ اس بنی بنائی مشین ہی سے مطمئن ہو گئے حالانکہ وہ مطلق نہ بتا سکتے تھے کہ آخر اس مشین سے ذہنی افعال پیدا کیسے ہو سکتے ہیں.... اب ہمارا سائنسی رجحان یہ بالکل نہیں رہ گیا ہے کہ ہمارا کسی چیز میں کچھ مشین کا سا رنگ دیکھا بس چیخ اٹھے کہ بات کی تہ پا گئے...... اور بس یہی انتہائی حقیقت ہے۔ حالانکہ آج کی طبیعیات میں ذہن کی اس طرح کی توجیہ کی کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے"[2]

اس طرح خود جدید سائنس ہمارے اس عالم شہادت کے پس منظر میں جس غیب کی کارفرمائی کی نشاندہی کر رہی ہے اس کی نوعیت پرانی مادیت والے اندھے بہرے بے حس و بے شعور مردہ مادہ کی نہیں، جس سے زندگی و ذہن تک کو ماخوذ سمجھا جاتا تھا بلکہ اب نام نہاد مادہ یا مادی موجودات خود ذہن سے ماخوذ کیا اس کی مخلوق نظر آنے لگی ہیں۔ بقول سر ایڈنگٹن

---

[1] دیکھو ہیزنبرگ کی کتاب "فزکس اینڈ فلاسفی" صفحہ ۹۳ تا ۹۵

[2] "سائنس اور ان دیکھی دنیا" ("The Science and the Unseen World") صفحہ ۲۱

جیسے مشہور مسلم ماہر سائنس کے کہ:۔

"کوانٹم نظریہ تک پہنچ کر اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ہم نے (خارجی یا ذہن سے باہر صداقت وحقیقت کی جستجو کے) مقصد کو سرے سے ترک ہی کر دیا اور محسوس کائنات کو ایسے عناصر میں تحلیل کرنے پر قانع ہونا پڑا ہے جو صراحتہ ذہنی (SUBJECTIVE) ہیں"[1]

اس طرح سائنس نے اصل بنیاد ہی کی کایا پلٹ کر رکھدی۔ اب آگے اس عظیم سائنسی انقلاب کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو۔

## الٹی منطق

یہ الٹی منطق بھی مذکورہ بالا اسی آنکھوں دیکھے عام و عامیانہ جھوٹی منطق ہی کا مغالطہ در مغالطہ ہے۔ یعنی آدمی جب اپنے چاروں طرف کیا شش جہت بحر و بر زمین و آسمان میں بے شمار سے باہر طرح طرح کی موجودات و مخلوقات کو اپنی ذات و ذہن سے علانیہ باہر دور و نزدیک پھیلا ہوا دیکھتا ہے تو جس طرح یا جیسا ان کو حواس سے محسوس کرتا ہے، ایسا ہی جوں کا توں ان کو خود ان حواس یا اپنی ذات و ذہن سے باہر بھی موجود یقین کرتا رہتا ہے بلکہ ان کی اتھاہ پہنائی و گونا گونی کے مقابلہ میں اپنی ذات کو انتہائی حقیر و بے بساط اور اپنے ذہن کو بالکلیہ منفعل ہی منفعل بس آئینہ کی طرح محض ایک عکس گیر آلہ کی حیثیت دیتا رہتا ہے کہ بس جو چیز جیسی اس آئینہ ذہن کے باہر بجائے خود پائی جاتی ہے اس کی ہو بہو تصویر ہمارا ذہنی آئینہ اپنے اندر اتار لیتا ہے

---

[1] ماڈرن بلیف "کتاب اول ص۳

نہ خود یہ ذہنی آئینہ اس عکسی تصویر میں کسی رد و بدل تک کی صلاحیت رکھتا ہے۔

گو یہ بات تمام تر درست نہیں کہ آئینہ یا پانی وغیرہ کے سے کسی بے جان سے بے جان عکس گیر شئی کی بجائے خود نوعیت و صلاحیت، صفائی و کثافت یا خوبی و خرابی کا اثر نفس عکس کی شکل صورت پر سرے سے کچھ پڑتا ہی نہیں کسی آئینہ میں خود ہم کو اپنی صورت ٹھیک بلکہ بہتر نظر آتی ہے کسی میں اور بری یا بھدی۔ اسی طرح پانی سے باہر جو چھڑی سیدھی نظر آتی ہے پانی کے اندر ڈالنے سے ٹیڑھی میڑھی دکھائی دیتی ہے۔ چہ جائیکہ ذہن وہ بھی انسانی ذہن جیسی جاندار و فعال ذات سراپا اتنی انفعال ہی انفعال ہو کہ اس کے احساسات اور ادراکات کی تعمیر و تشکیل میں خود اس کی ساخت و فطرت کو کوئی دخل نہ ہو پھر بھی یہ مغالطہ نراعام و عامیانہ ہرگز نہیں کہنا چاہئے کہ پوری قدیم و جدید سائنس و فلسفہ کی ارسطو سے لے کر گئی صدی کے نیوٹنی عہد تک کے خواص اور اخص خواص اکابر تک باور کرتے کراتے رہے ہیں کہ ہماری ساری کی ساری مرئی و محسوس کائنات اپنی پوری موجودات کے ساتھ خود ہمارے آلات حس، اور ذہن کی ساخت و نوعیت کی کسی قابل لحاظ مداخلت سے قطعاً آزاد اور اسی طرح ذہن سے بالکلیہ خارج و آزاد بجائے خود مستقل وجود رکھنے والے ایک مکان و زمان میں کم و بیش ہو بہو اس طرح پائی جاتی ہیں، جس طرح ہمارا ذہن اپنے سمع و بصر وغیرہ کے جسمانی حاسوں کے واسطہ سے ان کو محسوس یا اپنے اندر منعکس کرتا رہتا ہے۔

البتہ بعض پرانے نئے یونانی و مغربی فلاسفہ کی آوازیں اس الٹی منطق کے خلاف بھی سنائی دیتی رہیں۔ مگر نری خیالی دنیا میں بلند پروازیاں کرنے والے بدنام فلسفیوں کی ایسی آوازوں پر سائنسی نقار خانہ میں کون کان دھرتا خصوصاً اپنے زعم میں ٹھوس مادی حقائق کا گھمنڈ رکھنے والے انیسویں صدی کے سائنس دان، تو بالکل دوسرے سرے پر زندگی اور ذہن سب ہی کو

سرتا سر مادہ ہی مادہ کی ایک تمام تر ضمنی و ارتقائی پیداوار اپنے قطعی سائنسی تجربات و اختیارات پر مبنی جان رہے تھے۔ اور ارتقا کا نظریہ تو قبول عام و خاص کی اتنی ہمہ گیر سند حاصل کر چکا تھا کہ اب بھی اس کا ڈھول ___ پول نکل جانے پر بھی ___ عوام ہی نہیں، سائنس و فلسفہ کے بہتیرے خواص تک برابر پیٹے چلے جا رہے تھے بلکہ بیسویں صدی میں بھی ان کا شمار مستثنیات میں نہیں۔

لیکن ہر فرعونے را موسیٰ۔ عین اسی بیسویں صدی کے ایک سے ایک بڑھ کر محیر العقول سائنسی کارناموں کے دوران اور عین سائنسی مشاہدات و تجربات کی شہادتوں ہی سے "شہد شاهدٌ مِن اَهلِہٖ" والا معجزہ ہزاروں سال کی الٹی منطق کو سیدھا کرنا یعنی بالکل کایا پلٹ کرنے پر اتر آیا۔ اس سائنسی کایا پلٹ کی بظاہر ناقابل فہم نوعیت و اہمیت کا اندازہ کرنے کیلئے "انسانی ذہن کو چکرا دینے والی" کہیں اوپر کی پڑھی ہوئی چند سطروں کو پھر پڑھ لیں کہ یوں تو فلکیاتی کائنات کی ہماری دنیا ہی کروڑوں اربوں ستاروں کی دنیا ہے۔

"لیکن مدہوش کرنے والے یہ اعداد اصل میں بیرونی خلا میں شروع ہوتے ہیں جہاں کروڑوں سحابیے (NEBULAS) اور اربوں ارب ستارے پائے جاتے ہیں....... اور انسانی ذہن کو چکرا دینے والے یہ اعداد و شمار کسی پاگل دماغ کی پیداوار معلوم ہونے لگتے ہیں......."

پھر:-

"یہ ناقابل یقین اعداد و شمار بھی بجائے خود ہیچ در ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں، جب ہم ان کے مقابلہ میں کائنات کی اس وسعت و پہنائی کا خیال کرتے ہیں کہ ان اربوں کھربوں ستاروں کہکشاؤں سحابیوں وغیرہ کی بساط پوری کائنات کی وسعت میں ایسی ہے، جیسے اگر زمین کو ایک بالکل خالی کرہ فرض کر لیا جائے تو اس میں

ایک ذرہ کی ہوگی۔"

اب فرمایئے کہ ذہن کو چکرا دینے والے یہ اعداد و شمار اور پھر ان سے بھی بڑھ کر ناقابلِ یقین اعداد و شمار والی وہ کائنات جو ان کو بھی ہیچ در ہیچ بنا دیتی ہے ان سب کے متعلق اگر خود سائنس ہی کی زبان سے آپ کو یہ سننا پڑے کہ اگر پوری کی پوری نہیں تو قریباً پوری کی پوری یہ کائنات خود آپ کے مرعوب چکرا جانے والے ذہن ہی کی تعمیر و تشکیل یا کارستانی ہے تو اس کایا پلٹ کو الٹی کے بجائے سیدھی منطق جاننا آپ کے لئے کہاں تک قابلِ یقین ہوگا۔ مگر ابھی ذرا آگے چل کر ہی انشاء اللہ تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس الٹی منطق کے مغالطات پر مغالطات سے اگر پوری طرح ہم اپنے ذہن کو صاف کر لیں تو اس حقیقت کا صرف سیدھی منطق ہونا کیسا بالکل صاف سیدھی بات ہونا بھی سمجھ میں آ جائے گا۔ تفصیل سے پہلے کچھ تلخیص سن لیں کہ ہمارے علم و ادراک کی محسوس و مرئی کائنات کی تخلیق میں خود ہمارے ذہن کا حصہ کتنا عظیم ہے:۔

"یہ ہمارے ذہن ہی کی کارستانی ہے، جو مادہ کے ڈھیروں کی دنیا بن کر زمان و مکان میں گرداں نظر آ رہی ہے (ورنہ) مادہ کی اس دنیا کی باطنی حقیقت اس کے ظاہر سے اس درجہ مختلف ہے کہ ہم اس کا تخیل تک نہیں کر سکتے۔ نہ اس تک ہمارے ذہن کی رسائی ہی ممکن ہے، نہ اس کی کوئی ایسی تعبیر و تفہیم ہی کی جا سکتی ہے جس کا ذہن کوئی نقشہ بنا یا کوئی تصور قائم کر سکے۔"

بلکہ خارجی زمان و مکان والی دنیا کے متعلق یہاں تک کہہ دینا پڑا ہے کہ اگر:۔

"ہمارے ذہن سے باہر بالفرض کوئی شئی سرے سے وجود رکھتی ہے، تو وہ یہی ناقابلِ فہم تصور چار ابعادی (مکان ۔۔۔ زمان والا) تسلسل ہے جس کی باطنی خلاقانہ (CREATIVE) فاعلیت ہم سے قطعاً مخفی ہے۔ باقی مادہ و مکان

والی ہماری دنیا کے زمانی حوادث و موجودات اور زندگی یہ سارا ڈراما جو ہمارے سامنے کھیلا جا رہا ہے۔ یہ اس چار ابعادی تسلسل کی محض ہماری ذہنی تعبیر و ترجمانی ہے۔[1]

اب سیدھی منطق کے اسی متن کی شرح معمولی تفصیل سے نہیں اچھی طرح تکرار بر تکرار سے سن سمجھ لینا ضروری ہے اور الٹی منطق کی لنکا ڈھانے والے آج کے بڑے سے بڑے خود گھر کے بھیدی سائنس والوں ہی کی زبانی کہ ان ہی کے ابھی ایک ہی پشت پہلے کے بڑے سے بڑوں نے مادہ و مادیت کی اس الٹی منطق کو سائنسی تحقیقات کے مسلمات کیا گویا عین مشاہدات کا درجہ دے رکھا تھا۔

## سیدھی منطق

سب سے پہلے سائنس اور فلسفہ دونوں کی وقت کی جامع ترین بین اقوامی شہرت و عظمت کی مالک شخصیت برٹرنڈ رسل (BERTRAND RUSSELL) کی شہادت لیں۔ اور مثال زمین سے آسمان تک کھلی آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے اجسام ہی اجسام کی لیں کہ عام آدمی خود اپنے اور دیگر اجسام کے جسم و جسمانیت کے:-

وجود کو بدیہی پاتا ہے۔ اور یہی حال سائنس کے آدمی کا بھی پہلے تھا۔ البتہ کچھ فلسفی ان اجسام کو مختلف طریقوں سے عموماً ذہنی تصورات ہی میں تحلیل کر کے سرے سے (ذہن سے) باہر ان کے خارجی وجود کو نابود ہی ثابت کرتے رہے۔ لیکن

---

[1] ماڈرن بلیف ص۱۴۷ حصہ نہم

ایسے فلسفیوں کو درخور اعتنا نہ سمجھ کر سائنس اطمینان کے ساتھ مادیانہ (یا مادہ پرستانہ) ہی بنی رہی مگر آج خود کٹر سے کٹر سائنس دانوں کی (اجسام کے ذہن سے باہر خارجی وجود کی بظاہر) بے تکلف صاف سیدھی (منطق یا) باتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور ماہرین طبعیات (فزکس) ہم کو یقین دلا رہے ہیں کہ مادہ جیسی کوئی شئی سرے سے کوئی وجود ہی نہیں رکھتی دوسری طرف ماہرین نفسیات باور کرا رہے ہیں کہ ذہن جیسی کوئی چیز نہیں[1]......"

"طبعیات کی بنیاد پر آج جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہ جس کو اب تک ہم اپنا جسم (BODY) کہتے رہے ہیں وہ درحقیقت بڑی دیدہ ریزی سے بنائی ہوئی ایک سائنسی "تشکیل یا ڈھانچہ" ہے، جس کے مطابق کوئی خارجی واقعی طبعیاتی حقیقت سرے سے پائی ہی نہیں جاتی"۔

"آج کا جدید مادہ پرست بننے کی کوشش کرنے والا اپنے کو عجیب کشمکش میں پاتا ہے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف ایک خاص حد تک ذہن کے افعال کو کامیابی کے ساتھ جسم کے افعال کے وہ ماتحت ثابت کر سکتا ہے وہاں دوسری طرف اس واقعہ سے بھی مفر نہیں پاتا کہ جسم بجائے خود محض ذہن کا ایجاد کیا ہوا ایک سہولت پیدا کرنے والا تصور ہے"۔

اب آیئے ذرا اس کی سائنسی تشریح و توجیہ کی ایک موٹی مثال لے لیں۔

"سیدھا سادھا عام آدمی مادی چیزوں کے وجود کو یقینی ہی پاتا ہے۔ کیونکہ

---

[1] ذہن کا جسم یا مادہ پر قیاس ہی درست نہیں۔ کیونکہ ذہن کا علم سرے سے کسی استدلال کا محتاج نہیں۔ تمام تر بدیہی و وجدانی ہے جیسا کہ آگے خود سائنس دانوں کے بیان سے معلوم ہو گا۔

وہ حواس کے لئے بالکل بین و بدیہی ہوتی ہیں اور جو کچھ بھی مشکوک ہو اتنا یقینی ہے کہ جس چیز کو تم ٹھوکر مارتے ہو ڈھکیلتے دھکا دیتے یا جس سے ٹکراتے ہو اسکو حقیقی و واقعی ہی ہونا چاہیئے۔"

لیکن :۔

"عالم طبعیات (فزکس) ثابت کر دیتا ہے کہ تم کبھی کسی چیز سے ہرگز ٹکراتے ہی نہیں حتیٰ کہ جب تمہارا سر کسی پتھر کی دیوار سے ٹکراتا ہے تو نفس الامری واقعہ و حقیقت کے اعتبار سے تم اس کو مس تک نہیں کرتے ہوتے ...... ہوتا صرف یہ ہے کہ کچھ الکٹران اور پروٹان جو تمہارے جسم کا حصہ ہوتے ہیں ان میں اور اس چیز کے الکٹران و پروٹان کے مابین جس کو تم سمجھتے ہو کہ چھو رہے ہو صرف جذب و دفع کا عمل ہوتا ہے لیکن اس عمل میں فی نفسہ دو جسموں میں کوئی لمس و اتصال نہیں پایا جاتا محض اتنا ہوتا ہے کہ تمہارے جسم کے الکٹران اور پروٹان سے جب دوسرے جسم کے الکٹران اور پروٹان قریب ہوتے ہیں۔ تو ان میں ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے یہی ہیجان و اختلال تمہارے اعصاب کے واسطہ سے دماغ تک پہنچتا ہے۔ بس یہی دماغی تاثر لمس یا اتصال کا احساس پیدا کر دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔"

حتیٰ کہ :۔

"بالکل ایسا ہی احساس مناسب اختبارات (EXPERIMENT) کے ذریعہ سرے سے مغالطہ آمیز یا دھوکا دینے والا بھی پیدا کیا جا سکتا ہے"

غرض تا وہ غریب ذہن کو یا زندگی کو اپنے کسی مادی ارتقا کے عمل سے پیدا کیا کرتا

یہ تو خود بالکل ایک ایسا بھوت یا آسیب سا بن کر رہ گیا ہے، جو ذہن پر کوئی عمل کرنے یا اس کو ہانکنے والا کوئی ڈنڈا نہیں بن سکتا۔"

اس پر بھی خود رسل کا ذہن اپنے اس آسیب زدگی سے پوری طرح نکل نہ سکا، اس لئے اس کے نزدیک (مادہ ہی کی طرح) سائنس کو روح یا نفس و ذہن کے وجود کی بھی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ حالانکہ جیسا آگے پوری طرح خود اکابر سائنس سے معلوم ہو گا کہ ذہن یا نفس اپنے وجود کے لئے کسی دلیل کا سرے سے محتاج ہی کب ہے۔

بہر حال پہلے تو خود رسل ہی کی ایک دوسری کتاب[1] سے اتنی بات اچھی طرح پیش نظر رکھنے کی ہے کہ ہم خود اپنے اور دوسرے انسانوں، حیوانوں، درختوں، آگ، پانی، پتھر، دریاؤں پہاڑوں، چاند سورج، ستاروں بے شمار جاندار و بے جان جسموں کو جیسی شکل و صورت، رنگ روپ، سختی نرمی وغیرہ والے احساسات کے ساتھ ہم اپنے لمس و بصر یا دیگر حواس سے محسوس کرتے ہیں، سائنس کی رو سے ان کا کیا ان کے مانند و مماثل بھی کسی جسم یا شئی کا ہمارے ذہن سے باہر قطعاً کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ذہن کے باہر بس برقی ذرات کی مختل حرکات یا خود رسل کے الفاظ میں صرف "الکٹرانوں کا مجنونانہ رقص (MAD DANCE) پایا جاتا ہے، جس میں اور ہمارے لمس وغیرہ کے براہ راست محسوسات یا اشیا میں کوئی مماثلت یا مشابہت تک برائے نام ہی پائی جاتی ہے[2]۔"

ایک رسل کیا اس طرح کی باتیں تو ہر پھر کر آج کی طبیعاتی سائنس کے اور بھی بڑوں بڑوں کو کہنا اور ماننا ہی پڑ رہی ہیں۔ بقول سر ایڈنگٹن کے موجودہ علمائے طبیعات کا:-

---

[1] جستہ جستہ اقتباسات رسل کی کتاب ("The Will to Doubt") (شک کرنے کا ارادہ) کے صفحہ ۸۱، ۸۲، ۸۳، سے ماخوذ ہیں۔ [2] کتاب بالا ص ۵۴

"یہ اعلان واعتراف ہے کہ طبعیات خارجی (یا ذہن سے باہر کی) صداقت یا اس کے کسی جزو حصہ تک کا کوئی علم عطا نہیں کرسکتی، میرے اس دعوے کی توثیق ہے، کہ طبیعاتی طریقوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ تمام تر ذہنی (SUBJECTIVE) ہوتا ہے"[1]

حد یہ کہ:۔

"جس طرح الفاظ اشیا کے نمائندہ (یا مماثل) نہیں ہوتے محض ان کی علامات (یا اسما) ہوتے ہیں۔ جیسے روٹی کا لفظ روٹی کی واقعی کسی شکل وصورت، رنگ و بو وغیرہ کی کوئی تصویر یا عکس ونقشہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم اشیائے خارجی کے جو احساسات، وادراکات رکھتے ہیں، وہ ان کی واقعی حقیقت ونوعیت کو نمایاں کرنے والی کوئی تصویر یا ثنی مطلقاً نہیں ہوتے، بلکہ محض انکی علامات یا آیات (SYMBOLS) ہوتی ہیں"

اس سے بڑھ کر یہ کہ:۔

"جیسے ریاضی وہندسہ میں الف، ب ج وغیرہ حروف محض علامات[2] ہوتے ہیں ویسے ہی الکٹران پروٹان وغیرہ طبعیات کے الف، ب ج (A.B.C.) ہیں"

اسی کو صف اول کے نامور سائنس داں آرتھر ایڈنگٹن کی زبان سے سن لیں کہ:۔

"طبعیات کا حاصل اب کچھ ریاضیاتی علامات (SYMBOLS) اور ان کی مساواتیں (FOUATIONS) رہ گئی ہیں۔ یہ علامات کس شئی یا حقیقت کی ہیں اس کا پراسرار جواب یہ ہے کہ طبعیات کو اس سے مطلب نہیں

---

[1] فلاسفی آف فزیکل سائنس ص۱۸۵ [2] یہ علامات بے ساختہ قرآنی اصطلاح آیات کا کہنا چاہیئے لفظی ترجمہ ہے

نہ اس کے پاس ان علامات کی تہ میں جانے کا کوئی ذریعہ ہے[1]۔"

آگے اور سن لیجیئے :-

"ان علامات یا آیات کے پس پردہ جو شئی کام کر رہی ہے اس کی حقیقت کے متعلق کوئی قطعی حکم لگانا تو بہت دور رہا، طبعیات کو تو اس کے برعکس انتہائی قطعیت کے ساتھ اصرار ہے کہ اس کے طریقے (METHODS) تو علامیت (SYMBOLISM) کے پس پردہ کسی طرح جا ہی نہیں سکتے[2]۔"

غرض :-

"اس طرح طبعیات کی خارجی دنیا (EXTERNAL WORLD) محض سایوں یا اظلال کی دنیا (WORLD OF SHADOWS) بن کر رہ گئی[3]۔"

لیکن ان باتوں سے سائنس کے نفس مقاصد و تحقیقات میں کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ سائنس کی بحث و تحقیق کے لئے بجائے خود ان سایوں یا اظلال ہی کا دائرہ و موضوع اور ان کے قوانین ہی بالکل کافی ہوتے ہیں۔

"باقی رہی وہ حقیقت جو ان سایوں کے پیچھے روپوش ہے اس کی حیثیت و نوعیت کی بحث فلسفہ والوں کا کام ہے۔"

طبعیات (فزکس) کی حد تک تو واقعہ بس اتنا ہی ہے کہ مثلاً اس وقت جب میں کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہوں تو ہو یہ رہا ہے کہ :-

---

[1] ("Science and Unseen World") سائنس اور نادیدہ دنیا، صفحہ ۲ [2] ایضاً صفحہ ۲۳

[3] یہ حضرات صوفیہ کی اصطلاح ظلی وجود کے لفظی ترجمہ کے سوا کیا ہے۔

"میری کہنی کا سایہ میرے میز کے سایہ پر ٹکا ہوا ہے اور قلم یا روشنائی کا سایہ کاغذ کے سایہ پر چل رہا ہے....."

بہر حال۔ "طبعیات کے لئے ہیں یہ سب چیزیں علامات یا آیات ہی آیات اور عالم طبعیات ان کو آیات ہی کے درجہ میں چھوڑ دیتا ہے...."

پھر آگے حواس کے ذریعہ معمولی چیزوں کو ہم جیسا محسوس کرتے ہیں وہ تمام تر خود ہمارے ذہن کے کیمیا گر کا کارنامہ ہوتا ہے جو ان علامات یا آیات کو ہماری روزمرہ کی جانی پہچانی چیزوں کے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ برقی قوت کے منتشر ذرات یا مراکز (NUCLEI) چھونے میں ٹھوس بن جاتے ہیں۔ ان ہی مراکز کا بے تکان ہیجان موسم گرما کی گرمی بن جاتا ہے"..... وقس علیٰ ہذا۔

مزید برآں:۔

"ذہن کی یہ کیمیا گری یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ وہ حسن و جمال، غرض و غایت (PURPOSE) خیر و شر وغیرہ کے ایسے معانی بھی پیدا کر لیتا ہے جنکا طبعیاتی علامات و آیات کی دنیا میں کوئی نام و نشان مشکل ہی سے ملتا ہے۔"

خلاصہ یہ کہ:۔

"اس بات کا واضح علم و اعتراف کہ طبعی سائنس کا تعلق بالکلیہ سایوں کی دنیا سے ہے، یہ سائنس کی موجودہ ترقیوں کا نہایت اہم اور معنی خیز حاصل ہے۔ میں یہاں دنیا کی ظلالی اور علاماتی یا آیاتی نوعیت پر فلسفیانہ حیثیت سے اصرار نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ ہمارے روزمرہ کے معمولی و مانوس تصورات و خیالات سے آج کی سائنسی یا طبعیاتی دنیا

کس درجہ بے تعلق اور دور جا پڑی ہے"۔

اور اگر:۔

"تم ہماری معمولی (محسوس) دنیا سے سائنسی دنیا کی اس دوری و بے تعلقی کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہو تو پھر تم کو موجودہ سائنسی نظریات سے غالباً کوئی ہمدردی و دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ تم ان کو سرے سے نامعقول بلکہ مضحکہ خیز خیال کرو جیسا کہ بہتیرے کرتے بھی ہوں گے"[1]

سچ یہ ہے کہ سائنس کے نام کی ساکھ یا مرعوبیت نہ ہو تو عامی آدمی کیا اچھوں اچھوں کو بھی ایسی باتیں دیوانہ کی بڑ ہی معلوم ہو سکتی ہیں ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

دیوانہ کی بڑ یا مضحکہ خیز ہوں نہ ہوں، دو باتیں بہر حال یقینی ہیں، ایک یہ کہ اس عالم شہادت یا ہمارے حواس والے محسوسات کی دنیا کے پیچھے جو عالم غیب یا نامحسوس و نادیدہ دنیا کارفرما ہے، جبتک اس کی نوعیت و حقیقت سے متعلق استدلالی یا ایمانی راہ سے کوئی قابل یقین و اطمینان یا کم سے کم ظن غالب کے درجہ کا علم حاصل نہ ہو، اس وقت تک ان دونوں کے باہمی ربط و تعلق کے عقدہ کو حل ہی کیسے کیا جا سکتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ سائنس یا فلسفہ اس عالم شہادت یا ہمارے محسوسات کی دنیا کو سائنسی دلائل یا فلسفیانہ منطق سے خواہ کتنی ہی قطعیت کے ساتھ ثابت کردے کہ یہ تمام تر

---

[1] یہ جستہ جستہ اقتباسات بالا ایڈنگٹن ہی کی ایک دوسری کتاب ("The Nature of Physical World") کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں۔ تا صہ ۱

فریب نظر یا خود ہمارے ذہن کی کارستانی وکیمیاگری ہے اور خود ہمارے ذہن سے باہر ایسے انسانوں، حیوانوں، درختوں، پہاڑوں، سمندروں، چاند سورج یا ستاروں وغیرہ بے شمار موجودات کا سرے سے کوئی نام ونشان نہیں، جیسے کہ ہم دن رات اپنے حواس سے محسوس کرتے رہتے ہیں، پھر بھی نظری اعتبار سے ان کا کوئی منکر سا منکر فلسفی یا سائنس داں علمی دنیا میں قدم رکھتے ہی بالکل عامی آدمی ہی کی طرح قدم قدم پر خود اپنے ذہن سے باہر ان کے وجود کا یقین کئے بغیر عمل کا ایک قدم بھی تو نہیں اٹھا سکتا۔

علاوہ بریں یہ تو صحیح ہے کہ سائنسی مسلمات کی رو سے خود ہمارے ذہن سے باہر مادہ یا مادہ کی سی اگر کچھ بے ذہن چیزوں کا وجود ہے بھی تو وہ صرف الکٹران پروٹان اور ان کے دیوانہ وار رقص کا۔ باقی زمین سے آسمان تک ہمارے عالم شہادت یا محسوسات کی جاندار و بے جان ان گنت انواع واقسام کی مخلوقات بالکلیہ خود ہمارا ذہن ہی اپنی کسی کارستانی یا کیمیاگری سے پیدا کر لیتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ خود ہم کو یا ہمارے ذہن کو آخر اپنے اس عمل تخلیق یا کیمیاگری کا شعور و ادراک کیوں نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مثلاً ہمارے ذہن سے باہر صرف کچھ منتشر حروف والفاظ کا وجود ہوتا ہے جن سے خود ہمارا ذہن سیکڑوں ہزاروں طرح طرح کے اشعار ومضامین یا کتابیں وغیرہ خلق کر لیتا ہے یا اسی طرح ہم اپنے ذہن ہی سے مثلاً کسی مکان یا مشین وغیرہ کا نقشہ وخاکہ خلق کر لیتے ہیں اور اس کے ذہنی ہی ہونے کا پورا علم وشعور رکھتے ہیں اسی طرح کا اس کا بھی ادراک وشعور رکھتے ہیں کہ اس خاکہ ونقشہ کے مطابق ذہن سے باہر جو خارجی مشین یا مکان بنا ہے وہ بھی اس کے نقشہ وخاکہ ہی کی طرح بالکلیہ ہمارے ذہن ہی کی تخلیق ہے۔

اصل میں لاینحل معمہ عالم غیب ہی کا ہے، جب تک وہ کسی طرح ایمان یا استدلال

سے حل نہ ہو اس وقت تک عالم شہادت جو اس غیب ہی کا شہادتی و محسوساتی یا آیاتی و اظلالی رخ ہے، اس کی نوعیت و حیثیت کے بارے میں کوئی رائے قائم ہی کیسے کی جا سکتی ہے، رہی غریب سائنس کی بے بسی اس معاملہ میں تو بقول برٹرنڈ رسل اس کا عالم یہ ہے کہ وہ جتنی ترقی کرتی جاتی ہے علم کی جگہ جہل ہی جہل کو بڑھاتی جاتی ہے۔

"سائنس کی حالیہ ترقیوں نے ایک بہت بڑی تکلیف دہ اس صورت حال سے دوچار کر دیا ہے کہ ہر ترقی ہمارے علم کو اس سے بھی کم کر دیتی ہے جتنا ہم پہلے حاصل سمجھتے تھے"[1]

یعنی سائنس کی ہر جدید سے جدید ترقی فلسفیانہ یا ما بعد الطبیعیاتی حقائق اشیا بالفاظ دیگر وہی عالم غیب سے تعلق و علم ـــــ کے اعتبار سے ترقی معکوس یعنی علم کے بجائے جہل ہی جہل کی ترقی بنتی جاتی ہے۔ "تاریخ سائنس" نام ایک اور کتاب میں علم یا سائنس کی اس الٹی ترقی کو پڑھ لیں جو علم کی ترقی کو جہل کی ترقی بتا رہی ہے۔

"علم کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی عدم علم یا نامعلوم ( UNKNOWN ) کا رقبہ بھی وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور جتنا زیادہ ہم نامعلوم میں گھستے ہیں اتنا ہی جو کچھ وہاں ہم کو ملتا ہے اس کو صاف و سادہ قابل فہم الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہوتا ہے"[2]

اور سب سے بڑھ کر جہل یہی ثابت ہوا کہ دن رات جن چیزوں کو ہم اپنی آنکھوں یا دوسرے حواس سے اپنے ذہن سے باہر جیسا موجود دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں ویسا خود ہمارے ذہن سے

---

[1] ( "WILL TO DOUBT" ) ص ۱۸۱

[2] ( A Short History of Science" by Sir W. C. Dampiers ) ص ۱۷۱

باہر سائنس کی ترقی کو بجائے خود کسی چیز کا بھی وجود نہ ملا۔

البتہ ہمارا یہ عالم شہادت یا ہمارے احساسات کی دنیا اور اشیا اپنے ماورا عالم غیب یا ان اشیا کے حقائق ہی کی کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ نشان دہی ضرور کرتی ہے اور کرنی چاہیئے دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ یہ ارض و سماوات کا ہمارا پورا کا پورا عالم شہادت عالم غیب کی نشانیوں یا علامات و آیات کا عالم ہے۔ اس لحاظ سے آج کی سائنس کی جدید ترین ترقی جو کسی نہ کسی طرح اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ زمین سے آسمان تک حسی دنیا میں ہم رہتے بستے اور جس کو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں یہ اپنے غیب کی کسی نہ کسی ان دیکھی دنیا کا پتہ دیتی اور اس کی علامات و آیات یا نشانیوں ( SYMBOLS ) کا کام دیتی ہے۔ دوسری مثال جو ان سائنس والوں ہی نے غیب کی دی ہے وہ اصل اور ظل یا سایہ کی ہے کہ عالم شہادت گویا عالم غیب کا سایہ ہے۔ تیسری مثال لفظ اور اس کے مصداق یا اسم اور مسمیٰ کے تعلق کی ہے جیسے روٹی کا لفظ و نام روٹی کے مدلول و مسمّٰی پر دلالت کرتا ہے یا جس طرح ریاضی و ہندسہ کی حرفی علامات الف، ب، ج وغیرہ نامعلوم اشیا کی نشاندہی کرتی ہیں۔

غیب و شہادت کے باہمی ربط و رشتہ کی ان مختلف مثالوں میں کون سی سائنس و فلسفہ اور عام فہم سلیم ( کامن سنس ) ( COMMONSENSE ) کے لئے نسبتہً زیادہ قابل قبول ہے، اس پر گفتگو آگے انشاء اللہ اپنے موقع پر ہوگی لیکن اس کی نوعیت کا کچھ اندازہ کرنے کے لئے بہ تکرار و باصرار مادہ کے اس مفہوم و تصور سے نجات حاصل کر لیتی ہے جو گذشتہ صدی کے خاتمہ تک سیکڑوں کیا ہزاروں سال بطور آسیب پوری سائنسی تاریخ پر مسلط رہا ہے اس سلسلہ میں اوپر تو بہت کچھ خود سن ہی چکے ہیں آگے ایک اور بہت بڑے مغالطہ سے نجات حاصل کر لیں۔

## مادہ کے مستقل وجود یا استمرار کا ایک اور بہت بڑا مغالطہ

جس نے مادہ کے مستقل وجود یا اسکے استمرار کے دھوکے میں ڈالے رکھا

یہ ہے کہ تغیر پذیر محسوسات یا حواسی ادراکات کی تہ میں بلا کسی منطق و دلیل کے ایک غیر متغیر و مستمر ذات کو فرض کر لیا گیا تھا۔ بقول رسل کے:۔

"ہم کو آخر یہ فرض کرنے کا کیا حق حاصل ہے کہ مثلاً" برف گھل کر اس کی جگہ پانی جو رونما ہو جاتا ہے وہ دراصل کوئی ایک ہی چیز ہوتی ہے جو برف کے بجائے پانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے......"

حالانکہ:۔

"حقیقۃً جو کچھ ہم جانتے ہیں، وہ صرف یہ کہ حرارت (ٹمپریچر) کے خاص حالات یا (درجہ) کے اندر وہ شئی یا صورت جس کو ہم برف کہتے ہیں اس کی جگہ، وہ صورت سامنے آجاتی ہے جس کو ہم پانی کہتے ہیں۔"

البتہ ہم ایسے سائنسی:۔

"قوانین بنا سکتے ہیں جنکے مطابق ایک صورت کی جگہ دوسری صورت لے لیتی ہے۔"

لیکن:۔

ان دونوں صورتوں کو ایک ذات یا جوہر (SUBSTANCE) کی دو مختلف صورتیں قرار دینے کی کوئی دلیل بجز (عامیانہ یا سائنسی) تعصب کے نہیں ہے۔[۱]

---

۱؎ ("OUR KNOWLEDGE OF EXTERNAL WORLD") (ہمارا خارجی دنیا کا علم) از برٹرنڈ رسل ص۱۰۴

یہ تعصب یا مغالطہ عام و عالمگیر طور پر عوام خواص سب ہی کے ذہنوں میں جو بیٹھا رہتا ہے، رسل ہی کی زبان سے ایک اور مثال کے ذریعہ اس کی ذرا مزید تفصیل و تشریح کو ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ کیونکہ۔

"عامی آدمی اور فلسفی دونوں بعض ایسی چیزیں فرض کر لیتے ہیں، جن کے قبول واعتقاد کے لئے کوئی معقول دلیل و بنیاد سرے سے موجود نہیں ہوتی"

ان ہی بے دلیل باتوں میں یہ بھی ہے کہ:۔

"جس کو ہم ایک شئی (THE SAME THING) کہتے ہیں وہ دراصل بہ تدریج جلد جلد محسوس طور پر یا دیر دیر میں نامحسوس طور پر بدلنے والی صورتوں یا ظواہر (APPEARANCES) کا ایک سلسلہ ہوتا ہے"

مثال کے طور پر ایک رنگین نقشہ لو جس کا رنگ و روغن یا صورت آہستہ آہستہ بدلتی رہے، اگر ہم چاہیں تو اس نقشہ کو اس کی مختلف صورتوں یا پہلوؤں (ASPECTS) کا ایک سلسلہ قرار دے سکتے ہیں، جن کو ان ہی محرکات کی بنا پر یک جا کر لیا گیا ہے، جن کی بنا پر اس نقشہ کو ہم ایک چیز قرار دے لیتے ہیں۔ یعنی محسوس تسلسل (SENSIBLE CONTINUING) اور تعلیلی ربط (CASUAL CONNECTION)

اب اگر ہم ۔

"وہ قوانین بیان کر سکیں، جن کے مطابق رنگوں یا صورتوں کا یہ تغیر رونما ہوتا ہے تو بس تجرباتی طور پر (EMPERICALLY) جس بات کی توثیق ہو سکتی ہے (VERIFIABLE) وہ پوری کی پوری بیان ہو گئی"

باقی یہ مفروضہ کہ:۔

"نقشہ نام کوئی ایسی مستمر ذات ( CONSTANT ENTITY ) پائی جاتی ہے جس میں یہ مختلف بدلنے والے رنگ یا صورتیں مختلف اوقات میں پائی جاتی ہیں، ایک بالکل زبردستی یا خواہ مخواہ ( GRATUITOUS ) کی مابعد الطبیعات ( Metaphysics ) .... کے سوا کچھ نہیں"

جس کو طبیعات یا سائنس سے کچھ واسطہ نہیں:۔

"بس زیادہ عموی طور پر ایک "شئی" کی تعریف اس طرح کی جائے گی کہ وہ نام ہے مختلف صورتوں کے ایک خاص سلسلہ کا، جن کو عام زبان میں اس چیز کی صورتیں ( ASPECTS ) کہا جاتا ہے"

باقی یہ کہنا کہ:۔

"فلاں خاص صورت فلاں خاص چیز کی ہے اس کے معنی صرف اتنے ہوں گے کہ یہ ان پہلوؤں یا صورتوں میں سے ایک ہے جن کا تسلسل یہ "چیز" ہے"[1]

غرض ہمارا عالم شہادت یا خود سائنس کی زبان میں سائنسی مشاہدات ( OBSERVATIONS ) کی دنیا نام ہے تمام تر تغیرات یا تغیر پذیر اشیا و حوادث کا۔ رہا ان تغیر پذیر حوادث یا مظاہر کے غیب و تحت میں مادہ نام جیسی کسی قائم و جامد جوہر کی کارفرمائی کا مفروضہ اس کی نہ کوئی عقلی و منطقی بنیاد ہے، نہ ان مظاہر و حوادث کی توجیہ کے لئے کوئی ضرورت، خود رسل ہی کے الفاظ میں:۔

"کائنات کے تغیرات یا اشیا کے تغیر پذیر حوادث و مظاہر ( PHENOMENA )

---

[1] (ہمارا خارجی دنیا کا علم) ( "OUR KNOWLEDGE OF EXTERNAL WORLD" ) صفحہ
از برٹرنڈ رسل

کے پیچھے کسی غیر متغیر قائم و ثابت ٹھوس یا جامد شئی کے وجود کا اعتقاد ان حوادث کی توجیہ و تشریح کے لئے کسی تجربی یا عقلی دلیل پر مبنی نہ تھا۔"

اس کی حقیقت زیادہ سے زیادہ بس ایک جبلّی (INSTINCTIVE) رجحان کی سی تھی۔

"یہی رجحان وادعان کچھ عملی سہولتوں یا کامیابیوں سے تقویت پاکر بالآخر سائنس کے استمرار کمیت (MASS) کا قانون یا مسلمہ بن گیا۔ جس کو سائنس کی کامیابی کے لئے گویا لابدی (ESSENTIAL) سمجھ لیا گیا۔"

بات فقط اتنی ہے کہ:۔

"طبعیات (فزکس) پر فلسفیانہ رنگ میں لکھنے والے بعض وقت ایسی باتیں کرتے ہیں کہ سائنس کے امکان کیلئے کسی نہ کسی شئی کا دوام یا استمرار (CONSERVATION) ناگزیر ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بالکل ہی غلط خیال ہے، اگر پہلے ہی سے اس طرح کے استمرار یا دوام (PERMANENCE) کا اعتقاد نہ کر لیا ہو تو بھی وہی قوانین سائنس بنائے جا سکتے تھے، جو اب اس اعتقاد کی صورت میں بنائے جاتے ہیں۔ آخر ہم یہ کیوں فرض کریں کہ مثلاً برف جب پگھلتی ہے تو اس کی جگہ پانی جو لے لیتا ہے تو یہ بعینہٖ کوئی ایک ہی ایسی چیز ہے، جس نے صرف نئی صورت اختیار کر لی ہے[1]۔"

حقیقت حال کی ایک اور دوسری تعبیر جو سائنس اور فلسفہ دونوں کے اکابر وقت کی مسلمہ قرار دی جاتی ہے واقعات (EVENTS) کی ہے یعنی تجربہ اور عقل دونوں کی راہ سے سائنس اور فلسفہ دونوں کے ہاتھ میں لے دے کر صرف واقعات ہی واقعات کی

---

[1] کتاب بالا صفحہ ۹۸ تلخیصا

نری ایک حقیقت کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ ان ہی واقعات کی ایک قسم یا مجموعہ کو طبعی (فزیکل) اشیا (OBJECTS) سے موسوم کیا جاتا ہے اور دوسرے مجموعہ کو ذہنی۔

اس کو بھی پہلے سائنس اور فلسفہ دونوں کی جامع شخصیت برٹرنڈ رسل ہی کی ایک دوسری کتاب میں پڑھیں:۔

"کائنات نام ہے بس (گذرنے والے) واقعات ہی واقعات کا۔ نہ کہ ایسی چیزوں (THINGS) کا جو زیادہ دیر تک قائم رہتی ہیں (ENDURE FOR A LONG TIME) اور تغیر پذیر خاصیات رکھتی ہیں۔ یہ واقعات اپنے تعلیلی (CASUAL) علائق کے اعتبار سے مختلف مجموعوں یا زمروں (GROUPS) میں رکھے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ تعلیلی علائق ایک قسم کے ہیں تو ان سے حاصل ہونے والے مجموعہ کو طبعیاتی (فزیکل) چیز کہا جا سکتا ہے اور اگر دوسری قسم کے ہیں تو ان کے مجموعہ کو ذہن کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح نفس یا ذہن (MIND) اور مادہ دونوں (دو قسم کے) واقعات کی تنظیم (ORGANIZING) کے مختلف آسان طریقے ہیں۔"[1]

یعنی یہ دونوں قسم کے واقعات نفس اپنی واقعاتی حیثیت سے ماورا مادہ اور ذہن نام اس غیبی حقیقت کی حقیقت یا نوعیت کا کوئی قطعی و صحیح علم عطا نہیں کرتے۔ بس محض تنظیمی سہولت کے مدنظر ایک کا نام مادہ اور دوسری کا ذہن یا نفس رکھ دیا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ واقعات بھی اپنی پس پردہ کسی غیبی حقیقت کی اسی طرح کچھ نشانیاں ہیں، جن کو کہیں اوپر نشانیوں یا آیات و علامات (SYMBOLS) ہی کے نام سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔

---

[1] ("WILL TO DOUBT") صـ۸۳

حدیہ کہ نام نہاد مادہ کی تحلیل و تجزی سے سائنس اس کے جن انتہائی یا آخری ذرات کی الیکٹران پروٹان وغیرہ تک رسائی پا سکی ہے:۔

"حقیقی یا خارجی وجود ان ذرات (PARTICLES) کا بھی نہیں بلکہ واقعات (EVENTS) ہی کا ہے"

اور سنئے بعض قسم کے ذرات کے:۔

پیدا اور فنا ہوتے (CREATION AND ANNIHILATION) سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ذرات ائمی (PERMANENT) بھی نہیں ....بعض ذرات ایسا دفعتہً غائب ہو جانیوالا ٹھہراؤ (SUCH VANISHING DURATION) رکھتے ہیں کہ ان کے لئے ذرات (CORPUSCLES) لفظ استعمال کرنا بھی قطعاً گمراہ کن ہے کیونکہ یہ لفظ ناقابل تحلیل طور پر سختی و پائداری (HARDNESS AND PERMANENCE) کے معنی سے وابستہ ہے اس لئے ان ذرات کو ذرات کے بجائے واقعات یا زیادہ سے زیادہ واقعات ذرات" (EVENT PARTICLES) کہنا صحیح ہوگا، جیسا کہ (Whitehead) نے تجویز کیا ہے۔"[1]

بہر حال "واقعات" کی اصطلاح اختیار کرنے کا یہ وہ اہم نتیجہ ہے "جس پر سر جمس جینز (Sir James Jeans) برٹرنڈ رسل، ہنری برگسان (BERGSON) وہائٹ ہڈ اور گاسٹن (GASTON BACKELORD) جیسے مختلف الخیال اکابر (سائنس و فلسفہ) متفق ہیں۔

---

[1] دیکھو ملک کوپک (MILIC COPEK) کی کتاب ص ۳۸۹

"واقعات" کی اس اصطلاحی معنویت کو سمجھنے کے لئے زیادہ بہتر لفظ یا تعبیر "واقعات" کے بجائے "وقوعات" (HAPPENINGS) کی ہو گی جیسا کہ سر جیمس جینز نے اپنی کتاب "طبعیات و فلسفہ" نام میں کامٹ (COMTE) کے الفاظ میں اس طرح کیا ہے کہ:۔

"انسان کا علم و تجربہ بس وقوعات یا وقوع پذیر چیزوں تک محدود ہے، جن کی درحقیقت نہ (مزید) کوئی توجیہ (EXPLANATION) ہو سکتی ہے، نہ ترجمانی (INTERPRETATION) نہ اس کی کوشش ہی۔ اور سائنس کا کام لے دے کر بس ایسے قوانین کا دریافت کرنا رہ گیا ہے جن کے مطابق یہ وقوعات ظاہر ہوتے ہیں"

ان وقوعات یا واقعات ہی سے متعلق "پراسرار کائنات" کے مصنف سے جینز (Jeans) سے ایک "پراسرار بات" ہی اور سنتے چلیں کہ:۔

"یہ واقعات واقع نہیں ہوتے (EVENTS DO NOT HAPPEN) بلکہ بقول ویَل (VEYAL) ہم محض ان کے پاس سے گذرتے ہیں (we merely come across them) یا بقول افلاطون کے کہ "تھا" "ہے" اور "ہوگا" اصل میں صرف "ہے" "ہے"۔ ص ۱۴۵

"خواب نہ دیدہ را ہمہ تعبیر می کنند" کی کیسی عجیب سائنسی شرح!

ہمارے لئے سب سے زیادہ اور بار بار یاد رکھنے اور دہرانے کی حقیقت یہی ہے کہ غیبی حقیقت کے معاملہ میں ان سائنسی لال بجھکڑوں کی یہ "وقوعات" والی بات بھی ان دیکھے خواب کی اسی طرح کی ایک تعبیر ہے جس طرح سایوں یا اظلال (SHADOWS) اور

اور سب سے جامع الفاظ یا "اسمار" کی گذر چکی ہیں علامات یا آیات ( SYMBOLS ) کہ ہمارے شہادتی تجربات و مشاہدات کا ان کے غیبی حقائق سے کچھ ایسا ہی اور اتنا ہی تعلق جاننا چاہیئے جتنا بس الفاظ و اسمار کا اپنے مصداق و ہی سے ہوتا ہے جیسے مثلاً روٹی کے لفظ و نام کا خود روٹی سے۔

ورنہ سائنس کا کام لے دے کر اب فقط ایسے قوانین کا جاننا رہ گیا ہے جو مختلف اظلال، اسما و الفاظ، آیات و علامات یا مذکورہ بالا اصطلاح کے مطابق واقعات یا وقوعات کے عمل میں پائے جاتے ہیں۔ ان ہی قوانین کی دریافت کی دوسری سائنسی تعبیر ہمارے حواسی یا شہادتی تجربات یا عام فہم مفہوم میں خارجی اشیا کے مابینی علائق و اضافات یا نسبتوں ( RELATIONS ) کے علم اور دریافت کی ہے۔ ورنہ جیسا کہ سرجیمس جینز ( Sir James Jeans ) نے اپنی کتاب "طبعیات و فلسفہ" میں لکھا ہے کہ فی الواقع :-

"ہمارے ذہن اپنے قید خانہ سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتے نہ وہ مثلاً سونے چاندی پانی وغیرہ کسی چیز کی بھی بجائے خود ہمارے آلات حس سے باہر جو کچھ حقیقت ہے، اس کا کوئی پتہ پا سکے۔ ہم ان خارجی موجودات کے صرف ان پیاموں ( MESSAGES ) کو جانتے جو ان حواسی دریچوں کے واسطہ سے ہم کو موصول ہوتے ہیں۔ باقی اپنے مبدر یا اصل ( ORIGIN ) کی نوعیت و حقیقت کے باب میں یہ پیام ہم کو قطعاً کچھ نہیں بتلاتے۔"

"البتہ ہمارے ذہن ان موجودات کی باہمی اضافتوں یا نسبتوں

( RELATIONS ) کو جان اور سمجھ سکتے ہیں جو محض اعداد ہی اعداد ( PURE NUMBERS ) ہوتے ہیں خواہ یہ مقادیر ( QUANTITIES ) کے اعداد ہی کیوں نہ ہوں، جو بجائے خود ناقابل فہم ( INCOMPREHENSIBLE ) ہیں

غرض اس طرح طبعیات کی خارجی دنیا کا علم ہم حاصل کر سکتے ہیں مگر ہوگا یہ ہمیشہ نسبتوں ( RELATIONS ) ہی یا دوسرے لفظوں میں اعداد ہی اعداد کا علم[1]

اصل میں سر جیمس جینز کا زور خصوصیت سے اس پر ہے کہ "ہماری سائنس کی پوری عمارت ( HOUSE ) کی عمارت محض ریاضیاتی (یا اعدادی) فارمولوں (یا قاعدوں) کا مجموعہ ہی ہوتی ہے"۔ اسی ریاضیاتی فارمولے والی بات کو ایک اور نامی گرامی سائنس دان سر جیمس جینز ہی کے شریک نام جیمس بی کونانٹ کی کتاب[2] میں بھی پڑھ لیں۔ وہ بھی نظریہ اضافیت کی طرح آج کی عصری سائنس کے دوسرے عظیم انقلابی کوانٹم نظریہ کی رو سے اور نام نہاد مادہ کے اس ایٹم ہی سے متعلق جس کے بم نے ساری دنیا میں تہلکا مچا رکھا ہے کہ :۔

"کوانٹم نظریہ نے اس ایٹم کو اپنی تمام واضح محسوس وملموس ( TANGIBLE ) صفات سے ننگا کر کے محض ریاضیاتی فارمولے کا

---

[1] "علم آدم الاسماء کلہا" سے جو عام طور پر ہمارے مفسرین حقائق اشیا کی تعلیم لیتے ہیں وہ کہیں توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ نہ ہو۔ آخر خدا نے صرف "اسما" کا لفظ کیوں استعمال فرمایا؟

[2] "ماڈرن سائنس اینڈ ماڈرن انسان"، صفحہ ۱۹۰

ایک ڈھانچہ (FRAME WORK) نیا چھوڑا ہے۔ طبیعاتی سائنس

کا مقصد ظواہر کی دنیا (APPEARANCES WORLD) کے پیچھے

حقیقی وجود کو معلوم کرنا نہیں ......"

"اس سے بھی بڑھ چڑھ کر یہ کہ سائنسی نظریات کی حیثیت و حقیقت عقیدوں

یا مسلکوں (CREEDS) کے بجائے پالیسیوں کی سی رہ گئی"۔

ابھی چند سال پہلے کی (۱۹۵۲ء) مطبوعہ کتاب کے اسی کتاب کی پشت جلد پر درج ان سائنس دانوں کے موقف و مقام کے بارے میں بھی سر راہ کچھ سنتے چلیں، جن کا نام لے دینا ہی کسی معاملہ و مسئلہ کی صحت و سند بن جاتا ہے۔ حالانکہ:۔

"دنیا کے دوسرے کام کاج والوں کی طرح سائنس داں بھی اب زیادہ تر

عملی زندگی کے کاموں سے تعلق رکھنے والا عملی آدمی ہی بن کر رہ گیا ہے....."

یعنی مذہب و فلسفہ وغیرہ کے نظریات خصوصاً جن کا عالم غیب کے اسرار سے تعلق ہے، ان سے نہ اس کو براہِ راست تعلق رہا ہے، نہ وہ ان کے باب میں کوئی سند کا درجہ رکھتا ہے:۔

"وہ کوئی ایسا جادوگر نہیں ہے، جس کے پاس اسرار کائنات کی کنجی ہو۔ دوسرے

انسانوں کی طرح اس کے طریقے (METHODS) بھی بہ کثرت ناقص

ہوتے ہیں اور اس کا علم بھی قطعی (ABSOLUTE) کبھی نہیں ہوتا

وہ بھی غلطیاں کر سکتا ہے، بلکہ مہمل باتوں تک کا قائل ہو جا سکتا ہے.....

سائنس جو کسی نام نہاد منطق یا یقینی علم کا مخزن (REPOSITORY)

خیال کی جاتی تھی، اب اس میں بالآخر ایسے شکوک و شبہات کی گنجائش نکل آئی

ہے کہ مذہب و فلسفہ کے مسائل پر اب اس کے مقابلہ میں ابہام کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔"

راقم ہذا سائنس داں کو انسان کی حیوانی یا جسمانی ضروریات یا غذا فراہم کرنے والے بڑا سے بڑا استاد باورچی کہا کرتا ہے جو کسی بڑے بندہ شکم رئیس یا بادشاہ کا ملازم ہو جو نت نئی نئی طرح کے کھانوں اور ذائقوں کا حریص رہتا ہو، اور یہ باورچی اپنے فن کا ایسا ماہر کہ زمین پر پھیلے ہوئے معمولی اناجوں، ترکاریوں سبزیوں، گوشتوں مسالوں وغیرہ ہی کو نئی نئی ترکیبوں سے نت نئی غذائیں دسترخوان پر لگاتار رہتا ہو حالانکہ غریب یہ باورچی طرح طرح ان کھانوں کے مختلف اجزا کو کچھ اوزان و تناسبات وغیرہ میں ترکیب دینے سے تجرباتی طور پر جو نتائج رونما ہوتے ہیں، ان سے زیادہ خود ان اجزا کی حقیقت و ماہیت کا کوئی علم نہیں رکھتا بس یہی حال سائنس والوں کی نت نئی ایجادات کا ہے۔ ان ہی سے دھوکا کھا کر آدمی مرعوب ہو جاتا ہے کہ جو سائنس یا سائنس داں بجلی و بھاپ وغیرہ کو غلام بنا چکا ہے اور زمین سے اڑ کر چاند پر کمند ڈالنے کے لئے پر تول رہا ہے[لہ]، اس کے نام سے جو کچھ بھی کسی مسئلہ و معاملہ میں کہہ دیا جائے وہ پتھر کی لکیر کی طرح امٹ یا قطعی ہی ہونا چاہیے حالانکہ جس طرح ہر معمولی آدمی منطق پڑھے اور اس کی اصطلاحات جانے بغیر روزمرہ کے معاملات کی فہم کے لئے بقدر ضرورت منطق داں ہوتا ہے اسی طرح ہر باورچی، ہر بڑھئی ہر کاشتکار، ہر لوہار سائنس کی باضابطہ تعلیم پانے اور معمل (لیبوریٹری) میں کام کئے بغیر اپنے اپنے دائرہ میں اپنی اپنی ضرورتوں کے بقدر سائنس داں ہی ہوتا ہے۔ یعنی وہ چیزوں کی حقیقت جانے بغیر تجربات کی بنا پر ان کی کارکردگی یا ان کے عمل کو جانتا ہے کہ وہ کیونکر

---

[لہ] بلکہ جولائی ۱۹۶۹ء اور جنوری ۱۹۷۰ء کے دوران امریکہ کے کئی افراد چاند پر اتر بھی چکے ہیں۔

عمل کرتی ہیں۔ بس بالکل اتنا ہی بڑا سے بڑا سائنس داں زیادہ وسیع و منظم طور پر عام تجربات ہی سے نہیں بلکہ معمل کے اختبارات وغیرہ سے بھی جانتا ہے۔

"غرض سائنس کی انتہا بھی صرف اتنا ہی بتلانا ہے کہ چیزیں عمل کیسے کرتی ہیں، نہ یہ کہ وہ بذات خود اپنی حقیقت میں ہیں کیا؟ لازماً غریب سائنس مذہب کے باب میں کیا رائے زنی کر سکتی ہے؟"[1]

اسی طرح وہائٹ ہڈ جیسی مسلمہ سند و شخصیت کے بقول "سائنس کو اس سے قطعاً کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ کوئی شئی بجائے خود کیا ہے۔ اس کو اشیا کی محض ظاہری واقعیت (EXTRINSIC) سے واسطہ ہوتا ہے"[2]

مثلاً عام آدمی تجربہ سے جانتا ہے کہ پانی سے پیاس اور آگ بجھتی ہے۔ کھیت اور درخت اس سے نشو و نما پاتے اور ہرے بھرے رہتے ہیں۔ کیوں ایسا ہوتا ہے، نہ اسکو وہ جانتا ہے، نہ اس کے مقصد کے لئے جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح سائنس داں اس تجربہ سے آگے بڑھ کر پانی کی اختباری تحلیل کر کے یہ جان لیتا ہے کہ یہ کوئی بسیط شئی نہیں بلکہ آکسیجن اور ہائڈروجن کے ایک اور دو مزید عنصری ذرات یا سالمات سے کیمیائی طور پر مل کر بنتا ہے۔ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ پانی ہی کیوں بنتا ہے؟ کوئی اور شئے کیوں نہیں بن جاتی؟ اس سوال کا نہ سائنس کے پاس کوئی جواب نہ اس سے اس کو سروکار۔ اس کی رسائی صرف "ایسا ہوتا ہے" تک کے ظواہر تک محدود ہے نہ کہ "کیوں ہوتا ہے" کے غیوب کی عقدہ کشائی، یعنی عام آدمی کی طرح سائنس داں کا علم بھی چیزوں کے محض مابینی علائق و روابط

---

[1] سائنس کے ناحل مسائل ("UNSOLVED PROBLEMS OF SCIENCE") صفحہ ۳۰

[2] سائنس اور جدید دنیا ("SCIENCE AND THE MODERN WORLD") صفحہ ۱۹۰

اور نسبتوں یا اضافتوں (RELATIONS) تک محدود رہتا ہے حتیٰ کہ آج کی سائنس کے عہد آفریں نظریۂ اضافیت کے اصول کو سمجھنے کی بھی سر آرتھر ایڈنگٹن (Sir Arthur Eddington) کے الفاظ میں:۔

"قریب ترین تعبیر غالباً یہی ہو گی کہ ہم طبعی اشیا یا ذرات (ENTITIES) کے مشاہدات میں صرف انکے مابینی علائق یا اضافات (RELATIONS) کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ میرا زور اس سوال سے زیادہ کہ حقیقۃً ہم کیا مشاہدہ کرتے ہیں؟ ("WHAT WE REALLY OBSERVE) اس جواب پر ہے کہ ہم طبعی (فزیکل) موجودات (ENTITIES) کے صرف مابینی علاقوں یا اضافتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں"

گذشتہ ۳۰ سال کے طبعیاتی انقلابات میں یہی سوال کام کرتا رہا ہے جس کو ہیزنبرگ (HEISENBERG) نے ۱۹۲۵ء میں اس صورت میں دہرایا کہ ایٹم میں ہم جو کچھ مشاہدہ کرتے ہیں وہ درحقیقت ہے کیا؟[۵۱]

اور آگے

"اسکے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ طبعیات (فزکس) کے طریقے (METHODS) خارجی دنیا کی اطلاقی (ABSOLUTE) صداقت یا حقیقت کی دریافت کے ناقابل ہیں"[۵۲]

بہ اصرار و بہ تکرار پھر سن لیں کہ:۔

مجکو اب بھی اسی سوال پر برابر زور دیتے رہنا چاہیئے کہ اپنے سائنسی

---

۵۱۔ فلاسفی آف فزیکل سائنس صہ ۳۱ ۵۲ ایضاً صہ ۱۸۵

مشاہدات میں ہم درحقیقت کیا یا کس چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں؟ اضافیت کا جواب یہ ہے کہ ہم صرف اضافات یا علائق ( RELATIONS ) کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کوانٹم نظریہ کا جواب یہ ہے کہ ہم صرف اغلبیات ( PROBABILITIES ) کا مشاہدہ کرتے ہیں[1]

پھر اشیا یا سائنسی مشاہدات کے مابین جو یہ علائق یا اضافات پائے جاتے ہیں وہ بھی کوئی خارجی حقائق یا خارجی قوانین فطرت نہیں، بلکہ سائنس ہی کی ایک مختصر تاریخ ہی میں پڑھ لیں کہ :۔

"سائنسی تجزیہ ( SCIENTIFIC ANALYSIS ) کے لئے ذہنی تعقلات ( CONCEPTS ) بہر حال ناگزیر ہیں اور جن علائق یا اضافات ( RELATIONS ) کو قوانین فطرت ( LAWS OF NATURE ) کہا جاتا ہے وہ نام صرف ذہنی تعقلات ہی کے مابینی روابط یا اضافات کا ہوتے ہیں نہ کہ ٹھوس حقائق ( CONCRETE REALITIES ) کے مابینی روابط و علائق کا"[2]

---

[1] ( "PHILOSOPHY OF PHYSICAL SCIENCE ) صفحہ ۸۵

[2] A SHORT HISTORY OF SCIENCE" BY SIR W. C DONSPIER ) صفحہ ۲۷۲

# سائنس اور فلسفہ

یار در خانہ و من گردِ جہاں می گردم

اوپر کے ایک مستقل عنوان میں عالم شہادت کے بالمقابل جس کو عالم غیب یا اضافی و اعتباری غیبوں کے ماورا اطلاقی و حقیقی غیوب یا غیب الغیوب سے تعبیر کیا گیا ہے، وہی سائنس کے مقابلہ میں فلسفہ خصوصاً فلسفہ مابعد الطبیعیات کا خاص موضوعِ بحث ہے گئی صدی کے اواخر تک سائنس کے ہاتھ میں مادہ بہ ظاہر ایک ایسی ٹھوس جوہری معلوم و محسوس حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا کہ اس کو مادی عالم اجسام کے تنوعات و تغیرات کی توجیہ و تفہیم ہی کے لئے نہیں، بلکہ جسم و جسمانیت کے کہنا چاہیئے کہ بالکل متضاد صفات و افعال رکھنے والے ذہن و نفس تک کی تعلیل و تشریح کے لئے یہی مادی جوہر سائنسی حلقوں میں بڑی حد تک کافی و وافی سمجھا جاتا تھا۔ لہذا سائنس کو عالم شہادت کے ان دونوں رخوں کو سمجھنے سمجھانے کے لئے کسی اور طرف سنجیدگی سے

رُخ کرنے کی ضرورت معلوم نہ ہوتی تھی۔

**فلسفۂ مادیت پر برکلے کی زد**

اگرچہ فلسفہ کی تاریخ خود مادہ کے سرے سے وجود ہی کو وقتاً فوقتاً چیلنج کرتی رہی تھی بسب سے بڑھ کر جدید فلسفہ میں برکلے کی طرف سے یہ چیلنج کچھ ایسے صاف وسادہ دلائل پر مبنی تھا کہ کم از کم فلسفہ کی دینا میں مادیت (MATERIALISM) کا مسلک بڑی حد تک پس پشت پڑ کر فلسفہ کی جدید تاریخ زیادہ تر تصوریت (IDEALISM) ہی تصوریت کی تاریخ بن گئی۔ پھر بھی اسکی نوعیت چونکہ تمام تر آرام کرسی والی نری خیالی اڑانوں کی سمجھی جاتی رہی اس لئے سائنسی مادہ کی ٹھوس جوہری نوعیت وحقیقت پر اس کی کوئی براہِ راست زد نہ پڑی۔

**نظریۂ اضافیت اور کوانٹم نظریہ کی سائنسی مادیت پر زور**

لیکن موجودہ صدی کے خود سائنسی خصوصاً طبعیاتی (فزکس کے) انکشافات، ان میں بھی خاص طور پر نظریۂ اضافیت اور کوانٹم نظریہ کے انقلابی بھونچال نے سائنس کے پرانے مادی نقشۂ کائنات کو تہ وبالا کر دیا۔ حتیٰ کہ اولیت کا مقام جدید فلسفہ کے ابوالآباڈیکارٹ {DESCARTES-(RENE)} ہی کی طرح بلکہ ڈیکارٹ کا نام لے کر مادہ وجسم کے بجائے نفس وذہن کو دیا جانے لگا۔ کم از کم یہ کہ جس کو مادی کائنات کہا جاتا ہے وہ بلا شرکت غیرے مادہ کی مخلوق ہونے کی جگہ بہت زیادہ ذہن کا تخلیقی کرشمہ قرار پاگیا اور یہ تو بہر حال ڈیکارٹ ہی کی طرح برملا بڑے سے بڑے سائنس دانوں کی طرف سے کہا جانے لگا کہ انسان کو براہِ راست یقین بلکہ بدیہی وحضوری علم صرف اپنے ہی نفس وذہن یا اس کے احساسات وافکار کا ہے باقی ذہن سے باہر کی کسی خارجی یا مادی وجسمانی دنیا کا علم اگر کچھ ہے اور جو کچھ بھی ہے، وہ تمام تر محض قیاسی واستنباطی، نہ کہ نفس وذہن کی طرح بالذات

بدیہی وقطعی۔ اس لئے پہلے ذرا ڈیکارٹ ہی کی بات کو سُن سمجھ لیں۔

"بغل میں لڑکا شہر میں ڈھنڈھورا" ہے تو ایک عامیانہ دیہاتی مثل۔ لیکن انسان کی ایک بڑی کمزوری کی بڑی معنویت والی حقیقت۔ بڑے سے بڑے اہلِ عقل وعلم بارہا اپنی عین دور بینی ہی کی بدولت قریب سے قریب حقیقتوں کو دیکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کسی بھی عالم وعاقل و عامی وجاہل کے لئے سب سے پہلی اور قریبی حقیقت خود اس کے اپنے اندرونی احساسات و ادراکات، افکار وخیالات، جذبات وارادات وغیرہ مختلف شعوری یا ذہنی کیفیات وحالات ہی ہوتے ہیں۔

## ڈیکارٹ کی تصوریت

ڈیکارٹ (DESCARTES) نے بس اسی سامنے کی صاف سیدھی قریبی وحضوری حقیقت کو پا اور پکڑ لیا۔ جو راہ اس نے اختیار کی وہ اس کے فلسفہ سے زیادہ فلسفیانہ تھی۔ خود فلسفیوں کے باہمی اختلافات کا یہ رنگ دیکھ کر کہ "کوئی عجیب سے عجیب اور انوکھی سے انوکھی بات ایسی نہیں تصور کی جا سکتی جس کا کوئی نہ کوئی فلسفی قائل نہ مل جاتا ہو" وہ طالب علمی ہی سے اس درجہ متوحش وبدگمان تھا کہ اپنی رہنمائی کے لئے علم ویقین کی کوئی ایسی چٹان پا لینا چاہتا تھا جو بجائے خود جہل اور شک وریب کی ہر تاریکی سے پاک ہو تا کہ اس کو نقطۂ آغاز بنا کر اپنے فلسفہ کی عمارت اس پر کھڑی کر سکے لہٰذا اس نے پہلا اصول ہی یہ قرار دے لیا کہ کسی بات کو اس وقت تک قبول ہرگز نہ کرونگا جب تک وہ میرے ذہن کے لئے اس درجہ واضح اور غیر مشتبہ نہ ہو کہ اس میں کسی طرح شک کرنا ممکن ہی نہ ہو۔

اس شک پسندی میں اتنے مبالغہ سے کام لیا کہ محسوسات ومشاہدات سے گذر کر ریاضیاتی براہین تک کو مشکوک ومشتبہ ٹھہرا لیا۔ بقول شوپنہار (SCHOPENHAUR)

کہ وہ تمام مسلمات کو مشکوک سمجھ کر شروع سے شروع کرنا چاہتا ہے۔"

"جن چیزوں کو میں آج تک اعلیٰ سے اعلیٰ صداقت اور یقین پر مبنی جانتا رہا وہ یا تو براہ راست حواس یا ان ہی کی وساطت سے ماخوذ ہیں لیکن حواس کبھی کبھی دھوکا بھی دیتے ہیں، اس لئے عقلمندی یہ ہے کہ جس شئی سے ایک مرتبہ ہم دھوکا کھا چکے ہوں اس پر پورا اعتماد نہ کریں۔

اقلیدس یا ہندسہ تک کی معمولی معمولی باتوں میں بعض آدمی دھوکا کھا جاتے ہیں اور غلط قیاسات قائم کر لیتے ہیں۔ میں خود بھی اسی طرح غلطی کر سکتا ہوں جس طرح دوسرے کرتے ہیں۔ لہذا میں نے تمام ان دلائل کو مشتبہ سمجھ کر رد کر دیا، جن کو پہلے براہین جان کر قبول کر لیا تھا۔ سب سے آخری شبہہ یہ ہوتا ہے کہ جو خیالات ہمارے ذہن میں بیداری کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں بعینہ وہی خواب کی حالت میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں بے اس کے کہ ان میں کوئی بھی صحیح ہو۔ اس لئے فرض کر لیتا ہوں کہ میرے تمام خیالات محض خواب کی باتیں ہو سکتی ہیں۔"

یعنی ہو سکتا ہے کہ ہماری نام نہاد بیداری کی پوری زندگی اور زمین سے آسمان تک کے بظاہر سارے خارج از ذہن موجودات محض ایک طویل خواب ہوں اور خود خواب دیکھنے والے ذہن سے باہر ان کا سرے سے کوئی وجود نہ ہو[1] لیکن ڈیکارٹ (DESCARTES) کی یہ ہمہ گیر شک آفرینی پیرہو کی طرح محض شک و ریب کی خاطر نہ تھی

---

[1] ایک حدیث یاد آگئی کہ "لوگ سو رہے ہیں جب مریں گے بیدار ہوں گے۔" (الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا)

وہ اس شک سے یقین کے ایک ایسے ناقابل شک نقطہ یا ایسی چٹان کو پالینا چاہتا تھا کہ جو علم ویقین کی عمارت کے لئے مستحکم بنیاد بن سکے۔

بے شک تم سارے حواسی ادراکات اور ذہنی خیالات کو محض ایک طویل خواب فرض کر لے سکتے ہو لیکن دوران خواب کے نفس ان ذہنی خیالات کے وجود میں شک کرنا کیسے ممکن ہے۔ اور شک کرو بھی تو خود یہ شک کرنا ہی عین خیال کرنا ہوگا۔ اس کو ڈیکارٹ (DESCARTES) نے اپنے مختصر کلاسکل تاریخی فقرہ میں یوں ادا کیا ہے، کہ "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں"۔ یعنی سوچنا خیال کرنا یا خیال کرنے والی ذات یا میں (انا) کا وجود بجائے خود ناقابل شک وانکار ہے۔ لیکن یہ صداقت کہ "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں"[1] اس قدر قطعی اور اٹل ہے کہ ارتیابیہ SCEPTI کے مبالغہ آمیز سے مبالغہ آمیز مفروضات بھی اس کو متزلزل نہیں کر سکتے لہذا اس کو میں نے اپنے فلسفہ کا وہ اولی واساسی اصول قرار دیا جس کی جستجو تھی۔

الغرض ہو سکتا ہے کہ:۔

"جو کچھ میری آنکھیں دیکھتی ہیں وہ سب غلط ہو۔ میں باور کئے لیتا ہوں کہ میرا حافظہ جن چیزوں کی یاد دلاتا ہے، ان کا بھی کبھی کوئی وجود نہ تھا۔ مجھکو قبول ہے کہ میرے آلات حس کا کوئی وجود نہیں اور جسم، سر و شکل وصورت وغیرہ تمام چیزیں یا من گھڑت ہیں اور خود میرے ذہن کی اختراعات ہیں۔

ان تمام مفروضات کے بعد دیکھو کہ کیا باقی رہتا ہے؟ میں یعنی وہ ذات

---

[1] گو بعضوں نے نفس سوچ یا خیال ہی خیال کے علاوہ خیال کرنے والے "انا" یا "میں" کا بھی انکار کرنے کی کوشش کی ہے، جو مکابرہ سے زیادہ نہیں۔ صرف لفظی ایرپھیر۔ تفصیل کچھ آگے آئے گی۔

جو اس خود فریبی میں مبتلا ہے۔ کیا وہ کوئی چیز نہیں؟ کیا خود میرے اقتباسات خود میرے وجود کو مستلزم نہیں؟ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ میں فریب کھا رہا ہوں اس لئے میں موجود ہوں......... لہٰذا اس قدر بہر حال بالکل بدیہی وقطعی ہے کہ میں ہوں۔ میں کیا ہوں؟ یہ نہیں جانتا، البتہ اتنا یقین ہے کہ میں ہوں۔"

لیکن دراصل میرا یہ وجود ہی میری حقیقت بھی بتلا دیتا ہے۔ اور "میں ہوں" سے ہی "میں کیا ہوں"؟ کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس لئے کہ میں ہوں کے معنی صرف یہ ثابت ہوتے ہیں کہ "میں سوچتا ہوں" یعنی میں ایک سوچنے والی ذات ہوں۔ اس ذات سے مکان وزمان، جسم وجسمانیت کے تمام صفات کی نفی کی جا سکتی ہے۔ مگر نفس فکر وخیال یا سوچنے کو اس سے جہاں منفی یا منفک کیا گیا اس کی ذات یا وجود ہی سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت تک ہوں جب تک سوچتا یا خیال کرتا ہوں۔ اگر میں سوچتا نہیں تو پھر چاہے اور جو کچھ بھی موجود ہو "میں" بہر حال نہیں ہوں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ میں ایک ایسی ذات ہوں جس کی حقیقت وماہیت "تمام تر سوچنا ہی ہے"۔

یہاں ڈیکارٹ کے فلسفہ کی کچھ تفصیل وتنقید مد نظر نہیں[1]۔ صرف اس عظیم حقیقت کی کچھ وضاحت ضروری تھی جس نے نہ صرف جدید فلسفہ کی تاریخ کا رخ سترہویں صدی سے اس حقیقت کے کھل کر سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مادیت کے بجائے فلسفہ کا رخ تصوریت (آئیڈیلزم) کی طرف موڑ دیا، بلکہ اسی صدی سے ترقی کرنے والی جدید سائنس

---

[1] مزید تفصیل وتنقید کے لئے راقم کے مضمون "فلسفۂ جدیدہ کا نقطۂ آغاز" مطبوعہ رسالہ معارف دار المصنفین اعظم گڈھ (نمبر ۱ جلد ۱۰) ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔

کے آئے دن کے ایک سے ایک بڑھ کر محیر العقول نئے نئے انکشافات وایجادات نے بظاہر مادیت ہی مادیت کا جو بول بالا کر رکھا تھا، اس کو بھی بالآخر چار و ناچار اس حقیقت سے دوچار ہونا پڑا کہ

"یار در خانہ و من گردِ جہاں می گردم"

## فلسفہ اور سائنس دونوں کا رخ تصوریت یا روحانیت کی طرف

اب فلسفہ و سائنس دونوں کی نامور شخصیت وہائٹ ہیڈ (WHITEHEAD) کی کتاب "سائنس اور جدید دنیا"[1] میں کچھ پڑھ لیں۔ خود اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس شہادت سے لگائیں کہ "یہ غالباً ڈیکارٹ کے بعد سائنس و فلسفہ کے مشترک CONJOINT موضوع پر سب سے اہم کتاب ہے...... جو سرف سائنس و فلسفہ ہی کی نہیں، مذہب اور فن (آرٹ) کی بھی از سرِ نو تجدید و تعبیر (RE-INTERPRET) کرتی ہے"[2]

"ڈیکارٹ نے بڑی وضاحت کے ساتھ ان عام خیالات کو پیش کیا ہے، جو اس کے بعد سے جدید فلسفہ پر برابر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ ماحصل یہ ہے کہ ایک ادراک کرنے والی ذات یا ذہن (SUBJECT) ضرور پایا جاتا ہے۔ اس ذات کا ذکر وہ ہمیشہ واحد متکلم کے صیغہ میں کرتا ہے، یعنی خود اپنی ذات و ذہن کو اپنی فکر و فلسفہ کا نقطۂ آغاز بناتا ہے۔ یہ ذات اپنے احساسات و خیالات اور اس طرح خود اپنے وجود (یا موجود ہونے) کا ضمنی طور پر

---

[1] (SCIENCE AND THE MODERN WORLD) (مطبوعہ ۱۹۵۳ء)

[2] کتاب بالا کا گردپوش۔

شعور رکھتی ہے۔ اس ذی شعور ذات کو وہ اپنے فلسفہ کا بنیادی نقطہ، آغاز یا مسلّمہ (DATUM) بنا کر آگے بڑھتا ہے۔

پھر اس کے بعد کا سارا جدید فلسفہ کسی نہ کسی رنگ میں اسی نقطہ کے ارد گرد گردش کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس سے پہلے کی دنیا کا ڈراما کائنات خارجی تھی اور جدید دنیا کا ڈراما روح (SOUL) ہے۔"

آگے خود ڈیکارٹ (DESCARTES) سے یہ اقتباس نقل کیا ہے کہ:۔

"اگرچہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جن چیزوں کا میں ادراک یا خیال کر رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ مجھ سے الگ یا باہر ان کا کوئی وجود سرے سے نہ ہو۔ پھر بھی اتنا میں پورے یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ شعور کے وہ احوال (MODES) جن کو میں اپنے ادراکات و خیالات کہتا ہوں وہ ان احوال یا کیفیات کی حد تک بہر حال اور بلا شک و شبہہ میرے اندر (یا شعور۔م) میں موجود ہیں۔"

یہاں تک تو خالص فلسفہ کی بات تھی۔ لیکن:۔

"نظریۂ اضافیت کے حالیہ اثرات کے تحت (سائنس میں بھی خارجی کے بجائے) داخلی (SUBJECTIVE) یا ذہنی ضابطہ سازی (FORMULATION) ہی کا رجحان پیدا ہو گیا ہے[1]۔"

سائنس کے محدود موضوع و مقام کو سن سمجھ لیں کہ:۔

"اس کو اس بات سے کوئی مطلب یا سروکار نہیں کہ کوئی شئی بجائے خود

---

[1] کتاب بالا ص ۱۷۵-۱۷۶

کیا (یا کہاں ہے ذہن میں یا اس سے باہر ہے) ہے یا اس کو موجودات (ENTITIES) کی محض ظاہری (EXTRINSIC) حقیقت یا نوعیت سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی موجود یا کسی شئی کے دوسری اشیا کیساتھ باہمی تعلق سے[1]

ایک اور بات یہاں اس کتاب میں ضمناً پڑھ لیں کہ:۔

"سائنس، مذہب یا دینیات (تھیالوجی) سے بھی کہیں زیادہ تغیر پذیر یا ناپائدار (CHANGING) ہوتی ہے۔ سائنس کا کوئی آدمی گلیلو یا نیوٹن کی باتوں کی غیر مشروط طور پر (یا بلا تعدیل و تحدید) تائید نہیں کرسکتا۔ نہ خود اپنے دس سال قبل والے سائنسی اعتقادات (BELIEFS) کی۔"

وجہ بڑی اس کی یہی ہے کہ سائنس کا تعلق انسان کی ناقص و محدود لازماً ناپائدار علم و عقل پر ہے۔

آگے دیکھئے کہ جدید فلسفہ ہی کی طرح جدید بلکہ جدید ترین بیسویں صدی کی سائنس کو بھی اپنے لئے خود اپنی راہ سے یہی نقطۂ آغاز اختیار کرنے پر کیسا مجبور ہونا پڑا ہے۔ ایڈنگٹن نے "سائنس کی نئی راہیں"[2] نام اپنی کتاب ڈیکارٹ ہی کے ہم وطن بیسویں صدی کے فرانس کے نامور محقق ریاضیات و طبعیات (پوائنکرے) کی کتاب موسوم "سائنس کی قدر و قیمت"[3] کے درج ذیل ذرا طویل اقتباس سے شروع کی ہے:۔

---

[1] ایضاً ص ۱۹ [2] ("NEW PATHWAYS IN SCIENCE")

[3] ("THE VALUE OF SCIENCE")

"انسانی ذہن وعقل کائنات فطرت (نیچر) میں جو ہم آہنگی و استواری پاتی یا دریافت کرتی ہے کیا وہ اپنی ذہن یا عقل سے قطع نظر کرکے بجائے خود فطرت میں موجود ہے؟ قطعاً نہیں۔ ایسی حقیقت جو اس ذہن سے بالکل الگ مستقل بالذات وجود رکھتی ہو، جو اس کا ادراک کرتا اس کو دیکھتا یا محسوس کرتا ہے ناممکن محض ہے، ذہن سے ماورا اگر ایسی خارجی دنیا بجائے خود کوئی پائی بھی جاتی ہو تو ہماری رسائی سے وہ ہمیشہ ہمیشہ باہر رہے گی۔

باقی ہم جس کو خارجی (OBJECTIVE) حقیقت کہتے ہیں وہ صحیح معنی میں نام ہے صرف اس چیز کا جو متعدد یا تمام خیال و ادراک کرنے والوں میں مشترک ہو۔

بس یہ مشترک یا مابہ الاشتراک جز ہی وہ ہم آہنگی ہو سکتی ہے، جو ریاضیاتی ضابطوں یا قوانین (LAWS) کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہے۔"

اور اس "سائنس کی قدر و قیمت" ہی کے بالکل آخری صفحہ پر ڈیکارٹ (DESCARTES) کی آواز بالکل صاف صاف ذرا سن لیں:۔

"وہ سب کچھ جو خیال نہ کیا جا رہا ہو لاشئی محض ہے۔ چونکہ ہم صرف خیال ہی کا خیال کر سکتے ہیں اور تمام وہ الفاظ جو ہم اشیا کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ صرف خیالات ہی خیالات کو ظاہر کر سکتے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ کوئی شئی نفس خیال کے علاوہ پائی جاتی ہے ایک ایسا بے معنی دعوے ہے جس کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔"

آگے خود ایڈنگٹن (EDDINGTON) نے اپنی ایک دوسری کتاب

"نادیدہ دنیا"[۵۱] کے دوسطری اقتباس سے ڈیکارٹ ہی کی طرح سائنسی طور پر خارجی وجود کے بجائے ذہن ہی کی اولیت و مرکزیت کو اس طرح مختصراً واضح کیا ہے کہ:۔

"ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہمارے تجربہ میں آنے والی اولین بات سب سے پہلے اور سب سے براہ راست شئے ذہن (MIND) ہی ہے۔ باقی اس کے ماسوا یا ماوراجو کچھ بھی ہے سب نرا استنباط ہی استنباط (یا قیاس ہی قیاس) ہے"

یہی ابھی ۱۹۵۸ء کی مطبوعہ تاریخ سائنس[۵۲] کی ایک کتاب میں پڑھا کہ:۔

"جس طرح کوپرنیکس (COPERNICUS) نے زمین کی مرکزیت کا خاتمہ کرکے مادی دنیا کو عظیم وسعت و پہنائی عطا کردی تھی۔ اسی طرح مرکزیت زمین سے بڑھ کر مرکزیت مادہ یا پوری مادی و حواسی دنیا کی مرکزیت بحث طلب و مشکوک ہو رہی ہے۔ اور نفسی تحقیق ایک ایسی وسیع تر دنیا کو سامنے لا رہی ہے، جو مادی کائنات کو اس کی مرکزیت کے تخت سے اتار کر ایک محض مقامی حیثیت دیتی جا رہی ہے"

فلسفہ میں ڈیکارٹ (DESCARTES) کو بھی تاریخ فلسفہ کا کوپرنیکس (COPERNICUS) اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس نے خارجیت یا مادہ کی خارجی دنیا

---

۵۱ ("THE UNSEEN WORLD" BY ARTHUR EDDINGTON)

۵۲ ("A SHORT HISTORY OF SCIENCE" BY SIR W. C. DONSPIER) ص ۴۶۶

کے بجائے داخلیت یا ذہن کی داخلی دنیا کو فلسفہ کا مرکز بنا دیا، جس نے چند ہی قدم چل کر بالآخر فلسفہ کی جدید تاریخ میں مادیت کیا برکلے کے لئے سرے سے وجود مادہ کے انکار ہی کا راستہ صاف کر دیا۔

لیکن یہاں ہم کو فلسفہ اور نفسی تحقیق کے علما یا نمائندوں کے بجائے موجودہ سائنس کا فلسفہ سے تعلق سمجھنے کے لئے خود اکابر سائنس ہی سے کچھ اور سن سمجھ لینا ہے۔ سر اڈمنڈ کی کتاب "مکان و زمان"[۱] میں ہے کہ:۔

"پچھلی دو صدیوں کے دوران علمائے طبعیات کا عام رویہ یہ رہا کہ ان کو مابعد الطبعیات کے متعلق کچھ جاننے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں... کیونکہ طبعیاتی نظریات قائم کرنے سمجھنے اور ماننے کے لئے بجائے خود کسی طرح کے فلسفہ کو کوئی دخل ہی نہیں ہوتا۔ فلسفہ کوئی بھی ہو سائنسی مسائل کو اس سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔"

لیکن سائنس یا طبعیات کو اس طرح زندگی سے دور رکھنے کا یہ رجحان حالیہ برسوں میں کمزور ہو گیا ہے کچھ تو اس خواہش کی بنا پر کہ سائنس کو انسانی زندگی و فکر میں زیادہ حصہ لینا چاہئے۔ اور کچھ بلکہ بہت کچھ" اس لئے کہ موجودہ سائنسی لٹریچر خود اپنے اندر مابعد الطبعیاتی مواد رکھتا ہے" اور یہ مواد سب سے بڑھ کر یہی ہے کہ "مثلاً نظریۂ اضافیت کے حالیہ اثرات کے تحت (سائنس میں بھی خارجی کے بجائے) داخلی یا ذہنی (SUBJECTIVE) تشکیل (FORMULATION) کا رجحان پیدا ہو گیا ہے"[۲]

---

[۱] صفحہ ۱۳۲، ۱۳۳ (SPACE AND TIME BY SIR ADMOND)

[۲] سائنس اینڈ ماڈرن بلیف" صفحہ ۱۷۱

یعنی ذہن سے باہر کسی خارجی مادی دنیا کے بجائے خود ذہن یا نفس و روح کی اولیت و اہمیت کو قبول کرنے سے سائنس کو بھی اب مفر نہیں رہا ہے۔ اسی لئے :۔

"اب عام طور پر سائنس یا طبیعیات کے علما کو مادیت کچھ زیادہ اپیل نہیں کرتی، کیونکہ دوسروں سے زیادہ یہ بات ان کو علانیہ نظر آرہی ہے کہ روحانی (SPIRITUAL) یا اخلاقی قدروں کی توجیہ پروٹان و الکٹران سے ناممکن ہے"

خارجی دنیا کے دوسرے مادی موجودات یا اجسام کا ذکر ہی کیا، سب سے پہلے خود اپنے ہی جسم کو لو اور رسل (BERTRAND RUSSEL) جیسے سائنس و فلسفہ کے قران السعدین کی زبان سے سنو کہ :۔

"طبیعیات کی رو سے آج جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہ جس کو اب تک ہم اپنا جسم کہتے یا سمجھتے آئے ہیں، وہ دراصل بڑی دیدہ ریزی سے بنائی ہوئی صرف ایک ایسی سائنسی تشکیل ہے، جس کے مطابق کوئی واقعی طبیعیاتی (فزیکل) حقیقت بجائے خود پائی نہیں جاتی"

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جس ذہن اور اس کے افعال کو تمام تر خود مادہ کا ایک ارتقائی کارنامہ بڑے دعوے کے ساتھ سمجھا سمجھایا جاتا تھا۔

"آج جدید مادہ پرست (MATERIALIST) بننے کی کوشش کرنے والا اپنے کو عجیب کشمکش میں پاتا ہے، کیونکہ جہاں وہ ایک خاص حد تک ذہن کے افعال کو کامیابی کے ساتھ جسم کے افعال کے تابع ثابت کرسکتا ہے وہاں دوسری طرف وہ اس حقیقت واقعہ سے بھی گریز کی راہ

نہیں پاتا کہ جسم بجائے خود محض ذہن کا ایجاد کردہ (INVENTED) ایک سہولت پیدا کرنے والا (CONVENIENT) تصور یا خیال (CONCEPT) ہے۔[۱]

سائنس کا رخ مادیت سے پھیر کر تصوریت یا روحانیت و مذہب کی طرف موڑ دینے والے خود سائنس کے اس انقلابی نقطۂ نظر کو خوب اور بار بار باصرار ذہن نشین کرتے رہنا ہے کہ یہ حقیقت:-

"مسلم ہو جانے کے بعد کہ طبعیاتی (فزیکل) دنیا شعور (CONSCIOUSNESS) سے رابطہ یا وابستگی (LINKAGE) کے بغیر بالکلیہ تجریدی (ABSTRACT) اور بلا واقعیت (ACTUALITY) رہتی ہے۔ شعور یا ذہن ہی کو بنیادی مقام حاصل ہو جاتا ہے...... بجائے اس کے کہ یہ غیر عضویاتی (INORGANIC) فطرت (نیچر) یا موجودات فطرت سے بہت بعد میں ارتقائی تاریخ کی بدولت رونما ہوا ہو"[۲]

## سائنسی راہ سے ذہن و شعور کی نوعیت و حقیقت

رہا یہ سوال کہ خود سائنسی راہ سے ذہن سے باہر مادہ یا مادی موجودات جیسی کائنات کے بجائے بنیادی مقام اب خود جس ذہن یا شعور کو حاصل ہو گیا ہے، خود اس کی کیا نوعیت و حقیقت ہے؟

---

[۱] غالباً یہ اقتباس اوپر بھی کتنی جگہ آ چکا ہے مضائقہ نہیں، اس کی تکرار جتنی ہو کم ہے۔

[۲] "THE NATURE OF PHYSICAL WORLD" (طبعیاتی دنیا کی نوعیت) ص۳۳۲ از ایڈنگٹن (SIR ARTHUR EDDINGTON)

اگرچہ فلسفہ میں جس طرح برکلے (BERKELY) کے دلائل سے زچ ہوکر ہیوم (HUME) نے اپنی ارتیابیت کی لاج قائم رکھنے کے لئے مادہ کی طرح ذہن یا نفس کے وجود کو بھی مشکوک بنانا چاہا کہ ہم کو ذہن کے ذہنی افعال و احوال کے ماوراء انکے کسی مبدء و مصدر کی ذات کے وجود و حقیقت کا کسی طرح کوئی علم نہیں جس طرح ذہن سے باہر کی خارجی دنیا کے متعلق اپنے ذہنی احساسات و ادراکات کے ماسوا مادہ نام جیسی کسی بے ذہن و زندگی شئی کا کوئی علم و ثبوت نہیں۔ کچھ ایسے ہی برٹرنڈ رسل نے یہ کہدیا کہ "ایک طرف ماہر طبعیات ہم کو یہ یقین دلا رہے ہیں کہ مادہ جیسی کوئی شئی سرے سے وجود نہیں رکھتی۔ دوسری طرف ماہرین نفسیات باور کرا رہے ہیں کہ ذہن جیسی کوئی چیز نہیں"۔

سائنس و فلسفہ دونوں کی رسل جیسی نامی گرامی شخصیت کی زبان سے ماہرین نفسیات کا نام لے لگا کر یہ کیسی سراسر قیاس مع الفارق کے مغالطہ و مکابرہ کی دھاندلی والی بات ہے۔ کہاں زندگی و شعور والی ذات سے باہر مادہ جیسی قطعاً بے زندگی بے شعور اندھی بہری ٹھوس ٹھس، کسی شئی کا فرض کرنا اور کہاں زندگی و شعور رکھنے والی ذات کا خود براہِ راست اپنے وجدانی و حضوری وجود کا بدیہی شعور، بات یہ ہے کہ۔ ع:

"میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے"

ورنہ بقول بڑے سے بڑے ماہر سائنس داں کے اس سوال کا کہ "خود ذہن یا اسکی حقیقت و نوعیت ہے کیا؟" جواب بالکل صاف سیدھا ہے کہ:۔

"اس کی نوعیت جو کچھ ہے وہ تم (سوال کرنے والے خود) وجداناً جانتے ہو

لہذا مجکو اس ذات وحقیقت کے بارے میں کچھ اور بتانے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے"[۵۱]

آگے اور صاف صاف:۔

"ہمارا ذہن یا شعور ہمارے لئے بالکل بالذات وبراہ راست حضوری طور پر معلوم ومنکشف ہے۔ اس کی کسی اور دوسری نوعیت کی شئے سے توجیہ کرنے کی آخر حاجت ہی کیا ہے۔ یہ تو خود ہی اپنے وجود اور اس کی نوعیت (نیچر) کو بداہۃً جانتا ہے۔ توجیہ کرنے کی ضرورت تو کائنات کے طبعی (فزیکل) رخ کی ہے، جس کو ذہن سے باہر سمجھا جاتا ہے"[۵۲]

عقلمندوں کی عقل بھی عجیب تماشہ ہے، بارہا خود اپنے کو کیسا کھو دیتی ہے، وہی دیہاتی مثل لڑکا بغل میں دبا ہے اور تلاش کا ڈھنڈھورا شہر میں پیٹا جا رہا ہے! یعنی ذہن وشعور کی توجیہ کے لئے بے ذہن وبے شعور کیا سرے سے بے جان مردہ مادہ کو ڈھونڈھا جا رہا ہے۔ بجائے اس کے کسی اور اعلیٰ ذہن وشعور ہی کو تلاش کیا جائے! آگے "سائنس ومذہب" کے تحت اس پر بحث آرہے گی۔

اور تو اور خود ہمارے آج کے بعض نئے متکلمانہ ذوق والے ساتھی کچھ نہ کچھ نئی سائنسی معلومات سے مناسبت وواقفیت رکھنے والے مادہ کے بجائے روح کے وجود وبقا کے دلائل ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ ڈھونڈھنا اب خود سائنس والوں کو خود مادہ یا اس کے وجود کے دلائل کو پڑ رہا ہے۔ اس گم شدہ نہیں،

---

۵۱ ("THE NATURE OF PHYSICAL WOBLD") از ایڈنگٹن صفحہ ۱۸۰

۵۲ ایضاً صفحہ ۲۷۷

گم کردہ حقیقت کی از سرِ نو نئی سائنس ہی کی راہ سے بازیافت کو ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے۔

یہاں خود سائنسی راہوں اور سائنس دانوں کی زبان سے سن لینے اور خوب یاد رکھنے کی بات یہ ہے، کہ جس طرح خارجی یا نام نہاد مادی کائنات کے بجائے ڈیکارٹ نے سترھویں صدی میں فلسفہ کا نقطۂ آغاز ذہن یا ذہنی کائناتِ شعور کو بنا دیا تھا، اسی طرح آج بیسویں صدی کی سائنس کو اولیت کا مقام خارج یا غیری کے بجائے ذہن یا "انا" ہی کو دینا پڑ رہا ہے۔ یعنی آدمی معمولاً جو یہ سمجھتا ہے کہ ایک میں (انا) ہوں اور ایک میرے انا یا ذہن سے باہر زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ناپیدا کنار دنیا جو اپنے وجود و بقا میں میرے انا و ذہن سے بالکل آزاد اور مستقل خود اپنا وجود رکھتی ہے۔ انیسویں صدی کی سائنسی دنیا میں اس کو اولیت حاصل تھی اور ذہن یا انا گویا مسلمہ طور پر اس کی ارتقائی و ضمنی پیداوار سمجھا جانے لگا تھا۔ یہ منطق اب سائنس کی نظر میں بھی الٹی بن کر رہ گئی ہے جس کی کچھ تفصیل اوپر بھی گذر چکی ہے۔ آگے اس انقلابی منطق و حقیقت کی نوعیت کو اچھی طرح پیش نظر رکھنے کے لئے خارج کی نام نہاد مادی یا "طبعیاتی (فزیکل) دنیا کی حقیقت[1]" نام ہی کی کتاب میں اس کے نامی گرامی سائنسداں مصنف سر ایڈنگٹن ( Sir Artnur Eddington ) سے سن لیں:۔

"یہ بات بار بار باصرار اپنے کو یاد دلاتے رہنا ضروری ہے کہ ہمارے ماحول کا سارا علم جس سے طبعیاتی (فزیکل) دنیا کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے ایسے پیاموں ( MESSAGES ) پر مشتمل ہوتا ہے جو اعصابی

---

[1] ( "THE NATURE OF PHYSICAL WORLD" ) صفحہ ۲۴۴

تاروں کے ذریعہ ہمارے مرکز شعور کو ملتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ پیام مخصوص و منضبط اشاروں کی صورت میں ہوتے ہیں، مثلاً جس کو ہم میز کہتے ہیں، اس سے تعلق رکھنے والے جو پیامات ہمارے اعصاب کے اندر سفر کرتے ہیں وہ بجائے خود نوعی طور پر اس خارجی ( EXTERNAL ) میز کے ذرہ بھر مماثل نہیں ہوتے جو ان پیاموں کو بھیجتا ہے اور ہمارے اندر ذہنی ارتسامات ( IMPRESSIONS ) کی صورت اختیار کرتا ہے، نہ میز کے اس تصور کے جو ہمارے ذہن میں رونما ہوتا ہے۔"

مطلب یہ کہ صورت شکل، رنگ روپ، طول وعرض، سختی وغیرہ کے جس مجموعہ کو ہم عام بول چال میں میز کہتے اور جانتے ہیں ایسی کسی چیز کا خود ہمارے ذہن سے باہر سائنسی طور پر قطعاً کوئی وجود نہیں ہوتا، یہی حال زمین سے آسمان تک کی دوسری ساری موجودات کا ہے جن سے ہم دن رات اپنی زندگی میں دوچار رہتے ہیں کہ سائنس کی رو سے ان میں سے چھوٹی بڑی جاندار و بے جان کوئی شئی بھی ہمارے ذہن سے باہر ایسی قطعاً نہیں پائی جاتی، جیسی کہ ہمارا ذہن ان کو بظاہر محسوس کرتا ہے۔

سائنسی طور پر ذہن سے باہر بس زیادہ سے زیادہ الکٹران پروٹان وغیرہ نام کے مثبت و منفی منتشر برقی ذرات یا بقول رسل کے ان کا مجنونانہ رقص پایا جاتا ہے یہی رقص ہمارے اعصابی پیاموں کے ذریعہ دماغ تک پہنچ کر ہمارے ذہن کی کسی جادوگری یا معجز نمائی سے بے شمار گوناگوں ارضی وسماوی، جماداتی، نباتاتی اور حیواناتی اشیا یا موجودات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن کا بجائے خود ان صورتوں میں ذہن کے

باہر کوئی وجود قطعاً نہیں ہوتا۔ غرض:۔

"ایک سرے پر ہمارے مشاہدہ کے وہ مظاہر ہیں، جو کسی نہ کسی طرح انسان کے شعور تک اس کے اعصابِ جسم کے راستہ سے پہنچتے ہیں، اور دوسرے سرے پر الکٹران پروٹان امواج وغیرہ طبعیات کی وہ چیزیں (ENTITIES) ہیں، جن کو مظاہر کی اصل وہیولیٰ باور کیا جاتا ہے ان کے درمیان ہماری نظریاتی طبعیات ہے، جو اب قریب قریب بالکل ریاضیاتی بن کر رہ گئی ہے"[1]

ذہن اور اس سے باہر کی مفروضہ بے ذہن ذوات، برقی ذرات میں کوئی ربط و تعلق ہے تو وہ براہ راست بالکل نہیں بلکہ بہت دور کے وسائط در وسائط کا۔ یعنی:۔

"اگر ہم جسم کی اعصابی مشین کی سائنسی توجیہ کو مانتے ہیں تو اس کی بنیاد پر خارجی دنیا میں جن چیزوں کے موجود ہونے کا استنباط کیا جاتا ہے اور وہ احساسات جو ہمارے شعور (یا ذہن) کے تجربہ میں آتے ان کا باہمی رابطہ بہت دور واسطہ در واسطہ کا ہوتا ہے"[2]

باقی جو شخص یا فلسفی یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ذہنی احساسات و ادراکات ہی کی سی اشیا ذہن سے باہر بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً:۔

"وہ ذہن سے باہر ایسے ہی حقیقی و واقعی سیب اور اسکے ذائقہ وغیرہ کو

---

[1] ایڈنگٹن کی کتاب ("NEW PATHWAYS IN SCIENCE") ص ۲۵۷

[2] ایضاً ص ۲۸۲

موجود یقین کرتا ہے، جیسا کہ ذہن محسوس کرتا ہے..... یعنی زبان اور خارجی سیب کے ذراتی مکسرات (MOLECULES) کے مابین فعل و انفعال سے جو ذائقہ ذہن محسوس کرتا ہے تو یہ ایسا ہی ہوگا، جیسے دانت اکھاڑنے میں جو درد ہوتا ہے، اس کو دانت اکھاڑنے کے آلہ زنبور میں موجود سمجھا جائے"[1]

جب ہمارے ذہن سے باہر کی نام نہاد مادی اشیا ہی کا وجود تصوریہ (IDEALIST) کے فلسفہ کی طرح آج کی سائنس سے بھی غائب ہو گیا جن کو ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے اور گویا کھلی آنکھوں دن رات دیکھتے رہتے تھے، تو پھر ان برائے نام خارجی اشیا کے طبعی قوانین جن کو قوانین فطرت کہا جاتا تھا اور جن کو بالکلیہ ذہن سے آزاد یا باہر کی مادی دنیا کے قوانین سمجھا جاتا تھا، وہ بھی آپ سے آپ اگر تمام تر نہیں، تو بڑی حد تک انسانی ذہن یا فکر و خیال ہی کے قوانین بن کر رہ جاتے ہیں؛ اس کو بھی ایڈنگٹن ہی کے حوالہ سے ایک دوسری کتاب میں پڑھ لیں[2]۔ کہ:-

"ہمارے اخذ کردہ نتائج (بالا) کے مطابق قوانین طبعیات دراصل خود اس ذہن یا فکر و خیال (THOUGHT) کی بناوٹ یا ڈھانچہ کا خاصہ ہیں جس میں ہم خارجی چیزوں کے علم کا نقشہ قائم کرتے ہیں۔ اس طرح طبعیات (فزکس) کوئی ایسے قوانین دریافت کرنے کی سرے سے صلاحیت نہیں رکھتی، جو خود خارجی (OBJECTIVE) اشیا پر منطبق یا لاگو ہوتے ہوں"

---

[1] "انسان کی شخصیت" ("THE PERSONALITY OF MAN") مصنفہ جی۔ ان۔ ام ماترل ص ۲۷۳

[2] بحوالہ "دی فلاسفی آف فزیکل سائنس" از ایڈنگٹن ص ۲۱۷

خلاصہ ان طرح طرح کی تعبیرات وعنوانات سب کا ایک ہی ہے کہ تازہ ترین سائنسی تحقیقات کی رو سے بھی تصوریتی فلسفہ کی طرح اصل بنیادی واولی حقیقت صرف ذہن رہ گیا ہے۔ ذہن سے باہر کی دنیا اگر یا جو کچھ ہے بھی وہ ذہن سے ماخوذ ( DERIVED ) ومستنبط ( INFERRED ) ہی نہیں، بڑی حد تک اسی کی ساختہ پرداختہ بن کر رہ گئی ہے وجہ بھی صاف وصریح وہی ڈیکارٹ والی ہے کہ نفس وذہن یا ذات وانا کے وجود وثبوت کے لئے کسی دلیل ومنطق کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے وجود کا انکار بلکہ اس میں ادنیٰ سے ادنیٰ شک تک عین اس کا اقرار ویقین بن جاتا ہے کہ انکار وشک کرنے والا ذہن وذات موجود ہے۔ دلیل کی ضرورت کو خارج از ذہن ماسوا الذات یا انا کے ماورا کسی غیر انا کی ہے۔

**ڈیکارٹ نے اپنے ذہن سے باہر نکلنے کیلئے خدا کی ذات وصفات کا سہارا لیا**

خود ڈیکارٹ کو اپنے ذہن وانا سے باہر نکلنے کے لئے خدا کی ذات وصفات کا سہارا لینا پڑا تھا، کہ چونکہ خدا دھوکا نہیں دے سکتا اور میں اپنی ذات وانا سے باہر بھی ایک دنیا صراحتہً وعیاناً محسوس کرتا ہوں، اس لئے وہ واقعتًا بھی وجود رکھتی ہے۔ ورنہ ڈیکارٹ کے خدا پر اعتماد نہ کر کے کوئی انائیہ ( SOLIPSISTS' ) کا یہ مسلک اختیار کر لے کہ پوری کائنات میں صرف اس کی انفرادی ذات وانا کے سوا کہیں کچھ اور قطعاً موجود نہیں۔ تو بقول سر جیمس جینز کے "کوئی دلیل بھی اس کے دعوے کو قطعیت کے ساتھ غلط ثابت نہیں کر سکتی"۔

"لیکن میرے احساسات بتاتے ہیں کہ میرے سوا کچھ اور اجسام ہیں جو میرے ہی جیسے معلوم ہوتے ہیں، اور میرے ہی جیسے احساسات وخیالات

رکھتے ہیں۔ اس طرح بطور ظن غالب مان لیتا ہوں کہ دوسرے اجسام بھی میری ہی جیسی ہستیاں (یا انسان) ہیں۔ اگر ہم اس غلبۂ ظن یا اغلبیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو پھر ہم سب کو انائی (SOLIPSISTS) بن جانے سے مفر نہ رہے"[1]

**اہل سائنس بھی اپنے قید انا سے نکلنے کے لئے اپنے ہی جیسے اور ذہنوں کا ماننا ناگزیر سمجھتے ہیں**

اسی بات پر سر جیمس جینز (SIR JAMES JEANS) سے بھی کچھ بلند پایہ ہی سائنس داں سر آرتھر ایڈنگٹن سے سن لو کہ انائیت (SOLIPSISM) سے بچنے یا خود اپنے انا کے قید خانہ سے باہر نکلنے کے لئے ہم کو اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں یا ذہنوں کا ماننا ناگزیر ہے یعنی سائنس کی :۔

"خارجی طبعی (فزیکل) دنیا کو ماننے کے لئے اپنے علاوہ اپنے ہی جیسے دوسروں کے احساسات کو بھی ماننا ناگزیر ہے۔ جس کا انائیت (سالپسزم) کو انکار ہے اس لئے علمائے طبعیات (فزکس) انائیہ کے شدید مخالف ہیں"[2]

غرض انائیہ کی اتنی بات ماننے سے تو چارہ کار نہیں کہ انفرادی انا کو براہ راست اور ناقابل شک صورت میں صرف اور صرف اپنی ذات یا اپنے ہی احساسات کا شعور ہوتا ہے اور ایسے احساسات کے :۔

"ایک ہی طرح کے یا بہت زیادہ ملتے جلتے مجموعوں یا ڈھانچوں (STRUCTURES) کا مختلف شعوروں (یا اناؤں) میں واقع ہونا بس

---

لہ ("PHYSICS & PHYLOSOPHY" BY SIR ARTHUR EDDINGTON)

(طبعیات اور فلسفہ) ملہ ۲۲ سے "فلاسفی آف فزیکل سائنس"، صہ ۱۹۹

یہی طبیعیاتی (فزیکل) سائنس کا نقطۂ آغاز ہے۔

ان ڈھانچوں کا مختلف شعوروں کے لئے یکساں ہونا ہی بتاتا ہے کہ ان کی کوئی مشترک علت انفرادی شعور سے باہر پائی جانی چاہیئے"۔

بات معقول بس اتنی ہی ٹھہرتی ہے کہ مختلف انفرادی اناؤں یا ذہنوں کے مشترک یکساں احساسات کا سبب یا علت کوئی نہ کوئی ہمارے انفرادی اذہان سے باہر ہونی چاہیئے۔ باقی اس سبب و علت کا بجائے خود غیر ذہنی یا نام نہاد مادی ہونا نہ کسی طرح کسی سائنسی مشاہدہ و تجربہ سے ثابت کیا جاسکتا ہے، نہ کوئی عقل و فہم میں آنے والی بات ہوسکتی ہے، اس لئے بقول ایڈنگٹن ہی کے "یہ کہنا اہل سائنس کا فیشن سا بن گیا ہے؟ کہ طبعیات کو (مابعد الطبعیاتی) اطلاقی و خارجی صداقت (ABSOLUTE TRUTH) سے کوئی سروکار ہی نہیں[1]"۔

یہی سائنسی فلسفہ اسی کتاب میں ذرا پہلے (صـ۱۸۶) پر اور صاف صاف یوں بیان ہوا ہے کہ:۔

"جہاں تک طبعیات کا تعلق ہے، عام طور پر جو سائنسی فلسفہ تسلیم کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ طبعیات کو خارجی دنیا کی اطلاقی صداقت سے کوئی واسطہ و بحث نہیں نہ طبعیات کے قوانین (LAWS) ہی خارجی (OBJECTIVE) دنیا کے قوانین ہیں"۔

## مگر انفعالی ادراکات کا منشا و ماخذ کیا ہے؟

غرض اس طرح خود اپنے ذہن کی دنیا سے باہر قدم نکالنے کے لئے بھی اپنے

---

[1] "فلاسفی آف فزیکل سائنس" صـ۲۱۷

ہی جیسے دوسرے ذہنوں ہی کو موجود ماننا پڑتا ہے نہ کہ مادہ نام کسی بے ذہن وبے شعور حقیقت کو۔ ایک دوسرا راستہ خود اپنے ذہن سے باہر جھانکنے کا اور نکلتا ہے، جو زیادہ قریب کا ہے یعنی اپنے ذہن وشعور میں جو احساسات وادراکات میں پاتا ہوں ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے پیدا ہونے یا کرنے میں میرے ارادہ واختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے آپ سے آپ خیال ہوتا ہے کہ ان کا منشاو ماخذ، سبب وعلت خود ہمارے باہر کی کوئی حقیقت ہے بالفاظ رسل:۔

"اس واقعہ کی بنا پر کچھ ایسے احساسات (SENSATION) کی صورت میں ہم اپنے کو (با اختیار فاعل۔م) کے بجائے منفعل (یا بے اختیار) پاتے ہیں، قدرتی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ ہمارے ان احساسات کے اسباب یا علل (CAUSES) ہمارے ذہن سے باہر پائے جاتے ہیں[1]۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ ذہن سے باہر پائے جانے والے ان علل واسباب کی ممکن صورتیں کیا ہو سکتی ہیں؟

### پھر کر سائنس کو مادہ کے بجائے ذہن ہی کی اولیت کا اقرار کرنا پڑا

یہ خیال کہ چیزوں کو انفعالی یا غیر اختیاری طور پر معمولاً ہم اپنے مختلف داس یا جسمانی آلات حس سے جیسا محسوس کرتے ہیں، وہ ہو بہو ویسی ہی ہمارے احساس کے بغیر یا احساس کرنے والے ذہن سے باہر پائی جاتی ہیں۔ فلسفہ میں تو اس خیال کو برکلے[2] نے باطل کیا کہنا چاہیے کہ سرے سے بے معنی

---

[1] صفحہ ۶۴ (OUR KNOWLEDGE OF THE EXTERNAL WORLD)

[2] تفصیل کے لئے برکلے کے نام ہی سے اس کے حالات وخیالات یا فلسفہ پر اس کے فلسفہ کی (باقی صفحہ ۱۸۶ پر)

گرد کھایا کہ ذہنی احساس و ادراک کی کوئی شئی بھی ذہن سے باہر یا بلا ذہن کے پائی جائے۔ یہ کہنا یا ماننا تو بہ الفاظ دیگر یہ دعوے ہوگا کہ کوئی احساس بلا احساس پایا جاسکتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ صریح لفظی تناقض ہے۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنا کہا جاسکتا ہے، کہ ذہن سے باہر یا اسکے نفس احساس و ادراک کے بغیر اس احساس و ادراک کا کوئی ایسا منشا و ماخذ یا علت و سبب پایا جاتا ہو جو بجائے خود کوئی ذہن یا احساس و ادراک کیا اس کے مماثل تک نہ ہو کیونکہ کوئی احساس و ادراک بہ حیثیت ادراک و احساس کسی دوسرے ادراک و احساس ہی کے مماثل یا مانند تو ہو سکتا ہے[1]۔ گویہ عقل میں آنا بھی بے عقلی کے بغیر دشوار ہی ہے، کہ کوئی شئی کسی طرح ایسی ہو یا بن جائے جیسی اپنی ذات و نوعیت میں قطعاً نہیں۔ راستہ بھی اس حماقت یا بے عقلی کی بات سے نکلنے کا ایک ہی اور وہی ہے جس کی طرف برکلے ہی نے رہنمائی کی۔ یعنی جیسا ہم خود اپنی ذات کو بلا کسی استدلال و استنباط کے وجداناً و بداہتہ" ایک ذہن یا شعور ادراک یا علم و ارادہ اور قدرت والی ذات جانتے اور پاتے ہیں بس ویسی ہی مگر کامل بلکہ نامحدود علم و ارادہ اور قدرت والی ذات اپنے شعور و ادراک کے سارے ذہنی اور بظاہر خارج از ذہن کہ علت و سبب قرار دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ خود ذہن و شعور بلکہ سرے سے زندگی تک سے عاری مادہ نام کسی شئی کو ادنےٰ شعور و ادراک یا عقل و علم کے اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی ذہن کے مظاہر کا مصدر و مبنیٰ ٹھہرانے کے سراسر احمقانہ ظن و خوض میں مبتلا ہوا جائے۔

---

(باقی صفحہ ۱۸۵ کا) اصل کتاب کا ترجمہ "مبادی علم انسانی" کے نام سے از راقم ہذا اور "مکالمات برکلے" کے نام سے دوسری کتاب کا دریابادی کے قلم سے دیکھا جاسکتا ہے۔

[1] اس بحث کے سلسلہ میں "مذہب اور عقلیات" احقر کے پرانے لکچر پر بھی نظر فرمائی جائے۔

اور آپ نے اوپر ہی دیکھ لیا کہ وہی سائنس جو ابھی کل (پچھلی صدی تک) اس ظن خوض کی سب سے بڑی پشت پناہ سمجھی جاتی تھی آج اسی گھر کے بھیدی نے اس کی لنکا ڈھا دی ہے۔

ماحصل گھر کے اس بھیدی سائنس کی عین سائنسی طریقوں سے تحقیق کا یہ ہے کہ مثلاً میں جس گھر میں جس کرسی پر بیٹھا جس قلم سے لکھ رہا ہوں اور یہ قلم جس کاغذ پر جس ہاتھ سے حرکت اور یہ ہاتھ جس انسانی جسم کا ایک عضو ہے، ان میں سے کوئی چیز جوں کی توں تو کیا ان سے ادنیٰ سے ادنیٰ کوئی مماثلت و مشابہت رکھنے والی تک خود میرے ذہن سے باہر یا اس کے شعوری ادراکات و احساسات سے ماورا قطعاً کوئی نام و نشان نہیں رکھتی بس زیادہ سے زیادہ مثبت و منفی برقی بار رکھنے والے ایسے ذرات کا بقول رسل ایک دیوانہ وار رقص پایا جاتا ہے جن کو وجود کے عام مفہوم میں بقول ہیزنبرگ (HEISENBERG) موجود تک کہنا یا سمجھنا دشوار ہے۔ یہی ذرات ایسے ہی ذرات سے بنے ہوئے ہمارے جسم اور اس کے اعصاب اور ان اعصاب کے ذریعہ ایسے ہی ذرات والے ہمارے دماغ سے رابطہ پیدا کر کے خود ذہن کی کسی کیمیاگری و جادوگری سے وہ صورتیں اختیار کر لیتے ہیں، جن کو میں اس وقت اپنا گھر اس کے بام و در، اپنا، اپنا میز و کرسی، قلم و کاغذ اور خود اپنے دست و پا یا جسم کی صورت میں محسوس کر رہا ہوں۔ یہی صورت و نوعیت زمین سے آسمان تک کی ساری بظاہر ذہن سے باہر کی ناپیداکنار خلا یا مکان میں پھیلی ہوئی حد شمار سے باہر جاندار و بے جان موجودات کی ہے۔

پھر رہیت کے ایک ذرہ سے لے کر اربوں کھربوں سورج، تاروں، سحابیوں وغیرہ اجرام سماوی کے وہم و خیال میں نہ سمانے والے افسانوی قد و قامت کے اجسام میں

دیوانہ وار رقص کرنے والے ان بے مقدار ذروں کی جو حیثیت ہے اس کا اندازہ او پر خود اپنے جسم ہی سے ہو چکا، کہ اس کے ان ذرات کی درمیانی جگہ یا خلا اگر بالکل نکال دی جا سکے تو ہمارے ۵، ۶ فٹ کے پورے لمبے چوڑے قد و قامت کی بساط ایک دھندلے سے دھبہ سے زیادہ نہیں رہتی۔

سوال یہ ہے کہ میں میز کرسی، قلم کاغذ وغیرہ اور خود اپنے جسم اس کے اعضاو جوارح ہاتھ پاؤں وغیرہ کی جو شکل وصورت، رنگ وروپ محسوس کرتا ہوں اور ذہن کے باہر فی الواقع برقی ذرات کے بے جان وبے ذہن ایک دھبہ اور ان کی درمیانی خالی جگہ سے زائد کچھ نہیں، تو ایسے ہی ذرات سے بنے ہوئے اعصاب کی راہ سے ایسے ہی ذرات سے بنے ہوئے دماغ تک پہونچ کر وہ شعور وادراک وغیرہ کے بالکل مختلف نوعیت کے ذہنی افعال کی صورت آخر کیسے اختیار کر لیتے ہیں؟ اور ذہنی افعال بھی کیسے کہ یہی بے ربط زندگی تک سے محروم ذرات افلاطون وارسطو، ڈیکارٹ وبرکلے، نیوٹن وآئنسٹائن جیسے فلسفی اور سائنس داں بن جاتے ہیں!

اب موجودہ سائنس کے فلسفیانہ مضمرات کی رو سے سمجھایا یہ جاتا ہے کہ بیشک بجائے خود ذہن وزندگی سے قطعاً محروم ان ذرات سے ذہنی اعمال ومظاہر کے ظہور و صدور کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ بلکہ خود ہمارا ذہن اپنے کسی معجزہ یا جادو سے ان کو خلق کر لیتا ہے، باقی ذہن کو جو گویا آئینہ کی طرح اپنے سے باہر کی اشیا کا محض ایک عکس گیر منفعل آلہ تصور کیا تھا اب سائنسی تحقیقات نے غلط ثابت کر دکھایا۔ ذہن خود ایک ایسی فعال وخلاق ذات ہے، جو ہمارے احساسات کی خارجی دنیا کی اگر بالکلیہ بلا شرکت غیرے خالق نہیں ہے تو بس اپنے ذہن سے باہر کی موجودات میں جس رنگ وروپ، شکل وصورت، قد وقامت افعال و

خواص وغیرہ کو ہم محسوس کرتے ہیں، وہ بہر حال نام نہاد مادی یا برقی ذرات کا کرشمہ نہیں ہو سکتے بلکہ کسی نہ کسی طرح خود ذہن ہی کی کیمیا گری ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے ذہن سے باہر کی ان موجودات میں سب سے قریب خود ہمارے اپنے جسم کے متعلق رسل کی یہ سائنسی شہادت آپ پڑھ آئے اسی کو پھر دہرا لیں کہ:۔

"طبیعات کی بنیاد پر آج جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہ جس کو اب تک ہم خود اپنا جسم کہتے آئے ہیں وہ درحقیقت بڑی دیدہ ریزی سے بنائی ہوئی ایک ایسی سائنسی تشکیل ہے جس کے مطابق کوئی واقعی (یا خارجی) طبیعاتی (فزیکل) حقیقت پائی ہی نہیں جاتی۔"

تو پھر خود اپنے جسم کے علاوہ دوسرے ایسے طبیعاتی اجسام کے کسی واقعی یا خارجی وجود کا سوال ہی کیا رہا، اور جب نفس ایسے طبیعاتی اجسام ہی کا وجود ہی نہیں، تو انکی کسی طرح کی خاصیات یا طبعی قوانین فطرت کی حقیقت بھی خود ذہن یا فکر ہی کے قوانین کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ اس کو بھی ایڈنگٹن ہی جیسے عظیم سائنس داں ہی زبان سے سن لیں کہ:۔

"طبیعات کے قوانین خود فکر (THOUGHT) کی اس ساخت یا سانچہ (FRAME) کی خاصیت (PROPERTY) ہیں جس سے ہم خارجی مظروفات (CONTENT) کا نقشہ بناتے یا استحضار کرتے ہیں (RE PRESENT) اور اب تک طبیعات ایسے قوانین معلوم کرنے میں ناکام رہی ہے، جو خود خارجی مشمولات یا اشیاء پر عائد یا لاگو (APPLY) ہوتے ہوں[1]۔"

یہی حقیقت ایک "تاریخ سائنس" میں بھی اس طرح دہرائی ہے کہ:۔

---

[1] ص ۲۷۳ (THE PERSONALITY OF MAN) "بحوالہ فلاسفی آف فزیکل سائنس ص ۲۱۔ از ایڈنگٹن

"سائنسی تحلیل (ANALYSIS) کے لئے ذہنی تعلقات (CONCEPTS)
بہر حال ناگزیر ہیں اور (اشیا کے مابین ۔م) جن روابط و علائق (RELATIONS) کو
قوانین فطرت کہا جاتا ہے وہ نام ہیں ذہنی تعلقات ہی کے مابینی علائق کا نہ کہ ذہن
سے باہر خارج (کچھ مادی نوعیت کے ۔م) ٹھوس حقائق (CONCRETE PEALITIES)
کے مابینی تعلقات یا روابط کا۔"[1]

اسی تاریخ سائنس میں اگلے صفحہ پر اور پڑھ لیں کہ:۔

"ہو سکتا ہے کہ سائنس کے قواعد و ضوابط (REGULARITIES) خود
ہمارے مشاہدہ و تجربہ کے طریقوں سے اس میں پیدا ہو جاتے ہوں مثلاً سفید روشنی
جو بجائے خود ایک غیر منضبط یا بے ترتیب اختلال ہے، اس میں نظم و انضباط طیف
(PRISM) یا منشور (GRATING) کے ذریعہ اس کو چھاننے سے پیدا ہو
جاتا ہے ..... روتھر فورڈ[2] (RUTHERFORD LORD) اپنے نزدیک جس مرکزہ
(NUCLEUS) کو دریافت کر رہا تھا ممکن ہے کہ فی الواقع اس نے خود ہی پیدا کر لیا
ہو۔ جدید ترین نقطۂ نظر کی رو سے جوہر (SUBSTANCE) غائب ہو چکا ہے۔
اور ہمارے پاس صرف صورت (FORM) ہی صورت رہ گئی ہے۔ کوانٹم نظریہ کی
رو سے امواج اور اضافیت کی رو سے خمیدگی۔ (CURVATURE)"

اور بھی زیادہ صاف صاف اس سے پہلے کے ایک طبیعات و ریاضیات کے جامع محقق

---

[1] ص۱۰۲ ("A SHORT HISTORY OF SCIENCE" BY DUMPIES)

[2] ("RUTHERFORD MAY HAVE CREATED THE NUCLEUS HE THOUGHT HE WAS DISCOVERING")

عالم سائنس پوانیکرے (PONICARE) کی کتاب "سائنس کی قدر و قیمت" کے بالکل آخری صفحہ (۱۴۲) پر بطور خلاصہ اس کے پرانے ہم وطن ڈیکارٹ (DESCARTES) کی بولی میں پڑھ لیں کہ "کسی شئی کے وجود کے معنی کسی کے خیال میں پائے جانے ہی کے ہیں[1] ورنہ پھر وہ لاشئی محض ہے"

"وہ سب کچھ جو خیال نہ کیا جا رہا ہو لاشئی محض (PURE NOTHINGNESS)

ہے ہم چونکہ صرف خیال ہی کا خیال کر سکتے ہیں اور تمام وہ الفاظ جو ہم اشیا کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہ خالص خیال ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ کوئی شئی خیال کے علاوہ پائی جاتی ہو ایسا دعویٰ ہو، جس کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔"

جدید سائنسی دور میں انیسویں صدی کے آخر آخر تک یہی "بے معنی دعوے" "مادہ یا مادیت" مادہ پرستی کے نام سے کہنا چاہیے کہ زبان زد عام و خاص مسلمہ بن چکا تھا بیسویں صدی کی خود سائنسی فکر نے بڑی حد تک اس الٹی منطق کو سیدھا کیا ہے کہ اولیت و اہمیت کا اصل مقام مادہ یا ذہن سے باہر کسی مادی دنیا کو نہیں بلکہ خود ذہن کو حاصل ہے، مادیت یا مادہ پرستی اس کے خلاف الٹی گنگا بہانے کا نام تھا کہ ذہن سے باہر ایک بے ذہن بلکہ سرے سے بے زندگی نام نہاد کوئی مادی جوہر ایسا پایا جاتا ہے کہ زندگی و ذہن سب خود اس کی ضمنی و ارتقائی مخلوق ہے۔ جدید سائنس کی اس فکری کایا پلٹ پر بہ تکرار بہ اصرار بار بار زور دینا اس لیے زیادہ سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ایک طرف خود سائنس میں ذہن سے ماورا پرانے مادہ جیسے کسی جوہری حقیقت کے وجود کا نام لینا تک دشوار ہو چکا اور مادہ پرست (MATERIALIST) ہونا تنگ سائنس بن گیا ہے۔

سائنس اور "نادیدہ دنیا" نام اپنی کتاب میں ایڈنگٹن کے بقول کہ :۔

---

[1] زیادہ صحیح تعبیر "خیال کے بجائے" علم میں پائے جانے کی ہو گی۔ تفصیل کلامیات قرآن کے باب "خلاقیت قرآن" میں ان شاء اللہ آئے گی۔

"مادیت یا مادہ پرستی اپنے لفظی معنیٰ میں مدت ہوئی مر چکی ہے ...
آج کل دنیا میں ہر چیز کے مظاہر (MANIFESTATIONS) میں تحلیل
یا تحویل (REDUCE) کرنے کا رجحان نہیں رہا ہے۔ کیونکہ طبعیات
(فزکس) کی دنیا میں مادہ اب بہت گھٹیا (MINOR PLACE) کی چیز رہ گئی ہے"

## انکار مادیت کے باوجود دنیا بھر میں مادیت کا شور و غوغا؟

لیکن دوسری طرف عملاً اس نئی سائنس کی نئی دنیا (امریکا) اور پرانی دنیا (یورپ) میں مادہ پرستی کا نقارہ روز بروز اس زور سے پیٹا جا رہا ہے[1] کہ غریب نئی سائنس کے نئے فلسفہ و فکر کی طوطی کی آواز کان لگائے بھی سنائی نہیں دیتی اور تو اور روس نے ہیگل (HEGEL) جیسے انتہائی اطلاقی تصوریت (ABSOLUTE IDEALISM) کے قائل کا نام جدلیاتی (DIALECTIC) مادیت یا مادہ پرستی سے جوڑ دیا! اس غیر سائنسی ذہنیت کے حقیقی اسباب کی بحث تو انشاء اللہ آگے آئے گی یہاں "جدید سائنس اور اس کے فلسفہ[2]" پر ایک اور نامور محقق سائنس فلپ فرانک کا ذرا طویل اقتباس ملاحظہ ہو کہ خود سائنس اپنی تازہ ترین تحقیقات و اکتشافات کی رو سے مادہ و مادیت کے فلسفہ کے بجائے نفس روح یا ذہن کی اولیت و اہمیت کی طرف مڑ کر روحانیت یا تصوریت (آئیڈیلزم) کے فلسفہ کی صاف صاف بولی کس طرح بولنے پر اپنے کو بے بس پا رہی ہے۔

"اضافیت کے طبعی (فزیکل) نظریہ نے ثابت کر دیا ہے کہ برقی مقناطیسی

---

[1] اور ان کے نقال نام نہاد نو آزاد ملک اپنے پرانے آقاؤں کی نقالی میں ان سے بھی آگے نکل کر ذہنی غلامی میں ترقی کرتے جا رہے ہیں اور دوڑ میں مسلمان نو آزاد ملک دوسروں کو بھی ہرا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

[2] "MODERN SCIENCE AND ITS PHILOSOPHY"

(ELECTRO-MAGNATIC) قوتیں حقیقی قطعاً نہیں (ARE NOT REAL AT ALL) بلکہ محض خود ہمارے ذہن کی ساختہ پرداختہ ہیں (MERE CONSTRUCTIONS OF OUR OWN MIND) اور یہی حال نیوٹن کی قوت کشش اور انرجی (ENERGY) وغیرہ تمام دوسرے ایسے تصورات (CONCEPTS) کا ہے..... کہ یہ سب محض ذہن کے خانہ ساز ہیں اور خارجیت (یا ذہن سے خارج موجود ہونے) کے معیار پر پورے نہیں اترتے ("DO NOT THEN PASS THE TEST OF "OBJECTIVITY")

حد یہ کہ:۔

"اگر مادہ پرستوں کو یہ بتانے پر مجبور کیا جائے کہ اب وہ دنیا کے کتنے حصّہ (PART) کے مادی ہونے کا دعویٰ (CLAIM) رکھتے ہیں، تو ان کا ممکن جواب فقط یہ ہوگا (WOULD SEEM TO BE) کہ بس صرف مادہ مادی ہے"۔

پھر آج کی طبعیات (فزکس) چونکہ خالص (PURE) نظری ریاضیات سے زیادہ وابستہ ہو گئی ہے، اس لئے وہ اور بھی خارجی مادہ یا مادیات کے بجائے اشیا کے ذہنی وجود ہی کے قریب تر ہو گئی مثلاً اگلے ہی صفحہ (۲۰۱) پر ہے کہ:۔

"کشش کا نظریۂ اضافیت چونکہ خالص (PURE) ریاضیات سے زیادہ وابستہ ہے اس لئے یہ اور بھی ہم کو مادیت کے بجائے اشیا کے ذہنی وجود (MENTATION) ہی سے زیادہ قریب کر دیتی ہے۔ اور یہی

طبیعیاتی (فزیکل) سائنس کی بہت زیادہ حالیہ (RECENT) ترقیوں کی بنا پر بھی کہا جاتا ہے[۱]۔

یعنی طبیعیاتی سائنس کے عہدِ حاضر کی جدید ترین ترقیاں ہم کو مادیت کے بجائے تصوریت (آئڈیلزم) کے فلسفہ کی طرف لے جا رہی ہے۔

بہرحال، جہاں تک خالص فلسفہ کا تعلق ہے، اس کی پوری تاریخ میں — نئی ہو یا پرانی — کہنا چاہیئے کہ مادیت کو سر اٹھانے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ پورے زور کے ساتھ کھل کر سامنے آنے کا موقع مادیت کو گذشتہ انیسویں[۱۹] صدی کے دوران جدید سائنسی ترقیوں کے ناسنجیدہ عنفوانِ شباب کی جلد بازی میں مل گیا تھا جس کے نتیجہ میں اس طرح کی بے باکانہ باتیں بعض اکابر سائنس کی زبانوں سے "مذہب اور عقلیات" میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ "ہم (اہلِ سائنس) نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار کر دیا" یا "مادہ اور قوانینِ مادہ نے عقیدۂ خلق (GENESIS) اور روح کے وجود کو باطل کر دیا"۔

پھر سائنس کے نظریات سے زیادہ کم و بیش عوام و خواص سب کے ذہنوں کو سائنسی ایجادات و اکتشافات نے مرعوب کیا۔ ریل، تار، برق، بھاپ وغیرہ کے کارنامے اچھے اچھوں کی عقل کو حیران کر دینے کے لئے کافی تھے۔ اس سے بڑھ کر سائنس نے زمین کو تول کر اس کا وزن معلوم کر لیا۔ روشنی کی شرح رفتار بتا دی۔ مریخ میں دریا پہاڑ اور آبادی کی نشاندہی کرنے لگی، اور اب تو چاند پر اترنے کے لئے کمند پھینک رہی ہے[۲]۔ تو جو علم ایسے معجزے دکھا سکتا ہے

---

[۱] "جدید سائنس اور اسکا فلسفہ" (MODERN SCIENCE AND ITS PHILOSOPHY)

[۲] اور اب تو جولائی ۱۹۶۹ء سے جنوری ۱۹۷۱ء تک امریکہ کے "کمند باز" تین بار چاند پر اتر کر خیریت سے واپس بھی آ چکے ہیں۔

جب اس نے مذہب کو سرحد باہر کر دیا تو پھر اب کیا رہا۔ اس مرعوبیت کا آج تک یہ عالم ہے کہ نفس یورپ یا سائنس کا نام لے لینا ہی کسی بات کو منوانے کے لئے سب سے کارگر دلیل بن جاتی ہے[۱]۔

ماحصل اس دور کی بلند بانگ نظری مادیت کا یہ رہا کہ اصلی حقیقی و بنیادی وجود صرف مادی ذرات یا سالمات (OBVIOUS) کا ہے۔ کائنات میں جہاں کہیں اور جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، سب ان بنیادی مادی ذرات ہی کی ترکیب و تعامل کا کرشمہ ہے۔ زندگی و ذہن عقل و شعور وغیرہ تک جن کو روح یا نفس نام ایک غیر مادی ذات و حقیقت کے افعال خیال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی تمام تر ذرات مادی ہی کے اجتماع اور ترکیب و تعامل کے نتائج ہیں۔ باقی خود یہ مادہ اور اس کی قوت یا ازجی دونوں ازلی اور غیر مخلوق ہیں۔ اور اس لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں کہ ایک کا دوسرے سے انفکاک یا جدا ہونا ناممکن ہے[۲]،،

"اس مادہ اور قوت ہی کے بندھے ہوئے مقررہ طریق عمل اور اصول کا نام فطرت (نیچر) اور قوانین فطرت (لاز آف نیچر) ہے۔ ساری کائنات ارضی و سماوی اس مادہ اور اس کے قوانین فطرت کی پیداوار ہے۔ اس کے علاوہ یا ماسوا کسی مستقل و موجود صاحب خلق و امر ذات یا خدا کی احتیاج قطعاً نہیں، قوانین فطرت خود بخود ہی خداؤں کی مداخلت کے بغیر سب کچھ کر لیتے ہیں۔ مادہ خالی ہیولیٰ یا محض منفعل ذات نہیں، جیسا کہ فلاسفہ اس کی تصویر کھینچتے ہیں بلکہ وہ بجائے خود ایسی مادر کائنات ہے جو اپنے رحم ہی سے تمام نتائج برآمد کر لیتی ہے[۳]۔،،

---

۱ ۲ یہ تمام اقتباسات "مذہب و عقلیات" سے ماخوذ ہیں۔

۳ ایضاً

یہ ابھی صرف ۷۰۔۸۰ سال پہلے گئی صدی کے اواخر تک کی سائنسی مادیت کے طبل بلند بانگ کی گونج تھی۔ لیکن آپ اوپر کافی تفصیل سے پڑھ آئے کہ یونانی دیمقراطیسی کے جس ایٹم یا سالمہ کو ابھی انیسویں صدی کے اوائل ہی میں جان ڈالٹن نے از سرِ نو تازہ زندگی بخشی تھی، اس کی ٹھوس ٹھس مادیت کی سالمیت کا خاتمہ صدی کے خاتمہ سے بھی پہلے ہی ہو گیا پھر اس کی ٹوٹ پھوٹ ہو کر اندر سے الکٹران پروٹان وغیرہ کچھ ایسے برقی ذرات برآمد ہوئے جن کی بنا پر اس مادی ایٹم کو غیر مادی (IMMATERIAL) کہا جانے لگا۔ یعنی پرانا مادہ بہر حال نہ رہا۔ اس سے آگے بڑھ کر ان نو دریافت ذرات کو مادی ذرات کے بجائے محض واقعات (EVENTS) یا زیادہ سے زیادہ "ذرات۔ واقعات" تک کہا گیا حد یہ کہ سرے سے ان کو وجود سے متصف کرنا یا موجود تک کہنا دشوار معلوم ہوا۔ باقی ان برقی ذرات یا خود برق کی بجائے خود کیا حقیقت و ماہیت ہے، یہ آج تک نا معلوم اور مستور ہی ہے۔

## حالانکہ اب سائنس ذہن سے باہر کسی وجود کی قائل نہیں

اور بالآخران مستور الحال ذرات کا کچھ چیستانی وجود مان بھی لیا جائے، تو بھی زمین سے آسمان تک کی جاندار و بے جان یا شعور و بے شعور دن رات کی آنکھوں دیکھی یا جسمانی آلاتِ حس کے ذریعہ جانی پہچانی جس اتھاہ دنیا کو ہم جسمانی یا مادی کہتے سمجھتے آئے تھے اب سائنس کی رو سے مسلمہ طور پر ہمارے احساس و ادراک کرنے والے ذہنوں سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں رہا۔

باہر اگر کچھ ہے تو کچھ ذرات کا صرف "مجنونانہ رقص" (MAD DANCE) یہی جنونی رقص جب ہمارے ذہنوں سے تعلق پیدا کرتا ہے، تو خود ذہن ہی اپنے کسی نہ کسی سحر سامری

سے اس نام نہاد خارجی جسمانی کائنات کو وہ رنگ وروپ دے دیتا ہے جس کو آج سے ۰۰، ۸۰
سال قبل کے سائنس داں یا مادہ پرست (MATERIALIST) بڑے دم دعوے کے
ساتھ ـــ جیسا اوپر سن چکے ـــ بالکلیہ خارجی مادی وجود رکھنے والے سالمات کی ترکیب و
تعامل کا آفریدہ بتاتے تھے۔ ذہن تک کے سارے اعمال وافعال کو ان ہی مادی سالمات کا
کرشمہ قرار دیتے جو بذات خود زندگی وشعور کے کسی شائبہ تک سے محروم ہیں۔

غرض آج کی سائنس خصوصاً طبعیات (فزکس) کو چار وناچار جس مابعد الطبعیات یا
فلسفہ سے خود سائنس ہی کی راہوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ وہ پرانی اصطلاح میں مادیت
کے بجائے روحانیت یا تصوریت (IDEALISM) (آئیڈیلزم) یا مزید احتیاط
سے بعضوں نے اس کو ذہنیت[1] (MENTALISM) سے تعبیر کیا ہے یعنی ذہن سے
باہر جس کائنات کو ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے اور تمام تر باہر ہی کی کسی قطعاً بے ذہن و جان
مادہ نام شئی کی مخلوق قائلین مادیت ٹھراتے اور ذہن کو گویا محض ایک منفعل یا عکس گیر آلہ
جانتے رہے، اب ذہن ہی کسی نہ کسی طرح ہماری پوری مرئی ومحسوس کائنات کا خالق ثابت
ہو رہا ہے اور مادہ کا حصہ اگر کچھ نکلتا بھی ہے، تو برائے نام، یا کم از کم۔ اور۔

"ہماری محسوس و مرئی دنیا کا جوں کا توں وجود خود ہمارے احساسات، ذہن سے
باہر تو کسی طرح ثابت نہیں رہا ہے۔"

اس موڑ تک پہونچ کر آپ سے آپ سائنسی فلسفہ کا رخ مادیت کے بجائے تصوریت
کی طرف مڑ گیا ہے اور کائنات کی تعمیر و تشکیل یا تخلیق بجائے اس کے کہ ذہن سے باہر مادہ

---

[1] "ذہنیت" گو اردو میں عام طور پر (MENTALITY) کے لئے چلا ہوا ہے۔ لیکن
(MENTALISM) کے لئے بھی اس کے علاوہ کوئی دوسرا موزوں تر لفظ نہیں ملا۔

نام کسی بے ذہن ذات کا کارنامہ ہو اور ذہن فوٹو کی پلیٹ کی طرح اپنے اندر خارجی دنیا کی محض تصویر اتارتا رہتا ذہن خود ہی اس کا خالق یا صورت گر ثابت ہوا۔ پرانی مادیت کے اس طرح کھوکھلے اور بے جان ثابت ہو چکنے کے بعد موجودہ سائنس کے لئے اب فلسفہ سے دوری و بیزاری کیا، بے نیازی کی بھی گنجائش نہیں رہی ہے۔ اس صورت حال کا اندازہ سائنس و فلسفہ دونوں کی مسلمہ شخصیت برٹرنڈ رسل کے اس بیان سے کریں۔ بلاشبہ سائنس اپنی غیر معمولی کامیابیوں کے زعم و جوش میں آکر جدید دور میں فلسفہ سے سرد مہری برتنے لگی تھی:۔

"لیکن حال حال میں خود اپنے مسائل (PROBLEMS) کی راہ سے از سرِ نو فلسفہ میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔ خصوصیت سے نظریۂ اضافیت کی بدولت جس نے زمان و مکان کی دوئی ختم کر کے ان کو "مکان ـــ زمان" کے واحد نظامِ واقعات میں مدغم کر دیا ہے[1] نیز کوانٹم نظریہ کی بنا پر بھی جو بین طور پر حرکت کے عدم تسلسل (DISCONTINUOUS MOTION) کو مستلزم ہے۔"

وجہ اس کی ہیزن برگ کے الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

"انیسویں صدی کے سائنس دانوں کے نزدیک نفسیاتی (یا ذہنی ـــ م) مظاہر کی کوئی توجیہ دماغ (BRAIN) کی طبعیات و کیمیا سے ہو جا سکتی تھی، لیکن اب کوانٹم نظریہ کی رو سے اس کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ بلکہ کوانٹم نظریہ فطرت (نیچر) کی کامل خارجی تشریح کی بھی اجازت نہیں دیتا۔"[2]

---

[1] (SINGLE SPACE-TIME ORDER OF EVENTS)

[2] (فزکس اینڈ فلاسفی ص ۹۵ و ۹۶)

خارجی تشریح کا مطلب دراصل مادی تشریح ہے،

بہر حال :-

"اب فلسفہ اور سائنس اپنی مسلح (ARMED) ناجنبہ داری (NEUTRALITY) کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ یا تو ان کو دوست بن جانا چاہیئے یا دشمن۔ اور دوست بے اس کے نہیں بن سکتے کہ سائنس، وہ امتحان پاس کرے جو اس کے مقدمات کے متعلق فلسفہ ہی کو لینا چاہیئے"[۱]

باقی اگر یہ :-

"دوست نہیں بن سکتے تو پھر صرف ایک دوسرے کو برباد ہی کر سکتے ہیں۔ یہ اب ممکن نہیں رہا ہے کہ میدان کسی ایک کے ہاتھ رہے"[۲]

اصل میں فلسفہ کا رخ و رجحان ہمیشہ ہی مادہ و مادیت کے بجائے کسی نہ کسی رنگ میں روح نفس یا ذہن کی اولیت و اہمیت پر مبنی تصوریت پر رہا۔ البتہ سائنس کے جدید دور پر چونکہ مادیت زیادہ چھائی رہی، اس لئے بقول وہائٹ ہڈ کے اٹھارہویں انیسویں آخری دو صدیوں میں :-

"فلسفہ سائنس سے دور ہو گیا تھا۔ لیکن اب نفسیات اور اس سے عضویات (فزیالوجی) کے روابط کی بنا پر وہ بے پاؤں پھر اپنی پرانی اہمیت حاصل کرتا رہا"

---

[۱] (THEY CANNOT BE FRIENDS UNLESS SCIENCE CAN PASS THE EXAMINATION WHICH PHILOSOPHY MUST SET TO ITS PREMISES)

[۲] شک پسندی (WILL TO DOUBT) صہ ۶۵

نیز اس دور کی :-

"جس (فزیکل) سائنس کے طے شدہ اصول کی شکست و ریخت نے بھی فلسفہ کی بحالی کو آسان کر دیا۔ ورنہ اس شکست و ریخت تک سائنس بحفاظت تمام مادہ مکان و زمان اور آخر میں انرجی کے تصورات پر مضبوطی سے قائم رہی"[1]

## آج فلسفہ اور سائنس ایک نقطہ پر جمع ہو گئے ہیں

اصل میں ایک طرف فلسفہ خصوصاً فلسفۂ مابعد الطبیعیات کو اپنی فطری و فکری نوعیت کی بنا پر ہمیشہ ہی سے طبیعیاتی یا حواسی و مادی کائنات کو حقیقی تسلیم کرنے سے بُعد رہا۔ دوسری طرف موجودہ بیسویں صدی سے پہلے کی صدی دو صدی کی جدید سائنسی دریافتوں اور ترقیوں نے بظاہر حواسی یا مادی کائنات ہی کو ٹھوس بنیادی حقیقت بنا دیا تھا۔ اسلئے فلسفہ و سائنس کی راہ کیا ان کی سمتوں ہی میں مشرق و مغرب کا بعد بلکہ تضاد رونما ہو گیا تھا۔ لیکن عہدِ حاضر کی طبعیات میں طبیعاتی یا سائنسی راستہ ہی سے صدیوں کے مسلمات کی شکست خوردگی سے ایسا انقلاب آیا خاص کر خود مکان، زمان اور مادہ کے تصورات بلکہ پوری حواسی مادی دنیا سے بے اعتمادی کیا سرے سے وجودِ مادہ کے منکرہ بر کلے جیسے خالص فلسفی کی خالص سائنسی سے سنائی دینے لگیں۔ اس صورت حال کو بھی مختصراً برٹرنڈ رسل کی ایک دوسری کتاب میں پڑھ لیں :-

"فلسفہ کا ہمیشہ سے ایک بہت پرانا مسلک فکر (اسکول) ہمارے محسوسات یا حواس کی دنیا کے حقیقی ہونے کے بارے میں بے اعتمادی یا شک کا رہا ہے ہندوستان کی سریت یا اشراقیت (سٹسزم)[2] میں یونان کے پرمانیدس[3] سے

---

[1] (SCIENCE AND THE MODERN WORLD) [2] ASCETICISM

[3] PARMENIDES

لے کر جدید دور کے وجدانی فلسفہ اور برکلے میں (سب سے بڑھ کر اب خود جدید طبعیات میں) ہمارے حواسی علم یا محسوسات کی ظاہری دنیا کی تنقید و تردید مختلف محرکات یا راہوں سے ملتی ہے۔ اشراقیہ اپنے ایک براہ راست (IMMEDIATE) پس پردہ علم کی بنا پر جو زیادہ حقیقی ہے اس کی تردید کرتے ہیں۔ پرمانیدس اور فلاطوں اس کے مسلسل تغیر پذیر ہونے کی بنا پر۔ اور برکلے کی خاص و اہم دلیل حواسی ادراکات (SENSE DATA) یا ادراک و احساس کرنے والے ذہن پر موقوف یا اس کے تابع ہوتا ہے۔

بلکہ راقم ہذا کے نزدیک تو برکلے کی دلیل یا گرفت اتنی صاف سیدھی ہے کہ اس کے لئے جدید طبعیات و عضویات وغیرہ کا کوئی سہارا لینے کی سرے سے کوئی خاص ضرورت نہیں رہتی خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ کسی بھی احساس کو احساس کرنے والے ذہن کے بغیر یا اس کے باہر موجود ماننا کھلا ہوا لفظی تناقض ہے کہ "احساس بلا احساس کے پایا جاتا ہے"۔

خوش قسمتی سے اس کے فلسفہ کی اصل کتاب کا "مبادی علم انسانی" کے نام سے ترجمہ اردو میں خود راقم ہذا ہی کا کیا ہوا دارالمصنفین سے شایع ہو چکا ہے۔ اور اس سے زیادہ عام فہم اور دلچسپ مکالمات کی صورت میں مولانا دریابادی کے قلم اعجاز رقم سے[1] نیز ایک مستقل کتاب اس کے سوانح اور فلسفہ پر بھی راقم الحروف ہی کی ہے۔ ان میں سے کوئی کتاب بھی ضخیم نہیں تھوڑی بہت فلسفہ سے کتابی یا فکری مناسبت رکھنے والا کیا کوئی سلیم الفہم ذہین آدمی بھی بڑی حد تک

---

[1] خود برکلے نے مبادی علم انسانی (پرنسپلس آف ہیومن نالیج) کے مطالب کو زیادہ آسان ہی نہیں، بلکہ ادب و انشا کے اعتبار سے ایسے مکالمات کی صورت دے دی جو فلاطوں کے مکالمات کے ٹکر کے خیال کئے جاتے ہیں۔

صرف آخر الذکر ہی کو پڑھ کر اس بنیادی فلسفہ کی صاف سیدھی بات سمجھ لے سکتا ہے۔

## انسان اور وحدت سازی

سائنس و فلسفہ ہی نہیں، بلکہ مذہب کو ملا کر تینوں کے فرق و تعلق کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلی سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انسان کے سوا کوئی دوسری مخلوق معلوم نہیں جو سائنس داں فلسفی اور مذہبی ہوتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود انسان کی انسانی ساخت و فطرت ہی میں کوئی ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ جو ان تینوں کا منشا و ماخذ ہے اس لئے مباحث بالا میں سب سے پہلے انسان کی اس خاص خصوصیت و امتیاز ہی پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے، جہاں تک نفس جسمانی آلاتِ حس سے محسوس و معلوم ہونے والی آب و گل، رنگ و بو کی ناسوتی دنیا کا تعلق ہے انسان کے ساتھ ان جسمانی آلات کی تعداد و ساخت اور درجات کے اختلاف کے باوجود کم و بیش سب دوسرے حیوانات بھی شریک ہیں۔

انسان کو انسان بنانے والی چیز صرف ایک ہے کہ اس کے اندر حواسی ادراکات کی شہادت سے ماورا کا سوال اٹھتا ہے۔ یعنی اس کا ذہن محسوسات سے غیر محسوسات و معقولات یا حاضر سے اس کے ماضی و مستقبل کے غائب کی طرف جاتا اور اس کو جاننا چاہتا ہے۔ اس کا راستہ عقل و منطق کے لئے لے دے کر صرف ایک ہی ہے۔ یعنی محسوس و معلوم ہی پر کسی نہ کسی طرح قیاس کر کے معقول و مجہول پر سے پردہ اٹھانا۔

اب ہمارے یہ معلومات اور محسوسات اصولی و نوعی طور پر دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جس کو ہم خود اپنا ذہن یا نفس کہتے ہیں اور جس کا بلا کسی واسطہ کے بغیر حضوری طور پر وجداناً و بداہۃً ہم کو علم حاصل ہے۔ دوسرا جس کو ہم اپنا جسم کہتے ہیں اور جس میں جسمانی نوعیت ہی کے کچھ ایسے دریچے پائے جاتے ہیں جن سے خود ہمارے ذہن و ذات سے باہر کی کچھ روشنی آتی اور اس روشنی میں

اپنے جسم ہی کے لئے طرح طرح کے بے شمار دوسرے اجسام کی کثرتوں کی ایک بے انتہا وسعت وپہنائی والی دنیا آباد نظر آتی ہے۔

حاضر سے غائب یا معلوم سے مجہول کی ذہنی طلب وتشنگی ہی کا لازمہ توحید یا وحدت سازی، بالفاظ دیگر کثرتوں کو وحدتوں میں تحویل وتحلیل کرنے کا ہے۔ سامنے ایک درخت کھڑا ہے جو سیکڑوں ہزاروں شاخیں پھول اور پھل رکھتا ہے۔ پھر بھی ہم اس کو ایک درخت کہتے اور سمجھتے ہیں کہ اس کی یہ مادی کثرتیں دراصل ایک ہی درخت یا اس کی شجری حقیقت ہی کے مختلف برگ وبار ہیں۔ اسی طرح جمادات، نباتات اور حیوانات سب میں جسم وجسمانیت کو مشترک پاکر سب کو ایک ہی جسمانی حقیقت کی بوقلموں قالبی صورتیں خیال کر لیتے ہیں۔ اس جسمانیت ہی کا علمی واصطلاحی نام مادہ ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف اپنے ذہن ونفس کو دیکھتے ہیں تو وہ اپنے افعال وآثار میں جسم سے مختلف کیا متضاد نظر آتا ہے۔ مثلاً مختلف طول وعرض کے اجسام کے جسمانی وجود کے لئے ان ہی کی جسمانیت کے قدوقامت کے مطابق جگہ یا مکان کا ہونا لازم ہے جس میں پائے جائیں۔ پتھر کے ایک ذرہ یا پانی کے ایک قطرہ کے پائے جانے کے لئے جتنی جگہ درکار ہے، اس میں کسی پہاڑ یا سمندر کا پایا جانا کیا معنی پتھر کے دو ذرے یا پانی کے دو قطرے بھی نہیں پائے یا سما سکتے۔ بخلاف اسکے اس ذرہ وقطرہ اور پہاڑ اور سمندر کے ذہنی وجود یا تصور کے لئے ان قدوقامت کے مطابق کیا سرے سے کوئی ایسی جگہ یا مکان درکار نہیں ہوتا جیسا کہ ان کے جسمانی وجود کے لئے۔ اسی طرح مثلاً خود میرے جسم کو لکھنؤ سے لندن پہونچنے کے لئے ریل بحری جہاز، ہوائی جہاز وغیرہ کسی جسمانی واسطہ اور اس کے مطابق وقت کی ضرورت ہے لیکن ذہنی خیال جس طرح مکان کے ایک کمرہ سے دوسرے کمرے میں پہونچ جا سکتا ہے، اسی طرح لندن کیا کسی بعید سے بعید سیارہ وستارہ

تک پہونچ سکتا ہے۔

لیکن انسان کے اس ذہن کی وحدت پسند یا وحدت ساز یا توحیدی و فلسفیانہ فطرت زمین سے آسمان تک کی ان گنت کثرتوں پر جس طرح قرار نہیں پکڑ سکتی، اسی طرح جسم و ذہن کی بظاہر ضدینی دوئی کو بھی کیسے اور کب تک گوارا کر سکتی تھی۔ پوری تاریخ فلسفہ میں ذہن و جسم یا روح و مادہ کی دوئی یا ثنویت کے قابل ذکر قائلین کی تعداد تو بس گنی چنی ہی ملتی ہے۔ باقی قائلین وحدیت میں بھی کچھ نام مادیت والوں کے ملتے ہیں۔ ورنہ بہت زیادہ روحیت یا کسی نہ کسی رنگ میں تصوریت یا آج کی سائنسی تعبیر میں منٹالزم ( MENTALISM ) والوں کی البتہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اواخر تک کی جدید مغربی سائنس میں مادیت کا زور و شور زیادہ رہا۔

اس کا ایک ظاہری سبب تو سائنس کے حیرت انگیز انکشافات برق بھاپ وغیرہ قوتوں پر قابو پا جانے کی بدولت ریل موٹر تار برقی کی سی آئے دن طرح طرح کی مرعوب کن ایجادات۔ دوسرا اور اگر اسبب مادہ کے ٹھوس جوہری، ایٹم نام ذرات کا زیادہ مضبوط سائنسی دلائل سے از سرِ نو قطعی مسلمات کی حیثیت اختیار کر لینا اور ان ہی کی مختلف عنصری صورتوں کو عناصر کائنات سمجھا جانے لگنا جن کی تعداد اب ۱۰۴ تک ہے پھر ایک لحاظ سے سب سے بڑھ کر ارتقا کے نظریہ کا بھی گویا قطعی مسلمہ ہی بن جانا جس سے زندگی و ذہن جیسے غیر مادی مظاہر تک کی بظاہر مادی افعال و خواص ہی کے تصورات یا الٹ پھیر سے توجیہ کا راستہ نکلتا معلوم ہونے لگا۔

لیکن ابھی انیسویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مادیت کی ان نام نہاد قطعی سائنسی بنیادوں کا انہدام ہی شروع نہیں ہو گیا بلکہ ایٹم نام خود مادہ کے ٹھوس جوہری وجود ہی کا خاتمہ ہو گیا

اور آگے بڑھتے بڑھتے سائنسی مادیت کی منطق عین سائنس ہی کی جدید سے جدید تحقیقات ونظریات کی راہوں سے بالکل معکوس سمت میں چل پڑی یعنی کہاں تو زندگی و ذہن تک کے مادہ سے ماخوذ و مستفاد یا اس کی مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اور کہاں خود محسوس و مرئی آنکھوں دیکھی پوری نام نہاد جسمانی یا مادی کائنات کو ذہن کی ساختہ پرداختہ یا مخلوق سمجھا سمجھایا جانے لگا حتیٰ کہ فلسفہ کی دنیا میں مادہ و مادیت کی قطعی نفی و انکار کی سب سے بڑی ناقابل انکار منطق والے برکلے ہی سے ملتی جلتی بولیاں سنائی دینے لگیں، بلکہ وقت کے دو چوٹی کے سائنس داں ایڈنگٹن (SIR ARTHUR EDDINGTON) اور اس سے بھی بڑھ کر جیمس جینز (SIR JAMES JEANS) نے تو کہنا چاہئے کہ من وعن برکلے ہی کا فلسفہ سائنسی بنیادوں پر قبول کر لیا۔ یعنی مادی کائنات ذہن کی صرف ساختہ پرداختہ یا تعمیر و تشکیل ہی نہیں۔ سرے سے ذہن سے باہر اس کا کوئی خارجی وجود ہی نہیں۔ البتہ مراد اس سے انفرادی نہیں کلی یا عالمگیر ذہن (یونیورسل مائنڈ) ہے جس میں ہمارے تمام مرئی و محسوس موجودات جن کو ہم اپنے ذہن سے باہر موجود پاتے ہیں مستقل طور پر ہمیشہ سے موجود ہیں۔ وہی کلی ذہن ہمارے انفرادی ذہنوں میں ان کو حسب موقع و ضرورت پیدا کرتا رہتا ہے۔

سمجھ میں آنے والی بات بھی کوئی ایسی ہی ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ سائنس کی رو سے جب اتنا بہر حال مسلم ہی ہو چکا کہ بفرض ہمارے انفرادی ذہنوں سے باہر اگر کوئی برقی ذرات کی سی بے ذہن شئی موجود ہے بھی تو بقول رسل ان ذرات یعنی الکٹران پروٹان کے محض دیوانہ وار رقص کے سوا کچھ نہیں، جو اعصاب کے واسطہ سے ہمارے دماغ یا ذہن تک پہونچ کر خود اس ذہن کے کسی کرتب یا شعبدہ بازی و جادوگری سے وہ محسوس و مرئی صورتیں اختیار کر لیتا ہے، جن کو ہم غلطی یا غلط فہمی سے جوں کا توں اپنے ذہن سے باہر جان بیٹھتے ہیں۔

## موجودہ سائنسی فلسفہ کا حاصل

اوپر اپنے اپنے محل و موقع سے خود ایڈنگٹن اور جیمس جینز (JEANS) کی کتابوں سے بعض باتیں پیش کی جا چکی ہیں۔ ذیل میں دونوں کے سائنسی فلسفہ ہی پر دو[1] اور نامور سائنس دانوں کے مرتبہ مقالات سے کچھ جستہ جستہ چیزیں نقل کی جا رہی ہیں جو جدید سائنس کی روشنی میں فلسفہ و مذہب دونوں کیلئے ایسی اہمیت رکھتی ہیں کہ ان کو مختلف عنوانات و تعبیرات سے بار بار دہرا کر ہی خود راقم کی طرح سائنس سے نا آشنا ہی نہیں اس سے مرعوب ذہنوں کے مد نظر بقدر ضرورت آشنا دونوں کی مرعوبیت کو کچھ نہ کچھ دور کیا جا سکتا ہے۔

پہلے ایڈنگٹن کو لیں:۔ اتنا تو ایڈنگٹن یا جیمس جینز کیا، کم و بیش جدید سائنس کی رو سے سب ہی کے نزدیک مسلم ہے کہ موجودہ سائنس کے فلسفیانہ مضمرات یا نتائج پرانے فیشن کی مادیت سے بالکلیہ مختلف بلکہ متضاد ہیں ایڈنگٹن کا تو دعویٰ ہے کہ سائنس کی نئی بالائی تعمیر نے کہنا چاہیئے کہ اس کی پرانی بنیادوں کو سرے سے ڈھا کر رکھ دیا ہے۔

ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ:۔

"سائنس کو اب اپنی رسائی کی محدودیت کا احساس زیادہ ہو گیا ہے مظاہر کائنات کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن تک سائنسی بحث و تحقیق جا ہی نہیں سکتی لیکن اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ وہ پہلو نظر انداز کر دینے کے لائق ہیں سائنس کے علاوہ مذہبی و جمالیاتی وجدانات کی سی علم کی دوسری قسمیں بھی ہیں جنکو وہبی یا قیاسی

---

[1] جے ڈبلو۔ این سلیوان ( J. W. N. SULLIVON ) اور والٹر گریرسن WALTER GRIERSON ) کے مرتبہ رسائل بنام "ماڈرن بلیف" جن میں (۱) ماڈرن سائنس (۲) ماڈرن فکر ( THOUGHT ) اور مذہبی فکر ( RELIGOUS THOUGHT ) سب کے مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے

کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔

سائنس علم ہی وہ سب کچھ نہیں جو ہم جانتے ہیں یا جس کا جاننا ہمارے لئے ضروری ہے۔ سائنس کا اپنی محدودیت کا یہ نیا شعور یا احساس انکسار آج کے سائنسی انقلاب کا ایک بڑا اہم عنصر یا نتیجہ ہے"

ہمارے کام کی خاص بات یہ ہے کہ مذہب وہم و التباس ہو نہ ہو، لیکن اس کے مقابل مادیت کے مادہ کی جس جوہری جسمانی دنیا کو ذہن سے باہر مستقل بالذات ایک ٹھوس حقیقت کی طرح موجود سمجھا جاتا ہے، وہ بہرحال خود سائنس ہی کی راہ سے فریب ہی فریب ثابت ہو کر رہی۔ یعنی :-

"طبعیات (فزکس) کی خارجی (مادی) دنیا ظلال[1] یا سایوں کی دنیا ہو کر رہ گئی ہے۔ ٹھوس طبعیاتی دنیا کے فریبوں کا پردہ چاک ہو چکنے کے بعد مادی جوہر (SUBSTANCE) کا فریب بھی ختم ہو چکا ہے۔ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ جوہر ایک بہت بڑا دھوکا نکلا"

اور یہ واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ :-

"طبعیاتی سائنس کا تعلق سایوں کی دنیا سے ہے، جو حالیہ سائنس کی سب سے اہم ترقیوں میں سے ہے"

لہذا یہ بہت بڑی حقیقت :-

"ایک بار پھر دہرا لینی چاہیئے کہ جوہر کے تصور کا جدید سائنس میں بالکلیہ خاتمہ ہو چکا ہے اور مادہ ایسی چیزوں کے مابین ریاضیاتی علائق یا اضافات

---

[1] حضرات صوفیا کے قدیم ظل وجود کی یہ جدید سائنسی تعبیر پھر پیش نظر رہے۔

میں تحلیل ہو کر رہ گیا ہے (RELATIONS) جن کی بجائے خود حقیقت کے بارے میں ہم قطعاً کچھ نہیں جانتے۔"

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ:۔

"مادہ کی نوعیت (نیچر) وہی ہے، جو ہمارے خیالات، احساسات اور جذبات کی یعنی مادہ بھی ایک ذہنی (MENTAL) شئی ہے۔"

اور یہ۔

"ہمارے ذہنی احساسات خارجی اشیا سے کوئی ادنیٰ سی ادنیٰ مماثلت و مشابہت تک نہیں رکھتے۔ مثلاً کسی میز سے تعلق رکھنے والے جن پیامات (MESSAGES) یا اثرات سے ہمارے اعصاب میں جو اختلال (DISTURBANCE) رونما ہوتا ہے وہ نہ ہمارے محسوس خارجی میز سے کوئی مشابہت رکھتا ہے، نہ میز کے اس تصور سے جو ہمارے شعور میں بالآخر اس عمل سے پیدا ہوتا ہے۔"

بہر حال ایڈنگٹن کے سائنسی فلسفہ کا موٹا موٹا خلاصہ یہ ٹھہرتا ہے کہ:۔

"کوئی نہ کوئی ایسی دنیا ہے تو ضرور جو ہمارے آلاتِ حس پر اثر انداز ہو کر زمین سے آسمان تک کی۔ م) میز کرسی، جانوروں، ستاروں وغیرہ کی وہ دنیا بنا کر کھڑا کر دیتی ہے جس کا ہم اپنے حواس سے ادراک کرتے ہیں، لیکن بجائے خود یہ دنیا یا اس کا مافیہ (CONTENT) ہے کیا؟ اس سے ہم جاہل مطلق ہیں۔"

باقی ہمارا سائنسی کارنامہ لے دے کر بس اتنا ہے کہ:۔

"آب و گل کی اس محسوس و مانوس ناسوتی دنیا سے خود ہمارا سائنسی ذہن قطعی (EXACT) سائنس کی ایک

آیاتی یا علاماتی[1] (SYMBOLIC) دنیا تعمیر کرلیتا ہے۔

آیاتی اس لئے کہ اس سائنس کے ایٹم والکٹران وغیرہ سب کی سب کچھ ایسی اشیاء کے اصطلاحی نام یا اسما ہوتے ہیں جن کی ماہیت (نیچر) تو نامعلوم ہی رہتی ہے، لیکن جن کے ریاضیاتی پہلو (ASPECTS) ان اصطلاحوں کی تعریف سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ آیات یا علامات اسی طرح ایک نامعلوم شئی کو ظاہر کرتی ہیں جس طرح الجبرے میں ب، ج وغیرہ کوئی حرف ایک نامعلوم مقدار (QUANTITY) کو بطور علامت دلالت کرتا ہے۔"

بالآخر ایڈنگٹن اس ریاضیاتی کسی :-

"نامعلوم شئی (SOMETHING UNKNOWN) کی نامعلوم مخفی نوعیت کو کچھ نہ کچھ معلوم بنانے کی کوشش میں اس کو نام "ذہنی مواد (مثلاً اشخ) (MENTAL STUFF) ہی کا دیتا ہے۔ یعنی مادہ کے بجائے اس کی نوعیت کسی نہ کسی طرح ذہن (مائنڈ) ہی قرار پاتی ہے۔"

اس طرح ایڈنگٹن کے فلسفہ کا ماحصل تین نتائج نکلتے ہیں :-

(۱) سب سے پہلا تو یہ کہ طبعیات (فزکس) میں جن موجودات یا ذرات (ENTITIES) کو قوت (فورس) کمیت (ماس) وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے ان کو اب عام طور پر آیات یا علامات ہی مانا جاتا ہے یعنی وہ کسی ایسی ذات وحقیقت کے مختلف رخ (ASPECTS) ہوتی ہیں جن کی بجائے خود حقیقت نامعلوم ہے۔"

---

[1] قرآن جو پوری کائنات کو "آیات اللہ" کہتا ہے کیا سائنس کو بالآخر کچھ وہی تو نہیں کہنا پڑ رہا ہے۔؟

اس نتیجہ کو ایڈنگٹن :-

"آج کی سائنس کا عمومی رنگ و رجحان (OUTLOOK) قرار دیتا ہے یعنی علمائے طبعیات اب اس واقعہ کا شعور و احساس رکھتے ہیں کہ طبعیات ایک وسیع تر (WIDER) حقیقت کا محض ایک جزوی (PARTIAL) رخ (ASPECT) ہے۔"

اس (NAMES) آیات (SYMBOLS) اور رخ یا وجہ (ASPECT) کی ان سائنسی تعبیرات نے قرآنی اصطلاحات "تعلیم اسما" (علم الاسماء کلہا) اور کائنات کی تمام موجودات کو اللہ تعالٰے کے وجود کی آیات یا نشانیاں اور رخ (ASPECTS) یا وجہ (اینما تولوا فثم وجہ اللہ) کی ایک جدید سائنسی تفسیر کی طرف بے ساختہ ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔

دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ :-

(۲) اگر قطعی علیت (STRICT CAUSALITY) کا مادی دنیا سے خاتمہ ہو چکا ہے ـــ جیسا کہ تمام قرائن اسی کے ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہی ہو چکا ہے ـــ تو اس پرانے مفروضہ سے ہم کو نجات مل جاتی ہے کہ ذہن جبری (DETERMINATIC) قانون کا تابع ہے۔"

ایڈنگٹن عدم جبریت (INDETERMINACY) کو آج کی طبعی سائنس اور فلسفہ دونوں کا لازمہ جانتا ہے ...... اس کا علی الاعلان دعوی ہے کہ جو لوگ ذہنی افعال (ACTIVITY) کی جبریت کے قائل ہیں بالفاظ دیگر ارادہ کی آزادی یا اختیار (FREEDOM OF WILL) کے منکر ہیں

وہ اب اپنی تائید میں سائنس کی کوئی شہادت بالکل نہیں پیش کر سکتے...... الکٹران جبری قوانین کے تابع قطعاً نہیں معلوم ہوتے ہیں[۱]

سائنسی فلسفہ کے لئے تیسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایڈنگٹن بنیادی حقیقت شعور ( CONSCIOUSNESS ) ہی کو قرار دیتا ہے۔

(۳) اور طبعیاتی (فزیکل) دنیا شعور کے زنجیرہ ( LINKAGE ) یا وابستگی سے قطع نظر کر کے کوئی واقعیت ( ACTUALITY ) ہی سرے سے نہیں رکھتی...... ذہن ہی ہمارے تجربہ کی سب سے پہلی اور سب سے براہ راست چیز ہے۔ اس لئے ماسوا جو کچھ بھی ہے سب دور افتادہ استنباط ہی استنباط یا قیاس ہی قیاس۔"

وہ پوچھتا ہے کہ:۔

"آخر ہمارے اس باطنی ( INNER ) ایگو ( EGO ) یا انا اور شعور ذات ( SELF CONSCIOUSNESS ) اور ارادہ کی آزادی یا اختیار کے احساس کی خانہ پری کے لئے مادہ پرست کون سا طبعیاتی بدل پیش کر سکتا ہے؟"

---

[۱] جبر و اختیار کے مسئلہ کے کیسے فطری حل کی طرف سائنس نے پہونچا دیا کہ جبریت پر چاہے جتنے دلائل پر دلائل پیش کئے جائیں لیکن خود قائل جبریت بھی زندگی کے قدم قدم پر فطرتاً گیا اضطراراً اپنے کو مختار ہی محسوس کرتا ہے اور اسی لئے دین ہی نے اس کو مکلف نہیں قرار دیا بلکہ دنیا میں بھی اس کو اپنے نیک و بد اعمال و افعال کا خود ذمہ دار فاعل جاننا انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں ناگزیر ہوتا ہے۔

ڈیکارٹ سے چل کر برکلے کی خالص فلسفیانہ تصوریت تک پہونچانے والی آگے خلاصۃً خالص سائنسی راہ ورجحان کی شہادت پوری توجہ سے ملاحظہ ہو کہ :-

مبنیادی حقیقت بہر حال ہمارا شعور ہی ہے، جس کو کسی دوسری شئی کی اصل (ORIGIN) و حقیقت پر گفتگو سے پہلے ہی مان لینا پڑتا ہے۔"

پھر:-

"مادی کائنات تو تمام تر خود شعور ہی کے پیش کردہ کچھ رموز یا علامات (SYMBOLS) کی ایک تعبیر و ترجمانی (INTERPRETATION) کا نام ہے۔ مادی کائنات کے وجود کا نام لیتے ہی پہلے ہم شعور کو موجود مان لیتے ہیں کسی شئی کے بھی وجود کا نام لینا خود اپنے شعور سے وابستہ کئے بغیر کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔"[۱]

غرض اٹھارھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک سائنسی کارناموں کے دور دورہ کا جو عہد جدید ہے، اس پر انیسویں صدی کے اواخر تک تو مادیت ہی مادیت کا سائنسی فلسفہ چھایا رہا۔ یعنی ذہن سے باہر ایک بے ذہن و بے شعور جسمانی موجودات کی دنیا جو گویا ایک ناقابل انکار محسوس و مرئی واقعیت معلوم ہوتی تھی اسی کو مادی دنیا کا نام دے کر مادہ کو نہ صرف زمین سے آسمان تک بے ذہن و بے شعور خالص جسمانی موجودات کی بنیادی حقیقت سمجھا جانے لگا تھا۔ بلکہ انسان کو خود اپنے انسانی جسم میں ذہن یا ادراک وشعور رکھنے والی بظاہر ایک بالکل غیر جسمانی ذات جو کارفرما نظر آتی تھی اس کے بھی بالکلیہ

---

[۱] ایڈنگٹن کے فلسفہ سے متعلق یہ جستہ جستہ اقتباسات "ماڈرن بلیف" کے عنوان "ایڈنگٹن کا فلسفہ" از صہ ۸۲۶ تا صہ ۸۲۸ سے ماخوذ ہیں۔

اسی بے ذہن و شعور مادہ ہی کی ایک ضمنی وارتقائی پیداوار ہونے کا دعویٰ جدید سائنس کا ایک مسلمہ بن چکا تھا۔

لیکن انیسویں صدی کے آخر ہوتے ہوتے ہی خود سائنس خصوصاً طبیعاتی (فزیکل) سائنس نے جو پلٹا کھایا اس نے مادیت کے اس دعوے ومسلے کی سرے سے کایا ہی پلٹ کر کے رکھ دی۔ اس طرح کہ نہ صرف مادہ کی مادیت غائب ہو کر خود مادہ کے وجود تک کا پتہ ملنا دشوار ہو گیا۔ بلکہ ذہن سے باہر کی پوری محسوس و مرئی گویا آنکھوں دیکھی زمین سے آسمان تک کی پوری نام نہاد مادی موجودات خود ذہن کی مخلوقات ثابت ہونے لگیں۔۔۔ بالفاظ دیگر عہد جدید کی جس سائنسی ترقی کے نتیجہ میں مادیت کا فلسفہ پیدا ہوا تھا اسی کی مزید ترقی کے بطن سے بالآخر تصوریت (آئیڈیلزم) ( IDEALISM ) یا ذہنیت (مینٹالزم) ( MENTALISM ) کا فلسفہ جنم لے کر رہا۔

## سائنسی غیر مادی فلسفہ کی تفصیل سب سے پہلے ایڈنگٹن نے کی

اس فلسفہ کا راستہ پہلے پہل کہنا چاہیے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ صاف وہموار ایڈنگٹن ہی کی کتاب "طبیعاتی دنیا کی حقیقت"[1] نے کیا جو پہلی مرتبہ ۱۹۲۸ء میں شایع ہوئی جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس۔۔۔ زمانہ کی کسی کتاب نے نہ اس سے زیادہ قبول حاصل کیا اور نہ اس سے زیادہ موضوع بحث بنی اس کا سبب بقول خود ایڈنگٹن ہی کے یہ ہے کہ اس کتاب میں:۔

---

[1] اس کتاب کا مقصد آج کی سائنس کی نظر میں طبیعاتی دنیا کی جو حقیقت یا نوعیت ہے اس کو واضح کرنا تھا اور دوسرا اس فلسفیانہ نتیجہ کی ترجمانی جو سائنس کی تازہ تبدیلیوں سے نکلتا ہے۔

( "THE NATURE OF THE PHYSICAL WORLD" )

"طبیعاتی کائنات سے متعلق جدید سائنسی تحقیق و مطالعہ کے بعض ایسے نتائج پر بحث ہے، جن سے سب سے زیادہ غذا فلسفیانہ فکر کو ملتی ہے۔ اس میں سائنس کے نئے خیالات (CONCEPTIONS) بھی ملیں گے اور نیا علم (KNOWLEDGE) بھی۔ ان دونوں حیثیتوں سے ہم کو مادی کائنات کے باب میں ایک ایسی فکری راہ اختیار کرنا پڑتی ہے، جو اس راہ سے بالکل مختلف ہے، جو گذشتہ (انیسویں) صدی کے آخر تک چھائی ہوئی تھی۔"[1]

## دورِ حاضر میں فلپ فرانک کی مزید تصریحات

جس کا خلاصہ یہی ہے کہ راستہ گذشتہ صدی کے فلسفۂ مادیت کے بجائے خود سائنس کی تحقیقات کی بنا پر تصوریت کی طرف لے جاتا ہے جس تک فلسفہ اپنی خالص فلسفیانہ راہوں سے کم و بیش ہمیشہ ہی پہنچتا رہا ہے۔ اور اس صدی کے سائنسی فلسفہ کا یہ خلاصہ یا نتیجہ جس نے ۳۰، ۳۵ سال قبل ایڈنگٹن کی اس معرکۃ الآرا کتاب کی صورت اختیار کی تھی، روز بروز واضح سے واضح تر ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی ۱۹۵۵ء کی ایک کتاب "سائنس اور جدید ذہن"[2] پر عصری سائنس اور دنیا کا عصری تصور" فلپ فرانک کا ایک مقالہ پورا پڑھنے والا ہے۔ موصوف کی شخصی و سائنسی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ ہارورڈ یونیورسٹی میں آئنسٹائن کے جانشین رہے ہیں۔ اور اب خصوصی طور پر کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفۂ سائنس ہی پر لکچر دے رہے ہیں۔ ان کے مذکورہ بالا مقالہ کے چند جستہ جستہ مختصر اقتباسات بھی پڑھ لیں۔

"ہماری صدی میں نظریۂ اضافیت کی تعبیر و ترجمانی اکثر فلسفۂ تصوریت کے رنگ میں کی جاتی ہے کیونکہ طبیعیات (فزکس) کسی جسم کی (مثلاً) حقیقی لمبان تک کا نام

---

[1] مقدمہ ماڈرن بلیف [2] ("SCIENCE AND THE MODERN MIND")

نہیں لے سکتی (کہ وہ بجائے خود واقعتاً کتنا لمبا ہے م) بلکہ کسی خاص فرد مشاہد (OBSERVER) ہی کا نام (OBSERVATION) کے انفرادی مشاہدہ لے سکتی ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ طبیعیاتی سائنس کا تعلق مادی اشیا (OBJECTS) کے بجائے ذہنی مظاہر و احوال (PHENOMENA) ہے۔"

اسی طرح کوانٹم نظریہ کی رو سے :-

"عالم طبیعیات ذرات (PARTICLES) کی واقعی یا خارجی (OBJECTIVE) وضع و محل (POSITION) یا مدار (ORBIT) نہیں بتلاتا بلکہ صرف مشاہدہ کرنے والے کے خاص حالات و عوارض (CIRCUMSTANCES) کی بنائی ہوئی یا ساختہ پرداختہ پیمائشوں (MEASUREMENTS) کو۔"

مطلب یہ کہ سائنس کی دنیا کو ہر پھیر کر بالآخر سائنسی مشاہدات (OBSERVATIONS) کے اندر رہنا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ کسی مشاہدہ سے بھی مشاہد (OBSERVER) کی ذات و ذہن یا اس کے احوال و عوارض کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال نظریۂ اضافیت اور کوانٹم نظریہ :-

"دونوں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے میکانکی و مادی فلسفوں کے خلاف ہی جاتے اور دنیا کی ذہنی (MENTALISTIC) تصویر (PICTURE) ہی بناتے نظر آتے ہیں۔"[1]

---

[1] صفحہ ۵۵ ("SCIENCE AND THE MODERN MIND")

کچھ اس سے بھی بڑھ کر سن لیجئے کہ:-

"ہماری صدی کی سائنسی ترقی نے اس حقیقت کو زیادہ سے زیادہ ہی واضح کر دیا ہے کہ سائنس کے اصول (PRINCIPLES) .... ایسی علامات یا آیات کا نظام (SYSTEM) ہیں جس کو خود سائنس داں کے تخلیقی تخیل (CREATIVE IMAGINATION) نے پیدا کر لیا ہے"

ضمناً سائنس کے مومن اور مذہب کے منکر یہ بھی سن لیں کہ:-

"بیسویں صدی کی سائنس سے کائنات کی جو عمومی تصویر بنتی ہے، اگر ہم اس کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو اس مقبول عام (POPULAR) دعوے (ASSERTION) یا امید (HOPE) کو مدنظر رکھنا پڑے گا کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مقابلہ میں بیسویں صدی کی سائنس کو مذہب اور اخلاق سے زیادہ آسانی کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے"

آگے بیسویں صدی کی سائنس کی سب سے دلچسپ نوعیت یہ بتلائی گئی ہے کہ سائنس بھی ایک طرح کی شاعری ہے:-

"بنیادی طور پر سائنس داں کا کام یا کارنامہ اسفاقاً شاعر کے کارنامے سے مختلف نہیں حقیقت (REALITY) نہ پوری طرح سائنس داں کی گرفت میں آتی ہے، نہ شاعر کی۔ حقیقت کا صرف تجربہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ بیان یا پیش ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ ہم اتنا بھی نہیں جان سکتے کہ حقیقت کو پیش یا بیان کرنے کے معنی کیا ہونگے۔ ہر بیان و اظہار خواہ سائنسی ہو یا شاعرانہ چلتا علامات آفرینی ہی سے ہے"

شاعری سے بڑھ کر نری لفاظی ہے۔

"کچھ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو نرے الفاظ ہوئے۔ ہم تو کچھ واقعات کی باتیں سننا چاہتے ہیں"

چاہتے ہیں تو سن لیں کہ:۔

"سائنس نیز علم کی تمام دوسری قسموں آرٹ ( ART ) سمیت سب کا کام صرف علامات کی نظام سازیوں کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اور الفاظ بھی علامات کی ایک قسم ہیں" [۵]

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

اور سائنس شروع ہی اس وقت سے ہوئی ہے جب ہم علامات کا ایک ایسا نظام گھڑتے یا ایجاد ( INVENTS ) کرتے ہیں جو ہمارے تجربہ میں نظم پیدا کر دیتا ہے" [۵]

---

[۵] یہ سارے اقتباسات فلپ فرانک کے مقالہ عصری سائنس اور عصری عالمی نظریہ ( "THE CONTEMPORARY SCIENCE AND THE CONTEMPORARY WORLD VIEW" ) سے ماخوذ ہیں جو ( "SCIENCE AND THE MODERN MIND" ) نام مجموعہ مقالات میں شایع ہوا ہے۔

فلپ فرانک کی فلسفۂ سائنس ہی پر ایک اور مستقل کتاب "سائنسی نظریات کی توثیق ( VALIDATION OF SCIENTIFIC THEORIES ) نام کی بھی بڑی تعریف ہے۔

("REALITY CAN ONLY BE EXPERIENCED, NEVER PRESENTED; WE CANNOT EVEN KNOW WHAT IT WOULD MEAN TO PRESENT REALITY. EVERY PRESENTATION, SCIENTIFIC OR POETIC PROCEEDS BY CERTAIN SYMOBLS")

اسی مجموعۂ مقالات کے ایک اور مقالہ میں بھی (ص ۹۰ پر) آخری بات ہر پھر کر یہی ملتی ہے کہ "ذہنی حرکت (DYNAMICS) کا اولین قانون (FIRST LAW) بہر حال یہی ثابت ہوتا ہے کہ:-

"ہم خود اپنی ذات یا ذہن سے نکل کر اس کے باہر کسی طرح جا ہی نہیں سکتے۔"

## غرض سائنس "تصوریت" پر آگئی

اس طرح ہمارے علم و یقین کی اولین حقیقت تو اب خود سائنس کی راہوں خود اکابر سائنس والوں کے کھلے کھلے اعترافات سب سے فلسفۂ تصوریت والوں ہی کی طرح ذہن ہی ذہن کا ہونا گویا ایک مسلمہ عقلی حقیقت قرار پا چکا ہے۔ پھر بھی اگر ہم بالکل انائیہ (SOLIPSISM) کی اس ضد پر نہیں اتر آتے کہ ذہن کی اولین حقیقت صرف اور صرف میرا ہی ذہن یا "انا" ہے۔ اور میرے "انا" یا ایگو (EGO) یا ذہن کے ماسوا کوئی خارجی دنیا کیا معنیٰ سرے سے کوئی دوسرا "انا" یا ذہن تک موجود نہیں۔ تو یہی خود میرا ہی ذہن جو کم از کم عملاً و اضطراراً ہمہ وقت حواس و محسوسات کی ایک پوری دنیا اپنے علاوہ ذہن سے باہر محسوس کرتا رہتا ہے۔ اس احساس و ادراک کا کچھ نہ کچھ منشا یا کوئی نہ کوئی توجیہ تو ہونی ہی چاہیئے۔ فیصلہ کن سوال اصل میں کسی نہ کسی ایسی توجیہ یا اقل مرتبہ ایسی ترجیحی توجیہ کا ہے، جو سائنس داں فلسفی اور عامی سب کے لئے کم از کم غلبۂ ظن (PROBABILITY) کے درجہ میں قابل قبول ہو۔

سائنس کی جدید سے جدید تحقیقات کی رو سے ذہن سے باہر بالفرض کوئی شئی موجود بھی ہے، تو وہ صرف الکٹران وغیرہ برقی ذرات کی مختل حرکات یا مجنونانہ رقص ـــ یہ ذراتی یا جنونی رقص بجائے خود ہمارے حواسی ادراکات کی دنیا سے رائی بھر بھی قطعاً کوئی مماثلت و مشابہت نہیں رکھتا۔ مثلاً میں اس وقت شہر لکھنؤ کے جس محلہ اور محلہ کے جس مکان میں جس میز کرسی پر بیٹھا ہوں

جس کاغذ پر جس قلم اور ہاتھ سے لکھ رہا ہوں اور وہ ہاتھ قریباً چھ فٹ والے دوسرے ہاتھ پاؤں سر و سینہ، آنکھ ناک کان وغیرہ اعضا و جوارح والے جس جسم کا ایک جز ہے، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی میرے ذہنی ادراکات کے ذرہ بھر بھی مانند و مماثل میرے ذہن سے باہر ہرگز کوئی وجود نہیں رکھتی۔ نہ لکھنؤ کے بازاروں کی بے شمار گوناگوں دوکانیں، نہ طرح طرح کی صورتیں وضع و لباس رکھنے والے خریدار، نہ دوڑتی ہوئی موٹریں، بسیں ٹرک، نہ گھوڑے گاڑیاں، نہ رکشا نہ سائیکلیں، نہ زندہ مردہ عجائب گھر، نہ شاہی زمانہ کی مشہور عمارتیں، نہ وہ بیلی گارد جو ۱۸۵۷ء کی جنگ انقلاب کی یادگار کے طور پر جوں کی توں اپنے انہدامات اور گولوں، گولیوں کے نشانات کے ساتھ بطور آثار قدیمہ محفوظ ہے، اور جس لکھنؤ کی ان چیزوں کو خود لکھنؤ کے باشندے اور باہر کے سیاح سیکڑوں کی تعداد میں روزانہ دیکھتے نظر آتے ہیں۔ ان ساری لاتعداد کھلی آنکھوں دکھائی دینے والی عمارات اشیا و اشخاص، سواریوں وغیرہ میں کوئی شئی بھی ایسی کیا اس سے ذرہ بھر ملتی جلتی ہمارے ذہن سے باہر سرے سے کوئی وجود نہیں رکھتی۔

ابھی چند صفحات اوپر ... ہی پر ایڈنگٹن کی زبان سے سن آئے ہیں کہ ہمارے ذہنی احساسات خارجی اشیا کے ذرہ بھر بھی مانند و مماثل نہیں ہوتے۔ مثلاً برقی ذرات کی برقی اختلالی حرکات یا ان کے اثرات سے ہمارے ذہن میں میز کی جو تصویر یا تصور رونما ہوتا ہے ایسا کیا، اس سے کچھ بھی ملتا جلتا کوئی میز ذہن سے باہر قطعاً نہیں پایا جاتا۔ یہی حال زمین کی ساری جمادی نباتی و حیوانی موجودات سے لے کر ان گنت اور اتھاہ اجرام سماوی تک سب کا ہے۔ اور تو اور خود اپنا جسم، ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ کوئی چیز بھی خارج میں ویسی موجود نہیں جیسی کہ بظاہر ہمہ وقت اپنی ہی آنکھوں دیکھتے رہتے ہیں۔

**اساطین سائنس کے اعترافات "تصوریت"** غرض ہمارے لئے سب سے اہم بات

بار بار و با صرار یاد رکھنے کی یہی ہے کہ آج کی عین سائنسی راہوں کی رو سے ذہن سے باہر کی کسی خارجی یا نام نہاد مادی دنیا کے بجائے خود ذہن یا اس کی داخلی دنیا کا ہمارے علم ویقین کی اولین و بنیادی حقیقت ہونا ایک مسلمہ بن چکا ہے۔ اس طرح سائنس کی یہ انقلابی راہ آپ سے آپ خود سائنس دانوں کے لئے بھی مادیت کے فلسفہ کے بجائے تصوریت کے فلسفہ کی راہ نما بن گئی ہے آخر میں مختصراً بڑے بڑے نصف درجن اساطین سائنس کا اعتراف خود ان کی زبانوں سے سن لینے کا ہے :-

۱۔ سر جیمس جینز (SIR JAMES JEANS) :- میرا رجحان تصوریہ کے اس نظریہ کی طرف ہے کہ شعور اساسی حقیقت ہے اور مادی کائنات اس سے ماخوذ (DERIVED) ہے۔

۲۔ ماکس پلانک (MAX PLANCK) :- شعور کی توجیہ مادہ اور اس کے قوانین سے نہیں ہو سکتی میرے نزدیک اساسی حقیقت شعور ہی ہے۔ اور مادہ کو شعور سے ماخوذ خیال کرتا ہوں جس شئی کی نسبت ہم کچھ کہتے سنتے یا جس کو موجود جانتے، اس کے لئے پہلے شعور کا فرض کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

۳۔ پروفیسر شروڈنگر (SCHRODINGER) :- زندگی تو میرے نزدیک ہو سکتا ہے کہ کسی اتفاق کا نتیجہ ہو۔ لیکن شعور کی نسبت میں ایسا نہیں خیال کرتا شعور کی توجیہ طبعی طریقوں سے ناممکن ہے۔ کیونکہ شعور قطعی طور پر ایسی اساسی حقیقت ہے۔ جس کی کسی دوسری شئی سے توجیہ نہیں ہو سکتی۔

۴۔ پروفیسر ہالڈین (HALDANE) :- اگر ہم شعور کی بھی اسی طرح توجیہ کرنا چاہیں جس طرح طبیعاتی یا حیاتیاتی واقعات ومظاہر کی کرتے ہیں۔

تو یہ کوشش بالکلیہ ناکام رہتی۔

۵۔ سر آرتھر ایڈنگٹن :۔ باطنی ایگو (انا) کسی طرح بھی طبعی کائنات کا جز نہیں ہوسکتا۔ الا آنکہ لفظ طبعی کے سرے سے معنیٰ ہی بدل کر روحانی (SPIRITUAL) کردیں۔

۶۔ آئنسٹائن (EINSTEIN) کی رائے میں بھی نفس و شعور اساسی حقیقت ہے۔[1]

**حل طلب مسئلہ یہ رہ گیا ہے کہ جو یہی محسوسات آ کہاں سے گئے؟**

لہذا حل طلب مسئلہ یہی ہے کہ جن یا جیسے جو اسی محسوسات کا ذہن سے باہر کی دنیا میں کہیں کوئی دور دور تک نام و نشان خود سائنس کو نہیں ملتا۔ وہ انسانی ذہن میں آخر کہاں سے آجاتے یا کیسے پیدا ہو جاتے ہیں۔ نرے سائنس والوں کا جواب یہ ہے کہ خود ہمارا ذہن ہی اپنے کسی نامعلوم جادو یا شعبدہ یا کرتب سے ان کو پیدا کر لیتا ہے ظاہر ہے یہ جواب کیا دراصل لاجوابی یا جہل کا اعتراف ہے۔ ذہن جو خیالات و تصورات علوم و فنون شعر و فلسفہ وغیرہ خود اپنے شعور یا علم و ارادہ سے پیدا کرتا ہے ان کا خالق خود ذہن کا ہونا تو سمجھا سمجھایا جاسکتا ہے۔

لیکن ایسی پوری زمین و آسمان تک کی کائنات جس کے محسوس کرنے میں ذہن بالکلیہ اپنے کو منفعل یا بے بس پاتا ہے اس کو آخر خود اپنے ذہن کی کسی کیمیاگری یا ساحری کا کرشمہ کیسے باور کرلے جس کا خود ساحر کو قطعاً کوئی ادراک نہیں، ہم آنکھ کھولیں اور دیکھی جانے والی چیزوں کو نہ دیکھیں، کان کھولیں اور آوازوں کو نہ سنیں، یہ ہمارے ذہن کے

---

[1] ماڈرن بلیف حصہ نہم صفحہ ۲۵

اختیار میں کب ہے، جو اس کو خود اپنا ہی یا اپنے ذہن کا تخلیقی کارنامہ قرار دے لیں۔ ہاں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ جیسے خواب میں ہمارے ذہن ہی میں سب کچھ ہوتا یا وہی سب کچھ پیدا کر لیتا ہے، اسی طرح پوری زندگی بھی خواب ہی خواب ہو۔ تو ایک تو وہی انانیہ والا لے دے کر صرف میرے ایک ہی انا کا جواب ہو گا، دوسرے اناؤں یا ذہنوں تک کو ماننے کی گنجائش نہ رہ جائے گی۔ پھر خواب میں ہمارا ذہن جو کچھ دیکھتا یا پیدا کرتا ہے، وہ پہلے کی بیداری کے احساسات کے الٹ پھیر ہی نقل و اعادہ یا ان ہی کا کچھ نہ کچھ ترکیبی و تحلیلی ردو بدل ہوتا ہے باقی جس چیز کا کوئی بسیط یا مرکب احساس و ادراک جو ہمارے ارادہ و اختیار کے بغیر از خود حواسی راستوں سے پہلے ہی نہ حاصل ہو چکا ہو اس کو جس طرح ہمارا ذہن اپنی کسی جادوگری سے بیداری میں نہیں پیدا کر سکتا اسی طرح خواب میں اس کو نہیں دیکھ سکتا۔

لہذا ایک طرف اگر انانیہ کے ہم نوا ہو کر صرف اور صرف اپنے ہی انا یا ذہن و ذات کے علاوہ ماں باپ بھائی بہن، بی بی بچوں، عزیزوں دوستوں، پاس پڑوسیوں، ملنے جلنے والوں اپنے ہی جیسے جن بے شمار اشخاص یا اذہان کو موجود یقین کرتے ہیں ان کے وجود کا سرے سے انکار کر دیں۔ اور دوسری طرف بلا دلیل یہ فرض کر لیں کہ اپنے جیسے یہ اشخاص ا وسری سیکڑوں ہزاروں قسم کی جاندار و بے جان جن موجودات کو ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے رہتے ہیں، وہ سب کی سب بے اس کے کہ ہمارے ذہن کے ارادہ و اختیار کیا شعور تک کو کوئی دخل ہو پھر بھی زبردستی مان لیا جائے کہ ان کو پیدا آپ ہی آپ کرتا ہمارا ذہن ہی رہتا ہے مثلاً جس کو آگ کہا جاتا ہے۔ پھر جس کو ہمارا جسم کہا جاتا ہے اور جس کے کسی عضو ہاتھ پاؤں میں آگ لگ کر اس کو جلا دیتی بلکہ کبھی کبھی پورے ہمارے جسم ہی کو بھسم کر کے خاتمہ کر دیتی ہے ان سارے احساسات کو بالکلیہ پیدا تو ہمارا خود ذہن ہی کرتا ہے۔ لیکن اپنی ان مخلوقات کی

تخلیق میں ہے عزیب اتنا لاچار و بے اختیار کہ اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ کم از کم اپنے جلنے اور بالآخر جل مرنے کی ناقابل تحمل اذیت ہی کے احساسات کو نہ پیدا ہونے دے۔

### ایک کلی یا عالمگیر ذہن کے اعتراف پر ہر کوئی مجبور ہے!

خصوصیت سے یہی دو باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر سائنس داں، فلسفی اور عامی سب ہی کو چار و ناچار ماننا پڑتا ہے کہ ہمارے حواسی محسوسات کا منشاو ماخذ کوئی نہ کوئی خود میرے ذات و ذہن سے ماورا حقیقت ہے۔ (۱) ایک تو یہ کہ میرے ہی جیسے دوسرے اشخاص بھی بالکل میرے ہی جیسے احساسات رکھتے ہیں۔ لہذا ان مشترک احساسات کا کوئی نہ کوئی مشترک ماخذ و مبدء بھی ہونا چاہیئے۔ (۲) دوسرے ہم انکے محسوس کرنے میں بالکل بے اختیار یا فاعل نہیں منفعل ہوتے ہیں، اس لیئے ان کی تخلیق کسی اور فاعل ہی کا فعل ہونا چاہیئے۔

ساتھ ہی سائنس ہی کی تازہ ترین تحقیقات سے مسلمہ طور پر یہ بھی متیقن و متعین ہو چکا ہے، کہ انیسویں صدی کے اواخر تک مادہ کے نام سے جو ایک ٹھوس جامد جوہری حقیقت موجود و مسلم مانی جاتی تھی، اس کی جوہریت کا اب مسلمہ طور پر خاتمہ ہو چکا۔ اب اگر اس کے بجائے ذہن سے یا خارج میں کچھ موجود بھی ہے تو الکٹران وغیرہ نام برقی ذرات کی مختل و مجنونانہ حرکات، جو نہ بجائے خود وہ چاند سورج، دریا، پہاڑ، درخت و جانور وغیرہ ہیں، جو ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور نہ ہمارے ان محسوسات کی سی یا ان سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ مماثلت رکھنے والی ان ذرات سے ترکیب و تشکیل یافتہ ہی کوئی شئی نفس ہمارے احساس کرنے والے ذہن سے باہر پائی جاتی ہے۔

پھر بھی عامی آدمی ہی کی طرح سائنس داں اور فلسفی سب ہی کہنا چاہیئے کہ وجدانًا

کم وبیش اپنے محسوسات ہی کی سی یا ان کے مماثل موجودات کو اپنے انفرادی ذہنوں سے ماورا زندگی و بیداری کے ہر لمحہ میں موجود سمجھنے اور ماننے پر بے بس اور مضطر ہیں۔ تو اس مسئلہ کا خصوصاً آج کی سائنسی روشنی میں بھی نسبتہً زیادہ قابل فہم وقبول حل یہی رہ جاتا ہے کہ ہمارے آپ کے انفرادی ذہنوں کے علاوہ ـــ جن میں ہمارے مشترک یا یکساں احساسات رونما یا پیدا ہوتے ہیں ـــ ایک ایسا کلی یا عالمگیر ذہن مانا جائے جس کے اندر یا جس کے علم میں بطور معلومات ایسی ہی اشیا موجود ہیں، جن کا گویا ہم مثنیٰ اپنے انفرادی ذہنوں میں پیدا ہوتے پاتے ہیں۔ اور جن کو وہی کائناتی یا کلی ذہن پیدا کرتا ہے جن میں بطور معلومات وہ اپنا مستقل ازلی و ابدی وجود رکھتے ہیں۔ بجائے اس کے بے ذہن کیا سرے سے بے زندگی مادہ نام کوئی ایسی ازلی ابدی شئی موجود ہو جس سے کسی طرح (خواہ وہ نام نہاد ارتقا ہی ہو) انسانی جیسا ذہن و شعور اور اس کے وہ افکار یا علوم و فنون جنم لے سکیں، جن کا اصل مبدء میں دور دور کوئی نام و نشان نہیں ملتا! قیاس مع الفارق کی منطق کو جھٹلانے کیا اس کی مٹی پلید کرنے کی شاید ہی کوئی دوسری مثال اس سے بڑھ کر فرض بھی کی جاسکتی ہو۔

## برکلے کی اس "کلی ذہن" تک رسائی

فلسفہ کی تاریخ میں اس کلی ذہن تک جیسے صاف سید ھے غیر پیچیدہ وغیر مبہم بلکہ عام فہم راستہ سے رسائی برکلے نے حاصل کی ہے اور جس طرح جدید ترین سائنسی تحقیقات نے اپنی راہوں سے مادہ کی جگہ ذہن کے وجود کو اولیت و اقدمیت عطا کر دی ہے اس کی روشنی میں برکلے ہی کے فلسفہ کو زیادہ قریب الفہم سائنسی فلسفہ کا رنگ دیا جاسکتا ہے۔ یوں تو اس سلسلہ میں رسل و ایڈنگٹن وغیرہ دوسرے رجال سائنس برکلے کا نام لینے سے مفر نہیں پاتے ہیں۔ تاہم راقم ہذا کے علم میں جس طرح جیمس جینز (SIR JAMES JEANS) جیسے صف اول کے سائنس داں نے بالکل

برکلے ہی کی طرح اور اس کے صاف صاف حوالہ سے اس کے استدلال و موقف کو قبول کیا ہے کوئی دوسری مثال نہیں۔

لہذا پہلے خود برکلے کی صاف سیدھی بات کو ذرا سن سمجھ لیں۔ کسی احساس کا بلا احساس کے پایا جانا ناقابل تصور لفظی تناقض ہے۔ مثلاً شکر میں جو شیرینی ہم محسوس کرتے ہیں اس کا خود شکر میں پایا جانا بالکل بے معنیٰ ہے کیونکہ اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ خود شکر ہماری طرح صاحب احساس ہے اور ہماری ہی طرح کی مٹھاس کا احساس وہ بھی رکھتی ہے۔ نیز مٹھاس کے ہمارے احساس سے مماثل و مانند بھی کوئی شئی شکر میں نہیں پائی جاسکتی، اس لئے کہ کوئی احساس دوسرے احساس ہی کے مانند و مماثل ہوسکتا ہے، نہ کہ عدم احساس کے۔ یہی حال کسی شئی کے لمس و بصر وغیرہ کے ہمارے تمام دوسرے احساسات کا بھی ہے کہ جس طرح ہم ان کو محسوس کرتے ہیں، اسی طرح یا اس کے مثل کوئی شئی خود اس شئی میں کیسے موجود فرض کی جاسکتی ہے جو سرے سے ہر طرح کے احساسات ہی سے محروم ہے۔

اس طرح سیدھی سادھی معمولی عقل و فہم اور فلسفہ و سائنس تینوں کے مطالبات اور نقطۂ نظر کو ہم آہنگ بنانے والا حل لے دے کے ایک ہی رہ جاتا ہے۔ یعنی انفرادی ذہنوں کے علاوہ ایک ایسا ہمہ گیر و عالمگیر ازلی و ابدی صاحب علم و قدرت ذہن مانا جائے جس میں ازل سے ابد تک پیدا ہونے والی ساری مخلوقات بطور اس کے معلومات کے موجود ہوں اور جن کو اپنی قدرت و مشیت کے تحت وہ انفرادی ذہنوں میں رونما یا پیدا کرتا رہتا ہو۔

اس صورت میں تمام چولیں اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہیں۔ نہ ذہن کے سوا مادہ نام کوئی بے ذہن جوہر ماننا پڑتا ہے، نہ ان دو کے مابین فعل و انفعال یا تعامل کا لاینحل مسئلہ باقی رہ جاتا ہے نہ یہ دشواری رہ جاتی ہے کہ برقی ذرات کی وہ مختل مجنونانہ حرکات جو ہمارے محسوسات

سے قطعاً کوئی مماثلت نہیں رکھتیں، ان کو آخر ہمارا انفرادی ذہن اپنی کسی ساحری یا شعبدہ سے کیسے ایجاد کر لیتا ہے۔ دراں حالیکہ یہ غریب خود اپنی اس شعبدہ بازی کا کوئی علم و احساس تک نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنے علم و ارادہ کی کسی مداخلت و فعلیت کے بجائے اپنے کو ان خارجی محسوسات کے ادراک میں منفعل کیا سرے سے مضطر پاتا ہے، ساتھ ہی عمومی عقل و فہم (COMMONSENSE) کا یہ مطالبہ بھی من وعن پورا ہو جاتا ہے کہ جن خارجی اشیا کو جیسا ہم محسوس کر رہے ہیں وہی بعینہ ہمارے احساس و ادراک کے بغیر ایک مستقل و مستمر ذہن یا شعور میں بجائے خود ہمیشہ سے موجود ہیں۔ خیال تو کیجیے کہ استمرار مادہ کے دقیانوسی مفروضہ کے مقابلہ میں خود اپنے بالذات جانے پہچانے انفرادی ذہن و شعور ہی کی طرح ایک مستمر و مستقل یا ابدی ذہن و شعور کا مان لینا کتنا زیادہ آسان اور اقرب الی الفہم ہو جاتا ہے۔

## سائنس داں جیمس جینز (JEANS) کی ہمنوائی

اب آگے برکلے جیسے خالص فلسفی کی ہمنوائی میں سر جیمس جینز جیسے سائنٹسٹ کی ترجمانی مذکورہ بالا کی ہے۔

"بہت سی باتوں میں تو ایڈنگٹن اور سر جیمس جینز متفق ہی ہیں...... وہ متفق ہیں کہ ذہن بنیادی حقیقت ہے اور مادہ اس سے ماخوذ (DERIVED) ہے حتیٰ کہ جب ہم ایٹم الکٹران تابکاری وغیرہ تک کی باتیں کرتے ہیں تو وہ ایسی چیزوں کی باتیں جو ہمارے ذہن ہی پر موقوف (DEPEND) ہوتی ہیں۔"

غرض:۔

"ہر وہ شئی جس کا ہم ادراک کرتے ہیں اور سارا سلسلۂ واقعات (طبعیات کی نظر میں کائنات نام تمام تر سلسلۂ "واقعات" ہی کا ہے) ذہنی مظاہر ہی ہوتے ہیں۔"

اور چونکہ یہ سب ذہنی مظاہر ہیں اس لئے جیمس جینز ان کے لئے ایک ایسے کائناتی (یونیورسل) ذہن کو مانتا ہے، جس میں یہ پائے جاتے ہیں...... اور وہ خود (نوعی طور پر۔م) ہمارے ذہنوں سے ملتا جلتا ہے۔"

"انیسویں صدی میں سائنس کائناتِ فطرت (نیچر) کو ایک بہت وسیع و عظیم بھاری بھرکم مشین سمجھنے سمجھانے کی کوشش میں لگی رہی...... لیکن بالآخر خود مختلف سائنسوں ہی کی راہ سے میکانکی توجیہ کی یہ ساری کوششیں برباد ہو کر رہیں۔"

اور جیمس جینز کے نزدیک:۔

"کائنات ایک عظیم صانع ذہن کی صنعت و مخلوق ہی نہیں بلکہ فی الواقع یہ نام ہے اس ذہن کے عین تصورات یا خیالات ہی کا۔"

اس طرح جیمس جینز:۔

"سائنسی راہ سے اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے، جس پر برکلے خالص فلسفیانہ فکری راہ سے پہنچا تھا کہ آسمان و زمین کے سارے اجرام و اجسام ذہن کے باہر کوئی وجود قطعاً نہیں رکھتے۔ جب تک فی الواقع... ان کا ادراک نہیں کرتا ہوتا یا میرے ذہن میں پائے نہیں جاتے یا میری ہی طرح کسی دوسری مخلوق روح کے ذہن میں، اس وقت تک یا تو ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ممکن۔ یا پھر کسی ابدی روح ( ETERNAL SPIRIT ) کے ذہن میں موجود یا اس کے ساتھ قائم ( SUBSIST ) ہونا چاہئیں۔"

غرض:۔

"انتہائی حقیقت ایک اور صرف ایک ہے۔ ابدی و کلی روح یا ذہن۔

باقی سب اس ذہن یا شعور سے وابستہ اس کی ذہنی مخلوقات ہیں۔

بہر نوع :۔

"انتہائی واحد حقیقت ذہن ہی ذہن ہے۔ اور کائنات عظیم مشین نہیں عظیم فکر و فکر (THOUGHT) ہے اور ادراک (PERCEIVING) (THINKING) اس ذہن کی فعالیت یا زیادہ صحیح معنیٰ میں خلاقیت کا ظہور ہے[1]"

جیمس جینز برکلے ہی کی طرح اشیا کے خارجی وجود کا اس معنیٰ میں منکر ہر گز نہیں کہ ہمارے انفرادی ذہنوں سے باہر ان کا کوئی وجود نہیں۔ تاہم :۔

"کسی چیز کے خارجی ہونے کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ غیر ذہنی (NON-MENTAL) ہے اصل نوعیت (نیچر) ہمارے ادراک کی ہر چیز کی ذہنی ہی ہوتی ہے۔ باقی خارجی دنیا جو ہم سب کے لئے مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے کائناتی ذہن کے خیالات THOUGHTS کا نام ہو سکتی ہے جس سے ہم سب رابطہ رکھتے ہیں (ARE IN CONTACT) یا انکا حصہ ہیں[2] (OR OF WHICH WE ALL FORM PART)

اسی سلسلہ میں ایک اور نامی سائنس داں سلیوآن کے ایک انٹرویو میں جیمس جینز نے جو جواب دیا ہے وہ بھی سن لیں۔

"میرا رجحان اس تصوریتی (IDEALISTIC) نظریہ ہی کی طرف ہے کہ

---

[1] اصل میں ادراک و فکر یا شعور سب کے مقابلہ میں فلسفہ و سائنس سب کی چولوں کو اپنی اپنی جگہ ٹھیک ٹھیک بٹھا دینے والی اصطلاح علم کی ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

[2] یہ اقتباسات "ماڈرن بلیف" کے ص۸۶، سے جستہ جستہ ماخوذ ہیں۔

حقیقت شعور ہی ہے اور مادی کائنات شعور ہی سے ماخوذ ہے نہ کہ شعور مادہ سے۔

اور خاص طور پر یاد رکھنے کی بات اسی انٹرویو کے جواب میں یہ ہے کہ تصوریتی فلسفہ کی طرف یہ رجحان برکلے کی طرح نری فلسفیانہ فکر پر مبنی نہیں بلکہ :-

"بڑی حد تک خود جدید سائنسی نظریات کا نتیجہ و حاصل ( OUTCOME ) ہے۔"

# خلاصۂ کلام

بظاہر کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف مادہ کے بجائے ذہنی کائنات فطرت کی اولی و اساسی حقیقت ہونا آج کی سائنس اور سائنس دانوں سب کا قریب قریب سائنسی مسلمہ بن چکا ہے یعنی جس کائنات کو بظاہر ہم اپنے ذہنوں سے باہر محسوس و موجود اور نام نہاد مادہ کی مخلوق جانتے وہ کم و بیش تمام تر ذہن کی ساختہ پرداختہ یا اسی کا تخلیقی کارنامہ ہے۔ دوسری طرف خود ہمارے فانی و انفرادی ذہنوں کا یہ کارنامہ ہونا اتنا بعید از عقل و فہم سمجھا جاتا ہے کہ اس کو ذہن کی فسوں گری و شعبدہ بازی سے تعبیر کرنے کے سوا کوئی قابل فہم توجیہ نہیں معلوم لہذا لے دے کر قابل قبول صرف ایک ہی شق رہ جاتی ہے۔ یعنی نوعی طور پر خود اپنے فانی انفرادی ذہنوں کے مانند و مماثل ایک ابدی یا کائناتی و عالمگیر ذہن کو قبول کر لینا جس کا صاف سیدھا راستہ فلسفہ میں برکلے نے کھول بھی دیا تھا اور ایڈنگٹن کے نزدیک موجودہ سائنسی نظریہ کی بنا پر بھی ایسے کلی کائناتی ذہن کا نتیجہ اخذ کرنا ایک خاصا معقول نتیجہ یا کم از کم سائنسی نظریہ سے ہم آہنگ ہی ہے[۱]

---

[۱] دی نیچر آف دی فزیکل ورلڈ ( THE NATURE OF PHYSICAL WORLD ) ص ۳۳۸

پھر کم از کم سر ایڈنگٹن ہی کے ہم سر جیمس جینز (JEANS) جیسے ایک عظیم سائنس داں کو پوری طرح کھل کر "خود جدید سائنس" ہی نے لفظ بہ لفظ برکلے کا ہم آہنگ کر دیا کہ:۔

"انتہائی حقیقت ایک اور صرف ایک ہی ہے۔ ابدی و کائناتی روح یا ذہن۔ باقی سب اسی ذہن یا شعور سے وابستہ یا اسی کی مخلوقات ہیں"

پھر عجیب ہی عجیب بات کے سوا اس کو کیا کہئے کہ برکلے کا اس سلسلہ میں نام لینے والے بعض اکابر سائنس تک کھل کر اس کے منطقی نتیجہ کو قبول کرنے سے کتراجاتے ہیں۔ بڑی وجہ اسکی ایک ہی ہے کہ گو خود سائنس نے علمی طور پر مادیت کے کیا سرے سے مادہ ہی کے وجود کو نابودگی کے درجہ تک پہونچا دیا ہے۔ لیکن موجودہ صدی سے پہلے دو تین صدیوں میں مسلسل مادہ کو جس طرح ایک ٹھوس جوہری حقیقت سمجھ کر قدرۃً اور خصوصاً سائنسی حلقوں میں مادیت ہی کے فلسفہ کا بھی زور ہو گیا تھا۔ جس سے اگرچہ لامذہبیت کے لئے کوئی منطقی دلیل ہاتھ نہ آتی تھی اور بالعموم سائنسدانوں کو "لاادریت" (AGNOSTICISM) میں پناہ لینی پڑتی تھی، تاہم مذہب بیزاری نہ سہی، مذہب سے بے پرواہی، روشن خیالی کا لازمہ اور فیشن بن گیا تھا۔

ان زیر تحریر اوراق کے مباحث ہی پر طبعیات کے ایک استاد سے کچھ گفتگو چل رہی تھی سر جیمس جینز (JEANS) کے نام پر بھڑک کر کہنے لگے کہ وہ تو پادری اور مذہبی آدمی تھا میں نے کہا کہ یہ فرمائیے کہ اس کی سائنسی عظمت میں تو کوئی کلام نہیں، پھر اس کی کسی رائے میں اگر اس کی مذہبیت یا مذہبی تعصب سے متاثر ہونے کی بنا پر کلام کیا جا سکتا ہے، تو پھر دوسری طرف لامذہبوں کو لامذہبیت کے تعصب سے کیسے پاک مان لیا جا سکتا ہے۔ یہ تو برکلے کے دلائل سے لاجواب ہو کر لگانے والوں نے اس پر بھی الزام لگایا تھا کہ اس کا فلسفہ علم فلسفہ سے زیادہ علم کلام تھا۔ بایں ہمہ وہ اپنے بعد کے جدید فلسفہ کی تعمیر کے حق میں اس کا یہ علم کلام ایسا انقلابی

موڑ یا سنگ میل ثابت ہو کر رہا کہ کوئی کٹر سے کٹر معاند و مخالف بھی اس کی فلسفیانہ عظمت کو تاریخ فلسفہ سے مٹا نہیں سکتا۔ اسی طرح سر جیمس جینز (JEANS) کے سائنسی فلسفہ کو اگر کوئی سائنسی علم کلام کہہ دے، تو اس سے نہ اس کی عظمت پر کوئی حرف آتا ہے، نہ اس کے سائنسی فلسفہ کی صحت پر۔ بلکہ جس طرح برکلے کے انکار مادہ کے دلائل سے زچ ہو کر جوش و غصہ میں اس کے کسی دوست جانسن نے ایک پتھر کو زور سے ٹھوکر مار کر کہا تھا کہ تمہاری دلیل کا جواب یہ ہے۔ اسی طرح آج کی سائنس میں ہزاروں فٹ بلند اور ہزاروں میل لمبے چوڑے رقبہ والے ہمالیہ پہاڑ کو ٹھوکر مار کر ذہن سے باہر پایا جانے والا کوئی ٹھوس مادی یا جوہری وجود ثابت کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔

پھر بھی اگر سائنس فلسفہ اور معمولی فہم (COMMONSENSE) سب کا یہ ایک بالکل وجدانی و اضطراری فطری مطالبہ ہے، کہ کائنات فطرت کا ہمارے انفرادی ذہنوں سے ماورا کوئی نہ کوئی اپنا بجائے خود مستقل و مستمر یا ابدی وجود ہونا ہی چاہیئے تو کسی نہ کسی رنگ و تعبیر میں برکلے کی ابدی روح یا سر جیمس جینز (JEANS) کے آفاقی ذہن[1] ہی کی واحد شق زیادہ قریب الفہم رہ جاتی ہے جس کی پوری بحث "سائنس اور مذہب" کے تحت انشاء اللہ آگے آتی ہے۔ برکلے کا تو پورا فلسفہ خود اس کی اصل کتابوں کے ترجمہ کی صورت میں اردو میں منتقل ہو چکا ہے۔ آگے جیمس جینز (JEANS) کی خود اصل کتاب "پر اسرار کائنات" ("MYSTERIOUS UNIEVRSE") برکلے کی لفظی و معنوی تائید و توثیق ملاحظہ ہو جو آج کے سائنسی نظریات کا حاصل ہے۔

> "موجودات کے خارجی (OBJECTIVE) یا حقیقی (REAL) وجود کی حقیقت صرف یہی ہے اور ہو سکتی ہے کہ وہ کسی ابدی روح کے ذہن میں

---

[1] ممدوح آفاقی مقدمہ نگاروں نے کلی یا کائناتی کے بجائے "آفاقی" کی اصطلاح جو اختیار فرمائی ہے سب سے بہتر وہی ہے

مستقل طور پر پائے جاتے ہوں۔"

البتہ غلط فہمی یہ ہو سکتی ہے کہ:۔

"اس طرح میں حقیقت ( REALISM ) کو بالکلیہ ختم کر کے اس کی جگہ میں تصوریت ( IDEALISM ) کو دے دینا چاہتا ہوں۔ حالانکہ ایسا سمجھنا صورت واقعہ کی بہت ناقص یا بھونڈی ( CRUDE ) تعبیر ہو گی۔"

فیصلہ کن بات یہ ہے کہ:۔

"جواہر ( SUBSTANCES ) کی حقیقی ماہیت ( REAL ESSENCE ) ہمارے علم کی رسائی سے ماوراء ہے (بلکہ ہمیشہ ہی رہے گی۔م) تو پھر تصوریت اور حقیقت کو جدا کرنے والا خطِ فی الواقع بہت دھندلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور اس کی حیثیت گذرے زمانہ کی اس داستان پارینہ سے کچھ ہی زیادہ رہتی ہے، جبکہ حقیقت کو میکانیت ( MECHANISM ) کے ہم معنیٰ باور کیا جاتا تھا۔"

ورنہ خارجی حقیقتیں اس معنیٰ میں بہر حال:۔

"موجود ہیں کہ بہت سی چیزیں تمہارے اور میرے تصور ( CONSCIOUSNESS ) کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہیں۔"

اس لئے وہ میرے تمہارے کسی انفرادی ذہن کی آفریدہ نہیں، بلکہ ان کا مبدر و ماخذ یا سرچشمہ ہمارے ذہنوں سے کہیں باہر ہی ہونا چاہیئے۔

باقی اس کے آگے جو ہم ان کو حقیقی ( REAL ) یا تصوری ( IDEAL ) فرض کرتے ہیں تو اس کا ہم کو کوئی حق نہیں۔ بلکہ میرے نزدیک اس کا صحیح ٹھپہ (لیبل) ریاضیاتی ہو گا بشرطیکہ ہم اس پر اتفاق کر لیں کہ مراد اس سے خالص خیال

(PURE THOUGHT) ہے...... کیونکہ اس ٹھپے سے یہ بالکل معلوم
نہیں ہوتا کہ اشیا کی انتہائی بجائے خود ماہیت (ULTIMATE ESSENCE)
ہے کیا۔ بس صرف کچھ اتنی بات کا علم حاصل ہو جاتا ہے کہ اشیاء عمل کیسے کرتی ہیں
(HOW THEY HAVE BEHAVE)

سر جیمس جینز (JEANS) کو ایک ماہر ریاضیات کی حیثیت سے ریاضیاتی تعبیرات میں اتنا غلو ہو گیا ہے کہ اس نے ابدی ذہن یا روح کو بھی ایک عظیم ریاضیاتی خالق کائنات سے تعبیر کیا ہے، لیکن یہ معاملہ "مہر کیسے را اصطلاحے دادہ ایم" سے زیادہ نہیں۔ نہ ریاضیاتی ٹھپہ کا مطلب وہ یہ لیتا ہے کہ:۔

"مادہ کا وجود محض فریب نظر یا خواب و خیال ہے۔ بلکہ مادی دنیا بدستور جوں کی توں ایسی ہی جوہری (SUBSTANTIAL) بنی رہتی ہے جیسی کہ ہمیشہ سے تھی اور سائنسی یا فلسفیانہ خیالات میں خواہ کیسا ہی انقلاب آ جائے یہ بات میرے نزدیک ہمیشہ ہی درست رہے گی۔"

بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ ہمارے محسوسات یا محسوس جوہری دنیا کو فریب نظر اور خواب و خیال وہ سائنس داں بنا دیتے ہیں جو ہمارے محسوسات کو ہمارے انفرادی ذہنوں سے باہر مستقلاً جوں کی توں موجود ماننے کی جگہ خارجی وجود صرف کچھ برقی ذرات کی مجنونانہ حرکات کا مانتے ہیں۔ برخلاف اس کے برکلے اور جیمس ان کا ابدی روح یا ذہن میں بالکل ایسا ہی وجود مانتے ہیں جیسا کہ ہم اپنے انفرادی ذہنوں میں اس کا بالکل تنی ہی موجود جانتے ہیں۔

یا بقول جیمس جینز (JEANS) ہی کے:۔

"دہم یا خواب و خیالی ہونے کا اعتراض صرف انانیہ (SOLIPSIST)
پر

پڑتا ہے جن کا دعویٰ ہے (کہ موجود صرف میرا ذہن ہے۔باقی اور۔م) جو کچھ بھی موجود ہے فقط میرے ہی ذہن میں موجود ہے۔"

بہرحال جس طرح برکلے ہی کی ہم نوائی یعنی یہ صحیح ہے کہ:۔

"ذہن کا کوئی احساس و تصور یا خیال ظاہر ہے کہ ذہن ہی میں پایا جائے گا ذہن سے باہر نہیں پایا جاسکتا" کیونکہ کوئی خیال یا تصور صرف خیال و تصور ہی کے مماثل ہو سکتا ہے۔"

اسی طرح اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ:۔

"زمین آسمان کی ازلی و ابدی کائنات میرے تمہارے کسی انفرادی ذہن کا تصور و خیال ہے کہ اگر ہمارے انفرادی ذہن نہ ہوں، یا وہ خیال و تصور نہ کر رہے ہیں تو کائنات بھی نہ ہو اور پھر جب وہ تصور کریں تو موجود ہو جائے۔"

غرض جس کو مادی کائنات کہا جاتا ہے:۔

"ہے تو یہ بھی بالکلیہ ذہن ہی ذہنی یا تصوری ہی تصوری، مگر ایک ابدی ذہن کا تصور۔"

برکلے ہی کے خالص تصوریتی فلسفہ کی تائید مزید آج کی خالص سائنسی زبان میں کچھ اور جمیس جینز ( JEANS ) ہی کے سے ترجمان سے سن لینے اور خاص طور پر:۔

"ہمارے یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ خود سائنسی مادی کائنات کی ماہیت کے بارے میں ہم کو کچھ نہیں بتلاتی..... نظریۂ اضافیت کی رو سے (صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ۔م) جو چیزیں ہمارے حواس کو ایک سخت ( HARD ) اور

پائدار (مثلاً پتھر کا) ڈلا ماڈ میلا معلوم ہوتی ہیں، وہ درحقیقت صرف واقعات (EVENTS) کی ایک لڑی یا سلسلہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔"

حالانکہ:۔

"مادہ کا ٹھوس پن یا سختی و پائداری ہی وہ چیز تھی جس کی بنا پر پرانے قائلین مادیت نے اس کو ذہن کے ناپائدار یا آنی جانی (FLEETING) خیالات سے بالکل ایک مختلف حقیقت سمجھ بیٹھے تھے۔ مگر اب یہ ثابت ہو کر رہا کہ ٹھوس ٹھس مادہ جن واقعات سے مرکب یا بنا ہوتا ہے وہ بھی بالکلیہ ذہنی خیالات ہی کی طرح آنی جانی (یا فانی) ہوتے ہیں۔"

مزید برآں:۔

"سائنس خود ان واقعات کی نوعیت و ماہیت کا بھی ہم کو کوئی پتہ نہیں دیتی ...... اور اسی بنا پر مادہ اور ذہن کا ایک دوسرے پر عمل یا باہمی تعامل (INTER-ACTION) بھی اب کوئی مستبعد بات (PARADOX) نہیں رہ جاتی۔"

ہر پھیر کر:۔

"جیمس جینز (JEANS) کے نزدیک مادہ اور ذہن کی ایک دوسرے سے دو الگ الگ دنیائیں سرے سے پائی ہی نہیں جاتیں۔ اس کی رائے میں خود جدید طبعیات (فزکس) ہی ہم کو اس طرف لے جاتی ہے کہ ساری موجودات کی تہ میں جو حقیقت کارفرما ہے وہ ذہن یا روح (SPIRIT) ہی کی نوعیت رکھتی ہے۔ اور تمام مادی مظاہر جس صورت سے ہمارے

حواس کے لئے رونما ہوتے ہیں، وہ دراصل ان کے پس منظریا تہ میں پائی جانیوالی ذہنی یا روحانی حقیقت ہی کا ہمارے لئے ظہور (یا با اصطلاح صوفیہ تجلی۔م) کا طریقہ ہے۔"

اور ذہن سے ماوراکسی خارجی مادہ یا مادی کائنات کا وجود تو کیا ہوتا خود وہ مکان و زمان یا جگہ اور وقت تک جس میں پائے بغیر کسی خارجی مادی کائنات کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی جو شئے نہ کسی جگہ پائی جاتی ہو نہ کسی وقت اس کے خارج میں پائے جانے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔ اور اب آئنسٹائن کے مسلمہ سائنسی نظریۂ اضافیت کے بعد مکان و زمان بذات خود ذہنی یا ذہن ہی کی تخلیق (CREATION) قرار پا گئے ہیں بلکہ جیمس جینز (JEANS) کی تعبیر میں کائناتی ذہن اور مذہب کی تعبیر میں خدائی ذہن کی مخلوق یا اور صاف صاف عین اس کا خیال ہی خیال ہیں، زیادہ صحیح و اسلم تعبیر خدائی خیال (THOUGHT) کے بجائے خدائی علم کی ہوگی۔ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

یہاں خاص طور سے سمجھنا سمجھانا یہ ہے کہ جیمس جینز (JEANS) اپنی خالص سائنسی بصیرت ہی سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے، جس پر برکلے خالص فلسفیانہ راہ سے پہنچا تھا، اور جس برکلے ہی کے لفظوں میں بڑی توثیق و تائید کے ساتھ دہرایا ہے کہ آسمان و زمین کی ساری موجودات یا:۔

ایک لفظ میں تمام وہ اجسام جن سے ہماری دنیا کا یہ عظیم الشان زبردست ڈھانچہ عبارت ہے ان کا ذہن کے باہر یا ذہن کے بغیر کوئی بجائے خود جوہری وجود نہیں...... جب تک میں خود ان کا فی الواقع ادراک نہیں کر رہا ہوتا میرے ذہن میں پائے نہیں جاتے یا (میری طرح کی) کسی دوسری مخلوق

روح میں اس وقت تک یا تو ان کا سرے سے کوئی وجود ہوتا ہی نہیں یا پھر وہ کسی ابدی روح (ETERNAL SPIRIT) میں پائے جاتے یا اس کے ساتھ قائم ہوتے ہیں "

اس صورت میں جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا جیمس جینز کے نزدیک مکان وزمان اور اس کی متناہیت و نامتناہیت وغیرہ کے مسائل ہیں کوئی ممہ نہیں رہ جاتے:۔

"نہ کائنات کی اتھاہ وسعت وخلائیت (EMPTINESS) اور اس میں ہماری بظاہر حقیر انسانی ہستی کوئی حیرانی وپریشانی کی بات رہتی ہے کیونکہ ہم خود اپنے یا دوسروں کے خیال وذہن کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے خواہ کتنی ہی عظیم وجسیم قد وقامت کی ہوں دہشت زدہ نہیں ہوتے......

نہ ہم کو مکان کی متناہیت (یا نامتناہیت۔م) کی الجھن میں پڑنے کی ضرورت رہتی ہے۔ جیسا کہ خواب کی صورت میں ہمارے لئے یہ کوئی تجسس و تشویش کی بات نہیں ہوتی کہ ہماری حد نظر کی چار دیواری کے پار کیا ہے"[1]

غرض اس طرح جیمس جینز کے نزدیک:۔

"ہم ایک خالص یا فکر وتصور (THOUGHT) کی دنیا میں آباد ہیں، اور واحد انتہائی حقیقت ذہن ہی ذہن ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ (موجودہ سائنس کی روسے۔م) کائنات عظیم مشین ہونے کے بجائے عظیم فکر (GREAT THOUGHT) معلوم ہونے لگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصل بنیادی وجود (EXISTENCE) ذہن ہے اور

---

[1] ماڈرن بلیف صفحہ ۸۹

ادراک و فکر PERCEIVING AND THINKING اسی ذہن کی فعالیت ( ACTING ) کا نموذ ( EXPRESSING ) ہے۔"

تاہم جیمس جینز ( JEANS ) اس کا قائل نہیں کہ ذہن معنیٰ :۔

"ہر شئی ذہنی ( SUBJECTIVE ) ہے (کہ صرف انفرادی ذہن میں پائی جاتی ہے۔ م) وہ خارجی حقائق کے وجود کو مانتا ہے۔ کیونکہ بہت سی چیزیں تمہارے میرے اور سب کے ذہنوں کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہیں۔ ہم سب قریب قریب بالکل ہی اور یکساں خارجی دنیا کا ادراک یا احساس رکھتے ہیں"

باقی :۔

"وہ خارجی کائنات جس کو ہم سب یکساں طور پر محسوس کرتے ہیں (وہ ہمارے انفرادی ذہنوں کے بجائے۔ م) ایک ایسے کائناتی ذہن میں پائی جا سکتی ہے جس سے ہم سب رابطہ ( CONTACT ) رکھتے ہیں یا جس کے ہم سب حصے ( PARTS ) ہیں"

سر جیمس جینز ( JEANS ) فلکیات و طبعیات اور ریاضیات کا ایک بڑا مستند و مسلم عالم ہے۔ ایک دوسرے عالم سائنس ہی سلیوان کو ایک انٹرویو میں ایک سوال کا جو جواب دیا ہے وہ اس کی سائنسی فلسفہ و رجحان کا مختصر سا ہی واضح لب لباب ہے:۔

"میرا رجحان اس تصدیقی ( IDEALISTIC ) نظریہ کی طرف ہے کہ بنیادی حقیقت شعور ( CONSCIOUSNESS ) ہے۔ باقی ساری کائنات اس سے ماخوذ ( DERIVED ) ہے۔ نہ کہ خود شعور مادی کائنات سے ایسی صورت میں لازماً یہ کائنات کسی بخت و اتفاق کا نہیں بلکہ سوچے سمجھے فکری و شعوری

تصور پر مبنی ہے۔"

آگے خاص طور پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ:۔

"تصوریت کی طرف میرا یہ رجحان بڑی حد تک نتیجہ ہے خود سائنسی نظریات کا۔ مثلاً عدم جبر (INDETERMINACY) کا اصول ہم کو اس پرانے سائنسی نظریہ سے نجات دے دیتا ہے کہ فطرت (نیچر) اٹل جبری قوانین کے تابع ہے مجھکو کائنات عظیم مشین سے زیادہ عظیم فکر ہی کے قریب نظر آتی ہے۔"

ایک اور ضمنی شبہہ کا جواب کہ:۔

"دنیا میں مصائب و آلام کا پایا جانا بھی میرے نزدیک کسی فکری منصوبہ کے منافی نہیں۔ کیونکہ شر بطرے خیر کے ظہور کے لئے ناگزیر ہو سکتا ہے۔ جیسے خطرہ ہمت و جرأت کیلئے ناگزیر ہے۔"[1]

---

[1] ص ۸۹، و ص ۱۴۰ ماڈرن بلیف
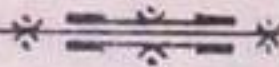
انی انا اللہ لا الٰہ الا انا

# سائنس اور مذہب

موٴمن آؤ تمہیں بھی دکھلاؤں سیر بت خانے میں خدائی کی

یعنے

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

یاد رکھنے کی پہلی بات یہ ہے کہ اصولاً سائنس اور مذہب کا موضوعِ بحث اور ان کے مسائل و حدود بالکل جدا جدا ہیں[1]۔ سائنس اپنے محدود دائرہ میں کائناتِ ہستی کی صرف درمیانی داستان سناتی ہے۔ بالذات کائنات کی ابتدا و انتہا کے سوالات سے سائنس کو نہ سروکار نہ اس کی رسائی۔ یعنی موجوداتِ عالم کا جو رخ براہِ راست یا ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتا ہے سائنس کا کام بس اس کے باہمی روابط و علائق کے قوانین و قواعد کا انضباط ہے۔ بہ الفاظ دیگر قرآنی اصطلاح میں سائنس کا اصل موضوع بحث و تحقیق صرف عالم شہادت

---

[1] یہ بحث "مذہب اور عقلیات" میں قابل ملاحظہ ہے

یا بہ اصطلاح فلسفہ عالم مشاہدات و مظاہر (PHENOMENA) ہے باقی اس عالم شہادت یا مظاہر کے پس پردہ اس کے غیب اول و آخر اور باطن میں کیا حقیقت (REALITY) چھپی ہوئی کار فرما ہے۔ یہ انسانی علوم میں فلسفہ خصوصاً فلسفہ مابعد الطبعیات کا دائرہ بحث رہا ہے۔ اس دائرہ میں ہماری انسانی عقل و منطق کو رہنمائی چاروناچار ہستی کی درمیانی داستان کے مطالعہ و مشاہدہ ہی سے حاصل کرنا پڑتی ہے۔

یہ درمیانی مشاہدات و تجربات نوعی طور پر دو مختلف بلکہ متضاد صورتوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو ہم خود اپنی ذات و ذہن سے بظاہر بالکل باہر ایک خارجی مکان و زمان کی نامحدود وسعتوں میں ان گنت گوناگوں رنگ و روپ ہیئت و صورت اور قد و قامت کی جاندار و بے جان جسمانی صورتوں میں زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا پاتے ہیں۔ کچھ ان جسمانی موجودات کا گویا آنکھوں دیکھا خارجی وجود اور بہت کچھ اپنی زندگی کی ہر روز کیا ہر لمحہ کی حاجتوں کی ان سے وابستگی کی بنا پر یہ خارجی دنیا اور اس کی اہمیت ہماری نظروں میں اتنی کھپ جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں خود اپنی ذات و ذہن کی داخلی دنیا کی کسی اہمیت و معنویت کی طرف التفات نہ ہونے ہی کے برابر رہتا ہے۔ بس کچھ بچوں جیسا حال کہ ان کی ساری توجہ کھانے پینے کھیل کود کی چیزوں میں ایسی بٹی رہتی ہے کہ خود اپنے وجود کا شعوری احساس تک نہیں ہوتا، یا جیسے کوئی دلچسپ کھیل تماشا دیکھنے میں عوام و خواص ہر ایک پر ایسی محویت طاری رہتی ہے کہ بس تماشہ ہی تماشہ کے سوا خود تماشائی یا خود اپنی ذات کے معاملہ میں خود فراموشی کا عالم رہتا ہے۔

اور اس عالم شہادت کی عام عملی زندگی کے لئے عین تکوینی حکمت و مصلحت بھی یہی تھی کہ خارجی دنیا کو آدمی ویسا ہی جوں کا توں اپنی داخلی ذات و ذہن سے باہر بذات خود مستقلاً

موجود سمجھتا یا جانتا رہے، جیسا کہ حواسی مشاہدہ و تجربہ میں دن رات محسوس ہوتی رہتی ہے مغالطہ فقط ایک ہی ہوا، وہ بھی صاف سیدھی معمولی عقل و فہم (COMMONSENSE) کو نہیں، بلکہ نام نہاد غیر معمولی فلسفیانہ اور سائنسی فکر و تحقیق والوں کو۔ ان ہی میں ایک جماعت نے دھوکا یہ کھایا کہ ہماری ذات و ذہن سے باہر ہمارے ہی جیسے باشعور انسانوں کے پہلو بہ پہلو ان سے بہت زیادہ کثرت تعداد میں اور پہاڑوں سمندروں جیسی بلکہ ان سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر عظیم و مہیب اجرام سماوی کی جسمانیتوں کی جو ایک اتھاہ کائنات پھیلی ہوئی ہے، ہو نہ ہو ان ہی کنکر پتھر جیسے بے ذہن و زندگی والے جمادی جسموں ہی کے کسی نہ کسی حصے نے اربوں کھربوں سال کے دوران اپنے ہی اندر کے کسی نہ کسی الٹ پھیر سے انسانی ذہن ابھر آیا۔ پھر ان بے شعور و بے ذہن اجسام ہی کو مادہ کا ایک کلی یا تجریدی[۱] نام دے دیا۔ اس مادہ کی کسی ابتدائی ہیولائی (برنگ ارسطو) یا ذراتی (برنگ دیمقراطیس) صورت نے بلا کسی بیرونی عامل کی مداخلت کے آپ ہی آپ ساری سماوی و ارضی جمادی دنیا کی طرح حیوانی و انسانی موجودات کو بھی کسی نہ کسی طرح اپنے پیٹ سے جنم دے دیا۔ ایسی بے ذہن گیا سر سے سے بے زندگی ٹھوس ٹھس مادہ سے ساری مخلوقات کی خود بخود تخلیق کے نظریہ کا نام مادیت ہے۔ کندہ ناتراشیدہ مادہ کا یہ فلسفہ خود قدیم و جدید فلسفہ کی سرزمین میں تو زیادہ پنپ نہ پایا۔ البتہ جدید سائنس کی ابتدائی ڈیڑھ صدیوں میں اس کی فتح کا نقارہ اس زور سے پیٹا گیا کہ اس کے برعکس عین اسی دور کے کہنا چاہیے پورے جدید فلسفہ کی تصوریتی تاریخ طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

بالآخر انیسویں صدی کے اواخر سے خود سائنس نے ایسا پلٹا کھایا کہ بڑے سے بڑے

---

[۱] اس تجریدی کلیات سازی کے لئے فلسفۂ برکلے (شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ) کا ضمیمہ بعنوان "تصورات کلیہ" پڑھنے سے انشاء اللہ ذہن صاف ہو جائے گا۔

رجال سائنس کو عین سائنسی تحقیقات و اکتشافات کی راہوں سے بالکل برعکس نہضہ نام زنگی کا نور" کا اکتشاف ہو کر رہا اور بر کلے جیسے قطعی منکر مادہ فلسفی تک کی بولیاں بولی جانے لگیں۔[1]

اتنا بہر نوع مسلم ہی ہو کر رہا کہ ہمارے ذہن سے باہر اگر کوئی نام نہاد مادی دنیا پائی بھی جاتی ہے، تو وہ الکٹران وغیرہ برقی ذرات کی صرف مجنونانہ حرکت ہے۔ پھر خود برق یا برقی ذرات کی بجائے خود حقیقت نامعلوم ہی نامعلوم ہے۔ باقی وہی ہماری زمین سے آسمان تک کی حواسی اور اکات والی دنیا جس کو ہم تمام تر ذہن سے باہر محسوس کرتے رہتے ہیں، بلکہ خود اپنا یہ شمار اندرونی بیرونی اعضا و جوارح والا چلتا پھرتا جسم تک ہمارے اپنے ذہنوں سے باہر قطعاً نابود ہی نابود اور بالکلیہ ذہن ہی ذہن کی تعمیر و تخلیق ہوتا ہے اور ذہن سے خارج ان کا ان کے مماثل یا ملتی جلتی چیزوں کا بھی دور دور کوئی وجود نہیں ہوتا

دیکھنے سے بھی زیادہ ہم کو ٹھوس (SOLID) اجسام یا ٹھوس مادہ کے خارجی وجود کا مغالطہ چھونے ٹٹولنے ٹکرانے وغیرہ کے لمسی احساسات سے ہوتا ہے۔ اس کی بجائے خود سائنسی یا طبعیاتی حقیقت کیا ہوتی ہے برٹرنڈرسل کی زبان سے اوپر سن آئے۔ آگے پھر تازہ کر لیں کہ:۔

"جس چیز کو تم ٹھوکر مارتے ڈھکیلتے، دھکا دیتے یا جس سے ٹکرانے ہو اس کو توبظاہر حقیقی و واقعی (یا بجائے خود خارج میں موجود۔م) ہونا ہی چاہیے۔ یہی عام آدمی کی مابعد الطبعیات ہے"

لیکن عالم طبعیات اس کے بالکل برخلاف:۔

"ثابت کرتا ہے کہ تم فی الواقع کبھی کسی چیز سے سرے سے ٹکراتے ہی نہیں حتی کہ

---

[1] جیسا کہ اوپر بہ تکرار و بہ تفصیل پڑھ آئے۔

جب تمہارا سر مثلاً پتھر کی کسی دیوار سے ٹکراتا ہے تو واقعہ وحقیقت کے اعتبار سے تم اس کو چھوتے یا مس تک نہیں کرتے ہو...... ہوتا دراصل صرف اتنا ہے کہ کچھ الکٹران اور پروٹان جو تمہارے جسم کا حصہ ہوتے ہیں ان میں اور اس چیز کے الکٹران وپروٹان میں جس کو تم سمجھ رہے کہ چھو رہے ہو صرف جذب و دفع ( ATTRACTION & REPULSION ) کا عمل ہوتا ہے۔ لیکن اس عمل میں کوئی نفس الامری لمس یا اتصال ( CONTACT ) قطعاً نہیں پایا جاتا پس تمہارے جسم اور اس دوسری چیز کے جسم کے الکٹرانوں اور پروٹانوں کے قرب کی وجہ سے ان میں ایک ہیجان ( AGITATED ) پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی ہیجان واختلال جو تمہارے اعصاب کے واسطے سے دماغ تک پہنچتا (یا اس کو متاثر کرتا ہے۔ م) طبیعیاتی طور پر وہ تاثر وتصور پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے، جس کو کسی چیز کا لمس اتصال (یا اس کو چھونا ٹکرانا) کہا جاتا ہے۔"

حد یہ کہ بلا اس کے تم واقعاً کس چیز کو چھو یا ٹکرا رہے ہو۔

"مناسب اختیارات ( EXPERIMENTS ) کے ذریعہ سے بالکل ایسا ہی (چھونے ٹکرانے کا م) مغالطہ یا دھوکا دینے والا ( DECEPTIVE ) احساس بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔"[1]

غرض سائنسی یا طبیعیاتی طور پر الکٹران وپروٹان وغیرہ کے حس کی ذراتی ہیجان کے سوا دیکھنے سونگھنے چکھنے، آنکھ کان ناک اور زبان کے رنگ وبو مزہ وغیرہ کے دوسرے

---

[1] شک پسندی صد ۹۲ THE WILL TO DOUBT شائع کردہ ویزڈم لائبریری ("THE WISDOM LIBRARY")

حواسی ادراکات کا کیا ذکر جن چیزوں کی سختی نرمی گرمی سردی وغیرہ خود اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح ٹٹول کر محسوس کرتے ہو بجائے خود وہ تمہارے احساسات جیسی یا ان سے ملتی جلتی خود تمہارے ذہن سے بالکل نہیں پائی جاتی۔

اسی سائنسی حقیقت کا اعلان اور ایک مثال سے سر اڈنگٹن کی زبان سے بھی سن لیں جو شاید کہیں اوپر بھی گذر چکی ہے:۔

"ہمارے ذہنی احساسات خارجی اشیا سے کوئی شمہ بھر بھی مماثلت و مشابہت نہیں رکھتے۔ مثلاً میز سے تعلق رکھنے والے جو پیام (MESSAGES) یا اثرات ہمارے اعصاب کے واسطہ سے سفر کرتے ہیں اور ان سے ہمارے اعصاب میں جو ہیجان یا اختلال (DISTURBANCE) رونما ہوتا ہے وہ نہ (ذہن سے باہر کے) کسی خارجی میز سے کوئی مشابہت رکھتا ہے اور نہ میز کے اس تصور سے جو ہمارے شعور یا ذہن میں پیدا ہوتا ہے"

دوسرے اجسام میز کرسی وغیرہ کو جانے دیں تو اپنے ہی جسم کی جسمانی یا مادی حقیقت پھر برٹرنڈ رسل ہی کی زبان سے سنئے کہ:۔

"جس کو اب تک ہم اپنا جسم یا بدن (BODY) کہتے رہے ہیں۔ وہ درحقیقت بڑی دیدہ ریزی سے بنائی ہوئی صرف ایک سائنسی تشکیل (CONSTRUCTION) ہے جس کے مطابق (خارج میں) کوئی طبعیاتی حقیقت قطعاً نہیں پائی جاتی"

اسی سلسلۂ بحث میں چند سطر آگے اسی رسل کو یہاں تک کہہ دینا پڑا ہے کہ:۔

"اس طرح مادہ بالکل ایک ایسا بھوت بن کر رہ گیا ہے، جو ذہن کو ہانکنے

(یا ذہن پر عمل کرنے کا۔م) کا کوئی ٹھیک ڈنڈا نہیں بن سکتا ہے[1]

پھر بھی سچ یہ ہے کہ یہ بھوت خود رسل کے سر سے پوری طرح اتر نہیں سکا جس کا بڑا سبب جدید ترین سائنس کی منطق نہیں بلکہ خود رسل کی "شک پسند" یا منکرانہ نفسیات اور اس سے بھی زیادہ بیسویں صدی کی سائنس سے پہلے مسلسل دو تین صدیوں تک جدید سائنسی دور پر بہت بڑی حد تک مادیت ہی مادیت کا چھایا رہنا ہے۔

بلکہ سچ یہ ہے کہ مادہ کا یہ بھوت عوام سے زیادہ بالکلیہ خواص یا حکما و فلاسفہ کا دماغ زائیدہ یا من گھڑت ہے۔ ورنہ عوام کی صاف سیدھی منطق تو وہی رہی ہے، جس پر آج بیسویں صدی کی سائنس کو خود اپنی منطق سے پہنچنا پڑا ہے۔ یعنی ہمارے علم کی اولین حضوری و بدیہی بنیاد خود ہمارا ذہن و شعور اسی کی دنیا اور اسی کے تجربات ہیں۔

پھر خود اپنی ذات یا ذہن و شعور کے اِن براہِ راست حضوری تجربات ہی پر قیاس کر کے عام آدمی کے لئے جن کو وحشی جنگلی تک کہا جاتا ہے، یہ ماننا زیادہ فطری و قرین قیاس اور قابلِ فہم ہوتا ہے کہ دریا پہاڑ، ابر و باد، چاند سورج ساری موجوداتِ فطرت کے افعال و حرکات کی تہ میں کوئی ایسا ہی ذہن و شعور والا ارادہ کارفرما ہے جیسا کہ ہمارے اندر خود ہمارے جسمانی اعضا کو کام میں لانے والا ہمارا ذی شعور ارادہ کام کرتا رہتا ہے۔

سرِ راہ ایڈنگٹن ہی جیسی سائنسی شخصیت کی زبانی پھر سنتے چلیں کہ سائنسی قوانین اور وحشیوں کے بھوتوں پریتوں یا دیبی دیوتاؤں میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ نیوٹن کے غیر مرئی یا اَن دیکھے قانون کشش تک غیر متمدن وحشیوں کے اَن دیکھے بھوت پریتوں کا سا ہی کچھ معاملہ ہے۔

---

[1] ("THUS MATTER HAS BECOME ALTOGETHER TOO GHOSTLY TO BE USED AS AN ADEQUATE STICK WITH WHICH TO BEAT THE MIND") صـ۳۰

"کائنات کا وہ نظریہ جو کشش جیسے ان دیکھے قانون کی کارفرمائی کو مانتا ہے کیا اس سے کچھ بھی زیادہ سائنسی ہوتا ہے، جو وحشی انسان ہر اس چیز کو جس کو کچھ پراسرار پاتے ہیں ان دیکھے دیبی دیوتاؤں ( DEMONS ) کی طرف منسوب کر دیتے ہیں"

البتہ نیوٹنی طبعیات داں کہہ سکتا ہے کہ :۔

"اس کا قانونِ کشش والا دیوتا بندھے ہوئے قوانین علت کے مطابق عمل کرتا ہے اس لئے اس کو غیر ذمہ دار لاابالی ( IRRESPONSIBLE ) دیوتاؤں وغیرہ سے تشبیہ دینا درست نہیں"

لیکن اب خود سائنس میں :۔

"قطعی علیت سے ہٹنے کے بعد جب فطرت اور فوق الفطرت کا فرق ہی غائب ہو جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وحشی انسان بھی اس بات کو مان لے گا کہ اس کے دیبی دیوتا بھی کسی حد تک عادت پسند (یا معمول کے مطابق ہی کام کرنے والے۔م) ہوتے ہیں، اس لئے معقول حد تک ان کے آئندہ عمل کے بارے میں بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کیا ہو گا"

بہرحال :۔

"جب ہم کو (سائنسی طور پر) اس نتیجہ تک پہنچنا پڑا ہے کہ قطعی علت و معلول کا عمل کہیں بھی نہیں پایا جاتا تو ہم آپ سے آپ وحشیوں کے ان دیکھے دیوتاؤں کے لئے دروازہ کھول دیتے ہیں"[1]

---

[1] (THE NATURE OF PHYSICAL WORLD ص ۳۰۹

اَن دیکھے دیوتاؤں یا خداؤں تک کے لئے دروازہ کھل جانے کے بعد پھر اَن دیکھے ایک خدا کا معاملہ توحید کے بجائے شرک کا صرف مغالطہ رہ جاتا ہے۔ جو بس نرا مغالطہ ہی مغالطہ ہے۔ ورنہ انسان اپنی فطرت ہی سے توحید پسند واقع ہوا ہے۔

مذہب و فلسفہ ہی نہیں سائنس کی بھی پرانی نئی ساری سرگردانیوں اور سرگرمیوں کا مرکز و محور توحید ہی توحید (UNIFICATION) یعنی کائنات کی کثرتوں کو گھٹاتے گھٹاتے کسی واحد مبدء و ماخذ تک پہنچا دینے کا تقاضا و مطالبہ رہا ہے۔

اور گو سائنس کی دنیا سے اب ٹھیٹھ مادیت کیا جس ٹھوس جوہری مادہ پر اس کی پوری عمارت کھڑی تھی اس کا انہدام ہو چکا ہے تو دوسری طرف روح یا ذہن و شعور کی اولیت کم از کم اس درجہ مسلم ہو چکی ہے کہ جس خارجی حواسی دنیا کو قائلین مادیت تمام تر مادہ ہی مادہ کا کارنامہ قرار دیتے تھے وہ درحقیقت خود ذہن کی ساختہ پرداختہ بن چکی ہے آج کی سائنسی منطق کے...... ان دو مقدمات کے لئے بعد۔ عامیانہ فلسفیانہ اور سائنسی۔ ہر ذہن کے لئے کسی نہ کسی رنگ میں ایک کلی و کائناتی یا عالمی وجہانی ذہن و شعور یا روح کا نتیجہ ہی قابل فہم و قبول رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ نہ کسی عامی و فلسفی سائنس داں کے لئے انائیہ کی طرح یہ قبول کرنا آسان ہے کہ موجود صرف میں ہی ہیں یا میرا ہی میرا ذہن ہے میرے علاوہ نہ تو میری طرح دوسرے کوئی ذہن پائے ہی نہیں جاتے نہ یہ سمجھنا سمجھانا آسان کہ زمین سے آسمان تک کی ساری انتھاہ کائنات کی گوناگوں محسوس و مرئی بے شمار موجودات صرف ہمارے تمہارے اپنے اپنے انفرادی ذہنوں کے اندر ہی اندر موجود اور بالکلیہ ان ہی کی تخلیقات و تشکیلات یا صورت گری ہیں۔

اس طرح لے دے کر ایک ہی شق رہ جاتی ہے، کہ ہمارے تمہارے انفرادی تہائی

ذہنوں کے ماسوا یا ماوراکوئی ایسا غیر فانی وابدی ذہن پایا جاتا ہو جس میں انفرادی ذہنوں کے اندر پیدا ہونے والے احساسات وادراکات ہمیشہ ہمیشہ سے ابدی تصوّرات یا معلومات کی صورت میں موجود ہوں۔ جن کو وہ ہمارے انفرادی ذہنوں میں ظل وعکس کی طرح خلق یا رونما کر دیتا ہو۔ خارجی موجودات کے لئے ظلی وعکسی وجود کی یہ تعبیر فلسفہ میں تو فلاطوں سے چلی آرہی تھی۔ اور ہمارے صوفیہ کے ایک محتاط مسلک نے بھی خالص وجودیہ[1] کے مقابل میں اسی تعبیر کو اپنے رنگ میں زیادہ قرین احتیاط پایا۔ اور اب آپ آج بیسویں صدی کے بہتیرے سائنس دانوں تک کو کچھ ایسی ہی تعبیرات میں پناہ لیتے اوپر بار بار پڑھ آئے ہیں۔

اگرچہ فلسفہ ومذہب کے مابعد الطبیعیاتی مسائل سائنس کا بالذات موضوع بحث بالکل نہیں پھر بھی ادھر ساٹھ ستّر سال کے دوران تازہ سے تازہ سائنسی دریافتوں اور انقلابوں نے اپنی ہی راہوں سے اور سب سے بڑھ کر خود طبیعیات (فزکس) نے —— گر نہ بستانی بہ ستم می رسد —— مابعد الطبیعیات سے جس طرح دوچار کر دیا ہے، اس کے مختلف پہلوؤں کی کچھ تفصیلات اوپر قصداً بہ تکرار دہرائی جا چکی ہیں۔ یہاں مذہب خصوصاً مذہب اسلام کے خصوصی نقطۂ نظر کو آگے پڑھنے سے پہلے پھر اجمالاً سامنے رکھ لیں۔

مذہب کا مسئلۃ المسائل خود ہمارے ذہن اور ان کے باہر کی بظاہر بے ذہن پائی جانے والی ساری مخلوقات کے "حی لایموت" خالق اور اس کی ذات وصفات یا خدا کا تصور ہے۔

اس کے مقابل اس سے سیدھی ٹکر لینے والا جو نظریہ وخیال موجودہ صدی سے

---

[1] وحدۃ الوجود کے قائلین۔

قبل کی دو تین صدیوں کے جدید سائنسی دور میں گویا خود سائنسی ترقیوں ہی کا لازمہ و نتیجہ سمجھا کہا جانے لگا تھا۔ وہ مادیت کا تھا۔ یعنی حیوانی زندگی ہی نہیں بلکہ انسانی ذہن و شعور تک کے اعلیٰ مظاہر (فنامنا) دراصل کنکر پتھر جیسے مادہ نام سرے سے ایک مردہ و جامد جوہر ہی کے الٹ پھیر یا انقلابات کے خود اور خود آفریدہ نتائج ہیں۔

لیکن دور حاضر کے عین جدید ترین سائنسی انقلابات و مسلمات نے مادیت کی اس منطق کو بالکل الٹ دیا ہے اور آئنسٹائن، ایڈنگٹن، ہشرودنگر اور ماکس پلانک جیسے بڑے بڑے رجال سائنس کے نزدیک ــ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ــ کائنات کی اساسی حقیقت ٹھوس ٹھس جامد مردہ مادہ نہیں، بلکہ ذہن و شعور ہے۔ اس طرح سچ یہ ہے کہ ان سب ہی نے مذہب کے خدا کو سامنے لا کھڑا کر دیا ہے۔ باقی اصل مرض وہی ہے کہ:-

"دیکھنا سب کچھ ہوں لیکن سوچنا کچھ بھی نہیں"

تاہم ان ہی مشاہیر سائنس کے ہم سر کم از کم ایک سر جیمیس جینز (JEANS) کو تو سب سے بڑے مادہ و مادیت شکن خالص فلسفی برکلے کے لفظاً و معناً ہم زبان ہو کر ذہن و شعور کی اس اساسی حقیقت کائنات کو واحد کلی و کائناتی ذہن (یونیورسل مائنڈ) ہی کا نام بالکل کھل کر دے دینا پڑا۔

بایں ہمہ وحی و نبوت والے مذہب کے لئے اسی سلسلہ میں بہت بڑی پتہ کی گہری تنبیہ والی بات خود ایڈنگٹن جیسے بہت بڑے سائنس داں کی پھر دہرا لینے کی یہ ہے کہ الحاد کے بجائے ایمان کا راستہ دکھلانے والے جدید سے جدید سائنس کے ان سارے انقلابات کے باوجود اہل مذہب کے لئے اطمینان کی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ میں ان کو

کوانٹم نظریہ کی وحی کا عطا کیا ہوا خدا نہیں دے رہا ہوں۔"

یہ بات سب سے زیادہ گوش ہوش سے سننے اور یاد رکھنے کی ہمارے نئے پرانے عام متکلمین کے لئے خصوصاً ہے۔ پہلے یہ حضرات عموماً یونانی علوم و افکار سے اتنے متاثر و مرعوب رہے کہ گویا ان کو بجائے خود معیاری حقائق تصور کرتے اور وحی کے ایمانی حقائق کو ان کی کسوٹی پر پرکھتے رہے۔ اور اب تو جدید علم و سائنس کی ہمہ گیر مرعوبیت کا عالم یہ ہے کہ

"یورپ اگر گپ زند آں نیز مسلم باشد"

ہمارے جدید علماء میں ایک بڑے صاحب علم و قلم ہی نہیں، ماشاء اللہ بڑے صاحب ایمان و صلاح کی ایک تحریر کے حوالہ سے پڑھا کہ "مسائل کو ایسے دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے جو موجودہ علوم و فنون اور تجربات و حقائق کے معیار پر بھی پورے اترتے ہوں۔"

جو نتیجہ ہے تمام تر حقیقی و ایمانی و انبیائی وحی کی حقیقت کو نہ سمجھنے یا اس پر ایمان کی کمزوری کا۔

اس لئے انبیائی و ایمانی وحی کی حقیقت و ضرورت کو سمجھنے کے لئے پہلے ذرا ایک مشہور فلسفی سائنس داں ہی کی کتاب پر درج شہادت سے خود عہد جدید کی تازہ سائنس سے اور خصوصاً مذہبی ہی کے معاملہ و مقابلہ میں اس بے معنی مرعوبیت کو دور فرمالیں۔

> "دنیا کے دوسرے کام کاج والوں کی طرح سائنس داں بھی اب زیادہ تر ایک عملی انسان بن کر رہ گیا ہے ...... وہ کوئی اب ایسا جادوگر نہیں رہا ہے، جس کے پاس اسرار کائنات کی کنجی ہو۔ دوسرے انسانوں کی طرح اس کے طریقے (METHOD) بھی بارہا ناقص ہوتے ہیں۔ اور اس کا علم بھی قطعی کبھی نہیں ہوتا وہ بھی مہمل سے مہمل باتوں تک کا قائل ہو سکتا ہے ...... سائنس جو کبھی پہلے نام نہاد

قطعی یا یقینی علم کا مخزن ( REPOSITORY ) خیال کی جاتی تھی اب اس میں بالآخر ایسے شکوک و شبہات کی گنجائش نکل آئی ہے کہ مذہب و فلسفہ کے مسائل پر سائنس کے مقابلہ میں ابہام کا اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔"

بلکہ :۔

"گذشتہ درجن بھر سالوں میں ایسی بیسیوں کتابیں اور سیکڑوں کیا شاید ہزاروں مضامین صرف اس ایک موضوع پر نکل چکے ہیں جس کو جدید ترین طبعیات کے فلسفیانہ (یا ابعد الطبعیاتی و مذہبی ۔م) مضمرات و نتائج ( IMPLICATIONS ) کا نام دیا جا سکتا ہے۔"[1]

سائنس کے اس انقلاب میں :۔

"غیر سائنس داں کے لئے سب سے عجوبہ کی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ (پرانے تصور والے ٹھوس ٹھس ایٹم یا ۔م) مادہ کو فنا کیا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر لکھنے والے عام طور پر کوئی موقع اس پر زور دینے کا نہیں چھوڑتے کہ ہیروشیما کی بربادی مادہ کی بربادی (یا فنا) ہی کا نتیجہ تھی۔"

اور چونکہ بہتوں کے نزدیک یہ مادہ ہی عین حقیقت تھا جیسا کہ گذشتہ صدی کے سائنس داں پروفیسر ٹیٹ ( TIET ) نے "طبعیاتی سائنس کی بعض ترقیوں" پر لکچر دیتے ہوئے ۱۸۷۶ء میں کہا تھا کہ "مادہ کے حقیقی ہونے یا اس کے خارجی ( OBJECTIVE ) وجود کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انسان کے پاس کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کو پیدا یا فنا

---

[1] جیمس بی کونانٹ ( JAMES B. CONAUT ) کی کتاب "MODERN SCIENCE & MODERN MAN" صـ ۵۵ و صـ ۵۷ (مطبوعہ ۱۹۵۲ء)

کر سکے "[۱]

مادہ کی اسی نام نہاد حقیقت پر مبنی اشتراکیت کے بطنی فلسفہ کی جس نام نہاد جدلیاتی مادیت نے دنیا میں آج سب سے زیادہ اُدھم مچا رکھا ہے اور الٹے دعویٰ یہ ہے کہ یہی سائنسی مادیت دنیا کی ساری برائیوں اور مصیبتوں کا علاج ہے، اس کی حقیقت بھی سرراہ اسی مشہور سائنس داں کی زبان سے سن لینے کی ہے کہ " یہ جدلیاتی مادیت فلسفیانہ طور پر خالص احمقانہ اور سراسر مہمل ہی مہمل ہے "[۲]

اور گو ہم کو کوانٹم نظریہ یا سائنسی وحی کے خدا پر ایمان لانا نہیں ہے تاہم خود سائنس پر ایمان رکھنے والوں کے لئے یہ حقیقت بار بار خود دوسرے بڑے بڑے سائنس دانوں کی طرح موصوف سے بھی سن لینے ہی کی ہے کہ آج :۔

" مادی کائنات کے زیادہ گہرے مطالعہ و فہم نے خدا پر ایمان کے لئے نئے نئے دروازے کھول دیئے ہیں "

لیکن ان دروازوں کے پیچھے کیا حقیقت پنہاں ہے تو اب :۔

" ماہر طبیعات (فزکس) کا مقصد کسی طرح ظواہر کی دنیا ( APPEARANCE WORLD ) کے پیچھے حقیقی وجود ( REAL EXISTENCE ) کو معلوم کرنا سرے سے رہا ہی نہیں ...... "

---

[۱] جیمس بی کوناٹ JAMES B. CONAUT کی کتاب ("THE MODERN SCIENCE & THE MODERN MAN") صفحہ ۵۵ و ۵۷ (مطبوعہ ۱۹۵۲ء)

[۲] بسلسلہ حوالہ بالا (ماڈرن سائنس اینڈ ماڈرن مین) صفحہ ۱۵۵ و صفحہ ۱۵۹ و صفحہ ۱۶۰

بلکہ:۔

"سائنسی نظریات کی نوعیت اب عقیدوں یا مسلکوں (CREEDS)
کے بجائے پالیسیوں (POLICIES) کی ہو کر رہ گئی ہے۔"

ایک اور سائنس داں ہی کو اپنی کتاب "جدید سائنس اور اس کے فلسفہ"[۱] میں ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ:۔

"حقیقت یہ ہے کہ آج مشکل ہی سے تم کوئی ایسا رسالہ یا کتاب کھولو گے جس میں ہمارے عام سائنسی خیالات سے بحث ہو اور اس کو اس طرح کے بیانات سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ گلیلیو کے عہد کا خاتمہ ۔۔۔ سائنس کی روح سے دشمنی کا خاتمہ ۔۔۔ میکانی طبعیات کی ناکامی ۔۔۔ مذہب و سائنس میں مصالحت۔"

حتی کہ:۔

"برنہارڈ نے جدید طبعیات پر اپنی ایک کتاب کا نام ہی رکھ دیا "سائنس مذہب کے راستہ پر"[۲]۔"

بے شک "سائنس مذہب کے راستہ پر" پڑ چکی ہے۔ جیسا کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر بحثوں سے اوپر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے پھر بھی خود سائنس داں اب تک عموماً و عملاً مذہب سے سرد مہری ہی برتتے اور اس کی ایمانی و انبیائی حقیقت کو پانے اور سمجھنے سے بے پرواہ بلکہ گریزاں ہی رہتے ہیں۔ بڑی وجہ ولیم جیمس جیسے ماہر نفسیات کی تشخیص کی رو سے ارادۂ ایمان"

---

[۱] جدید سائنس اور اس کا فلسفہ MODERN SCIENCE AND ITS PHYLOSOPHY
BY BERNHARD BAWINK)

[۲] ("MODERN SCIENCE ON THE PATH OF RELIGION")

(WILL TO BELIVE' کا فقدان ہے۔ یعنی وہی نفسیت ذہنیت کہ "میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے"

ورنہ ایک طرف نہ صرف جس مادہ پر مادیت کی بنیاد تھی، وہ خود غیر مادی (IMMATERIAL) ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ سرے سے اس کا وجود تک چیستان بن گیا ہے۔ دوسری طرف خود سائنسی راہوں سے کم و بیش اتنا معلوم و مسلم ہو جانے کے بعد کہ زمین سے آسمان تک کی آنکھوں دیکھی جس کائنات کو مادی کہا یا سمجھا جاتا رہا ہے اسکی تعمیر و تشکیل کی تہ میں کارفرما دلی و اساسی حقیقت خود ہمارا یا ہمارا ہی جیسا کوئی باطنی ذہن و شعور ہے اور ظاہر ہے کہ خود ہمارا ذہن ہمارے لئے ایک ایسی بدیہی یا وجدانی معلوم بالذات حقیقت ہے کہ اس کے وجود اور صفات و افعال کے لئے نہ ہم کسی دلیل و حجت کے محتاج ہیں نہ خود اپنے ہی جیسے کسی ذہن و شعور اور اس کے صفات و افعال والی ذات کا تصور و قبول کرنا کوئی بعید از سائنس بات رہ گئی ہے جیسا کہ نام نہاد مادہ جیسی ایک بالکلیہ بے ذہن و شعور ہی سے نہیں، سرے سے زندگی کی حس و حرکت تک سے محروم ذات کو خالق کائنات اور اس سے بڑھ کر انسان جیسی صاحب ذہن و شعور ذات۔

یہی وہ سب سے بڑا عصر حاضر کا سائنسی انقلاب ہے، جس نے سائنس کو چار و ناچار مذہب کے راستہ پر ڈال دیا ہے۔ جو منطقی طور پر صرف وحی و نبوت کے ایمان و اعتقاد ہی کی طرف لے جا سکتا ہے، بڑے بڑے ماہرین سائنس تک کو بے ذہن و زندگی مادہ کے مقابلہ میں ذہن و شعور ہی کو کائنات کی اولی و اساسی حقیقت ماننا پڑا ہے آئنسٹائن اور ماکس پلانک تک جن کو ان کے نظریۂ اضافیت اور کوانٹم نظریہ کی بنا پر سب سے

عظیم انقلاب انگیز سائنس داں قرار دیا جاتا ہے، ان دونوں کا اعتراف بھی اوپر سن ہی چکے کہ کائنات کی اساسی حقیقت ذہن و شعور ہی ہے، اور ماکس پلانک کے الفاظ میں تو شعور کی توجیہ مادہ اور اس کے قوانین سے ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے بالکل برعکس خود مادہ ہی شعور سے ماخوذ و مستفاد ہے۔

کہاں جدید سائنس کی دو تین صدیوں سے مدعیانہ یہ رٹ چلی آ رہی تھی کہ مادہ نہ صرف مادی کائنات کا ماخذ و مبدء ہے۔ بلکہ ذہن جو اپنے افعال و صفات میں مادہ کی بالکل ضد معلوم ہوتا ہے اس کی توجیہ بھی مادی قوانین ہی سے ہو جاتی ہے، کہاں آج بیسویں صدی کی جدید ترین سائنس ہی کو الٹ کر یہ اقرار کرنا پڑا ہے کہ کائنات کی اساسی حقیقت ذہن و شعور ہے۔ اور ذہن سے باہر جس کو مادی کائنات کہا جاتا ہے، وہ خود ذہن کا کارنامہ یا اس سے ماخوذ۔ (DERIVED) ہے ۔

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

باقی دوسرے سرے پر "انا ولا غیری" والا انائیہ (SOLIPSISTS) کا یہ انتہا پسندانہ دعویٰ عام انسانی فہم سلیم کیا عام سائنسی و فلسفیانہ عقل کس طرح ہضم کر سکتی ہے کہ ذہن و شعور والا واحد و انفرادی ذہن صرف میرا ہی میرا ہے، یا صرف میں ہی میں موجود ہوں، میرے انا (ایگو) ذہن کے سوا نہ دوسرے میرے جیسے کوئی انسان اور انسانی اذہان پائے جاتے ہیں اور نہ میرے انا و ذہن سے باہر زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی کوئی خارجی کائنات۔ بس سب صرف میرے ہی انفرادی ذہن و شعور کی پیداوار ہی نہیں، بلکہ اس سے ماوراء ان کا قطعاً کوئی وجود ثابت نہیں۔

ورنہ بقول ایڈنگٹن کے ایک طرف :-

خارجی وطبعی دنیا کو ماننے کے لئے اپنے علاوہ دوسروں کے احساسات کا

ماننا بھی لازم ہے۔ جس کا انائیت ( SOLIPSISM ) کو انکار ہے

اسی لئے علمائے طبعیات انائیہ کے شدید مخالف ہیں"[1]

دوسری طرف :۔

"احساسات کے ایک ہی طرح کے یا بہت ہی ملتے جلتے یکساں مجموعوں یا

ڈھانچوں ( STRUCTURES ) کا مختلف شعوروں یا ذہنوں میں

رونما ہونا بھی طبعیاتی سائنس کا نقطۂ آغاز ہے"[2]

اور اس طرح :۔

"ان ڈھانچوں کا مختلف ذہنوں یا شعوروں کے لئے یکساں اور ملتا جلتا ہونا

ہی بتاتا ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی مشترک علت انفرادی ذہنوں سے باہر پائی

جانی چاہیئے"

اتنی بات بالکل معقول ہے کہ ہمارے ان مشترک یکساں احساسات کی علت یا مبدٔ ومنشا بے شک کوئی نہ کوئی ہمارے انفرادی ذہنوں کے علاوہ یا ماوراہی ہونا چاہیئے۔ باقی اس کا بجائے خود بے ذہن یا نام نہاد مادی ہونا۔ پہلے بھی ایک دور از عقل بات تھی اور اب تو سائنسی طور پر خود مادہ کے مسلمہ طور پر غیر مادی ہو جانے کیا سرے سے اس کے وجود تک مشکوک ہو جانے کے ساتھ ساتھ خود ذہن و شعور کے کائنات کی اساسی دبنیادی حقیقت ثابت ہو چکنے کی صورت میں ایک کائناتی ذہن ( UNIVERSAL MIND ) ہی کو ماننا اقرب الی الفہم رہ جاتا ہے۔

---

[1] فلاسفی آف فزیکل سائنس صہ ۱۹۵    [2] ایضاً صہ ۲۱۵

اس کائناتی ذہن کی نوعی حیثیت ہمارے انسانی ذہنوں سے ملتی جلتی ہی بنائی گئی ہے انسانی ذہن کی امتیازی خصوصیت جیسا کہ اوپر ابتدا ہی میں تفصیل و توضیح ہو چکی۔ شعور غیب پر مبنی شعوری علم ہے یا آرتھر ایڈنگٹن کی تعبیر میں انسان کے اندر جو اس کا روحانی عنصر (SPIRITUAL ELEMENT) پایا جاتا ہے وہ علم یا جاننا ہی ہے[1]۔ یعنی جس حقیقت و خصوصیت کو انسانی روح کہا جا سکتا ہے وہ وہی ہے، جو جانتی ہے۔

علم ہی کی بنیادی صفت کا لازمہ و مطالبہ ارادہ و قدرت ہے۔ آدمی جو کچھ جانتا اسی کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا اور اپنے معلومات ہی کے مطابق و مناسب ان کے لئے راہ عمل اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح علم وارادہ ہی سے انسان کی خصوصی فکری و عملی ذات کی تشکیل و تعمیر ہوتی اور لازماً اسی خصوصیت و امتیاز کی تکمیل و تحقیق انسان کی عین انسانیت کا مطلوب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ علم ہی کی یہ خصوصیت و صفت انسانی سرگرمیوں کو تمام دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی صفت اس کی زندگی میں شعوری طور پر جانے بوجھے یا علم وارادہ پر مبنی مقاصد کو جنم دیتی، نت نئے مقاصد کو ابھارتی اور ان کو انتہا تک پہنچانے کے درپے رہتی ہے نیز اس انسانی طلب و تشنگی کا اگر سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہو تو انسان اپنی اس محدود زندگی میں اور جو کچھ بھی حاصل کرے۔ لیکن اپنی نامحدودیت طلب انسانیت کی تشفی و تکمیل سے محروم ہی رہے گا۔ اس محدود زندگی کے بظاہر بڑے سے بڑے کامیاب انسان سے مرتے وقت پوچھ دیکھو تو جواب یہی ہوگا کہ "بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"۔

غرض انسانی ذہنوں سے ملتا جلتا جس کو کائناتی ذہن کہا گیا ہے، اس کی جوہری و اساسی صفت و خصوصیت بھی علم اور اس کے لوازم مشیت یا ارادہ اور قدرت ہی کو ہونا چاہئے

---

[1] اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ

البتہ کامل وناقص کے فرق کے ساتھ۔ یعنی انسانی ناقص ذہنوں کے محدود وناقص علم وقدرت کے مقابلہ میں کائناتی ذہن کا علم اور لازماً اس کے تقاضوں کو پورا کرنے والی مشیت وقدرت بھی کامل یا نامحدود ہی ہوگی۔

### خدا کی سائنسی یافت یا دریافت

اس طرح بے ذہن کیا سرے سے بے زندگی مادہ سے کائنات اور اس میں انسان جیسے ذہن والی مخلوق کی آفرینش خود سائنس کی رو سے رد ہو کر خود ذہن کی بلکہ خود ہمارے انسانی یا انسانی ہی جیسے کسی برتر واعلیٰ کائناتی ذہن کی طرف سائنسی رہنمائی کو مذہب کے خدا کی سائنسی یافت دریافت (DISCOVERY) کے سوا کیا کہا جائے باقی شپرہ چشمی تو دن دوپہر آفتاب دیکھنے سے اندھی ہی رہتی ہے.... "انما سکرت ابصارنا بل نحن قوم مسحورون" کی سی باتیں جاہلیت اولیٰ کی طرح جاہلیت جدیدہ والوں کو بتانے سے کون روک سکتا ہے۔

مزید برآں اگر خدا سے برتر کائناتی ذہن کے بجائے اس کائنات کا خاص مبدء ایجاد وآفرینش مادہ جیسی کوئی بے ذہن وشعور یا بے علم وارادہ کیا سرے سے کنکر پتھر کی سی بے جان اندھی بہری ذات فرض کی جائے، تو ظاہر ہے کہ پھر اس کائنات کی ساری جاندار وبے جان باشعور وبے شعور موجودات کی کسی معلوم مراد یعنی دانستہ ارادہ پر مبنی کسی غرض وغایت کے شعوری مقصد ومدعا کا سوال ہی نہیں رہتا۔ ارض وسما کا سارا لاانتہا کارخانۂ وجود ونمود سرتاسر لایعنی وبے مقصد بن کر رہ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شعوری علم وارادہ رکھنے والا خود انسان جو کہنا چاہیئے خود ایک قدم بھی زندگی کا بلا مقصد ومدعا نہیں اٹھا سکتا، وہ بھی بذات خود اپنے پورے ہنگامۂ حیات سمیت بالکلیہ بے معنیٰ وعبث کا رہن کر رہ جاتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک طرف

تو یہ دنیا کی ساری موجودات اپنا خادم...... بنا لینا چاہتا ہے، جس کے مظاہرات آج کی جدید سائنس قدم قدم پر کرتی رہتی ہے دوسری طرف ایسا عظیم مخدوم کائنات خود اپنا سرے سے کوئی مصرف و مدعا نہیں بتا سکتا کہ سب کچھ تو اس کی خدمت و مصرف کے لئے مگر خود اس کا بھی کوئی مصرف ہے، کروروں اربوں مکھی مچھروں اور جراثیم کی جان تو یہ اپنی جان بچانے کیلئے لینا اپنا پیدائشی حق جانتا ہے لیکن خود اپنی جان و زندگی کا کوئی ایسا مقصد قانون جنگل کے سوا نہیں بتا سکتا جو اس کے مخدوم کائنات ہونے کو حق بجانب بنائے ؎

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم۔ کجا بودم
دریغ درد کہ غافل ز کار خویشتم

بخلاف اس کے جیسا کہ انسان خود اپنے آپ کو صاحب علم و ارادہ پاتا اور اپنے افعال و اعمال کو اپنے جانے بوجھے مقصد و مدعا کے تابع رکھتا ہے، اسی طرح خود اس کی ذہن و شعور والی ذات اور کائنات جس کو یہ بظاہر اپنے ذہن سے باہر موجود پاتا ہے اگر کسی اس سے اعلیٰ و اکمل ذہن و شعور یا علم و قدرت والی ذات یا سائنسی زبان میں کائناتی ذہن کا کارنامہ ہے تو پھر آپ سے آپ اس کی کوئی نہ کوئی معلوم و مقصود غرض و غایت بھی ہو گی جس کے بعد نہ یہ لا انتہا عالم سماوات و ارض کسی بڑی معنویت و اہمیت والے مقصد سے عاری محض بچوں کے کھیل کود کا گھروندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ بلکہ "ما خلقنا السمٰوات والارض وما بینھما لاعبین" کی بدولت چمنستان دہر کا ایک "برگ و بار...... دفتریست معرفت کردگار" بن جاتا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان جو ہمہ وقت اپنی زندگی کی ساری سرگرمیوں کا کوئی نہ کوئی مقصد و مدعا بنائے رہتا ہے خود اس کا وجود بے مقصد و بے معنیٰ یا عبث ہی عبث

نہیں بن جاتا اور "افحسبتم انما خلقنا کم عبثا وانکم الینا لا ترجعون" کے عبثی وجود کے بجائے اس کا ایک ابدی مرجع و مصرف عیاناً سامنے آجاتا ہے۔

عجب تضاد و تماشا ہے کہ خود تو دنیا کی ہر شئی کو اپنے کام میں لانے اور اس کی مخفی سے مخفی طاقتوں کو مسخر کرنے میں اس طرح لگا رہتا ہے کہ گویا زمین و آسمان کی پوری کائنات صرف اسی کی غلامی و بندگی کے لئے وجود میں آئی ہیں لیکن خود یہ کسی کے لئے نہیں! وہی کہ ہر موجود کا مقصد و مدعا تو انسان ہے لیکن خود انسان کا وجود بے مقصد و بے معنیٰ ہی بے معنیٰ ہے۔

لیکن اگر انسان سے بھی اعلیٰ و اکمل ذہن و شعور یا علم و مشیت والی کسی ذات نے اپنے علم و ارادہ سے اس دنیا اور اس میں انسان کو پیدا کیا ہے تو لازماً صرف وہی دنیا و انسان کی آفرینش کے مقصد کو جان اور ٹھیک ٹھیک بتا بھی سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنے شعوری علم و ارادہ کی مصنوعات و تخلیقات کی غرض و غایت ہم ہی بہتر جانتے اور دوسروں کو بتا سکتے ہیں خصوصاً ہم سے کم درجے کے ذہن و شعور والوں کے لئے ہمارے کاموں منصوبوں یا اسکیموں کا سمجھنا تو ناممکن ہی ہے۔ کم کیا خود زیادہ بلند عقل و فہم والے انسانوں کے کارناموں یا تخلیقات کی غرض و غایت پوری طرح سمجھنا بلا خود اس کے سمجھائے دشوار ہی ہوگا تو پھر کسی بلند تر سے بلند ترین کائناتی ذہن کی خلاقانہ حکمتوں اور مصلحتوں کا اس کے مقابلہ میں ہماری ادنیٰ ترین ذہنوں کی فہم و گرفت میں آنے کی تو اس کے سوا کوئی صورت ہی نہیں کہ وہ خود ہی ہمارے ذہن و ضرورت کے مناسب کوئی صورت و ذریعہ اختیار کر کے کائنات اور اس میں ہماری آفرینش ہی کے مقصد و مطلب سے آگاہ اور اس کی طلب و تکمیل کی راہ بتائے بلکہ بتانا ہی چاہیے ورنہ تو پھر وہ خود اپنی خلق کی ہوئی چیزوں کا مقصد ہی فوت کرے گی۔ علیٰ ہذا خود اس

اعلیٰ واکمل ذہن کی ذات وصفات اور اس کے طریق خلق وایجاد کا قابل اعتماد علم بھی صرف وہی اور اتنا ہی ہوگا جو اور جتنا وہ عطا کر دے۔ بلکہ خود اس کی عطا کی ہوئی عبارت و بیان سے تجاوز کر کے اس کی ذات وصفات کی انتہائی کنہ اپنی محدود و ناقص عقل و علم کی راہ سے رسائی کی سعی انتہائی بے عقلی وجہل کی بات کے سوا کیا ہوگی۔ پوری کائنات کے خالق اعلیٰ ذہن کیا معنیٰ خود اس کائنات کے کسی دوسرے سیارہ میں اگر کچھ ہم سے مختلف ذہن کی کوئی دوسری مخلوق پائی جاتی ہو تو اس تک کی ذات وصفات، اعمال واحوال کے بارے میں خود اسکی طرف سے کسی ذریعہ سے کوئی اطلاع لئے بغیر نرے قیاسی گھوڑے دوڑاتے رہنا قیاس مع الفارق کے صرف تہ بہ تہ مغالطوں یا حماقتوں کے انبار کے سوا کیا ہوگا؟

خلاصہ یہ کہ اس کائنات کا مبدء وجود سرے سے اندھے بہرے بے علم وارادہ مادہ یا ہمارے جزئی وانفرادی ناقص وفانی ذہن کے بجائے خود سائنس کی رہنمائی میں اعلیٰ وابدی کلی ذہن یا مذہب کی زبان میں خدا کو تسلیم کرنے کے بعد لازماً اس کی ذات وصفات اور اسکی پیدا کی ہوئی اس کائنات اور اس میں انسان کے مقصد ومقام کے غیبوں کا قابلِ اعتماد علم وہی اور اتنا ہی ہوگا جو اور جتنا خود وہ کسی ذریعہ سے دیدے۔ اسی ذریعہ و واسطہ کا نام ہے مذہب کی زبان میں وحی ونبوت،

## مادہ کا کچھ مکرر و مزید مغالطہ و معمہ

آج کی دنیا مادہ پرستی کی دنیا کہی اور سمجھی جاتی ہے اور خدا پرستی کی سب سے بڑی حریف ورقیب بنی ہوئی ہے، لیکن اس مادہ پرستی کے معبود خود مادہ کا آج ہی کی جدید ترین

سائنس نے جس طرح قلع قمع کیا ہے، ان اوراق میں قصداً سب سے زیادہ اسی کی تفصیل و تکرار مقدم رکھی گئی ہے اس لئے مذہب کی، خود مذہب کی زبان سے نمائندگی سے پہلے اسی مادہ کی کچھ مزید و مکرر چیتیاں اور سن لیں۔

عام انسانی ذہن تو "المرء یقیس علی نفسہ" کی اس صاف سیدھی نفسیات اور منطق ہی کی راہ پر چلتا رہا جس تک سائنس اب بیسویں صدی میں کہنا چاہیئے کہ بادل ناخواستہ پہنچنے پر مضطر ہوتی ہے۔ یعنی بالذات اولی و بدیہی علم ہم کو خود اپنی ذات یا نفس و ذہن کا حاصل ہے۔ باقی اس سے ماوراکسی نام نہاد مادی یا جسمانی کائنات میں ہم کو خود اپنے جسم تک کا علم بھی جو کچھ حاصل ہے وہ بالذات کے محض بالواسطہ یا استنباطی طور پر۔ یعنی "المرء یقیس علی نفسہ" کے بالکل خلاف۔

اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت فطرت پرستی کا عموم و شیوع رہا ہے کہ انسان زمین سے لے کر آسمان تک کے کم و بیش سارے موجوداتِ فطرت دریا پہاڑ، ابر و باد، چاند سورج آگ پانی وغیرہ ہر چیز کو دیبی دیوتا بنا چھوڑا۔ خود ہمارے ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ ۳۳ کروڑ دیوی دیوتا ہیں۔ (اور راقم ہذا تو کہا کرتا ہے کہ جس شئی سے بھی انسان کو کوئی نفع و ضرر پہنچتا نظر آتا ہے، اور کسی شئی سے نظر نہیں آتا، اس کو وہ دیبی دیوتا یا قرآنی اصطلاح میں الٰہ بنا لینا چاہتا ہے۔ یعنی یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہماری ہی طرح شعور و ارادہ کے ساتھ عمل کرتی ہے، ان ہی دیبی دیوتاؤں کو راضی رکھنے اور کرنے کے لئے نذر و نیاز یا بھینٹ وغیرہ کے طریقے اپنائے گئے۔

دلچسپ بات یہ ہے جیسا کہ اوپر بھی کہیں سر ایڈنگٹن جیسے مسلم و متبحر ماہر سائنس کی زبان سے سن چکے ہیں کہ سائنسی قوانین اور وحشیوں جنگلیوں کے دیبی دیوتاؤں میں زیادہ

فرق نہیں۔ نیوٹن کے ان دیکھے قانونِ کشش تک کا غیر متمدن وحشیوں کے ان دیکھے بھوت پریتوں ہی کا سا کچھ معاملہ ہے۔

"کائنات کا وہ نظریہ جو کشش جیسے ان دیکھے قانون کی کارفرمائی کو مانتا ہے کیا اس سے کچھ بھی زیادہ سائنسی ہوتا ہے جو وحشی انسان ہر اس چیز کو جس کو کچھ پراسرار پاتے ہیں ان دیکھے دیبی دیوتاؤں (DEMONS) وغیرہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں"[1]

لیکن کیا کہا جائے ہمارے عقلائے فلسفہ و سائنس کی عقل و دانش کو کہ وہ ان غیر متمدن وحشیوں تک کی صحیح فطری منطق سے سبق لینے کی جگہ آنکھوں دیکھے اجسام یا مختلف جسمانی صورتوں کی تہ میں ایک ایسا مشترک مادہ نام مفروضہ گڑھ بیٹھے جس کے جال سے وہ دو ہزار سال سے زائد (بیسویں صدی) تک نہ نکل سکے۔

**تجریدی مغالطہ**

اس کی بہترین مثال ارسطو جیسے نامور فلسفی و سائنس داں کے ہیولائی آسیب ہے جس کا سمجھنا کیا تصور تک کرنا ناممکن ہے اور جو ہمارے مسلمان فلاسفہ کے سروں پر صدیوں سے سوار چلا آتا ہے یہ ایک کھلے ہوئے تجریدی مغالطہ کے سوا کچھ نہیں۔ مثلاً سیکڑوں ہزاروں قسم کے درخت پائے جاتے ہیں لیکن کوئی ایسا درخت جو نہ آم کا ہو نہ امرود کا، نہ سیب کا، نہ سنترہ کا، نہ املی کا نہ انگور وغیرہ کسی خاص درخت کی صورت و صفات کا، نہ خارج میں پایا جاتا ہے، اور نہ ذہن ہی اس کا تصور کر سکتا ہے، صرف گفتگو میں سہولت پیدا کرنے کے لئے ایسے مجرد مفاہیم کے لئے جیسے کہ درخت، جانور، پہاڑ، دریا وغیرہ ہیں، کلی الفاظ ایجاد کر لئے ہیں۔ اسی طرح ان گنت قسم کے جمادات و نباتات و حیوانات

---

[1] مزید تفصیل اوپر دیکھی جا سکتی ہے۔

وغیرہ اجسام کے کلی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے جسم کا ایک کلی لفظ بنا لیا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایسا کلی جسم جو نہ کسی خاص جزئی جماد کا ہو نہ نبات کا، نہ حیوان کا، نہ کوئی خارجی وجود رکھتا ہے، نہ ذہن ہی اس کا مفہوم سمجھنے کے سوا کوئی ایسا کلی تصور رکھتا یا پیدا کر سکتا ہے جو نہ کسی جماد کا ہو نہ نبات کا، نہ حیوان کا، نہ انسان کا،

ارسطو کا ہیولیٰ اس کو سمجھا جاتا ہے جو نہ اپنا ذاتی گول مول لمبا سیدھا ٹیڑھا وغیرہ کوئی خاص جسمانی وجود یا صورت رکھتا ہے، نہ سرخ سیاہ سفید وغیرہ کوئی خاص رنگ، نہ نرم وسخت گرم وسرد وغیرہ کوئی خاص لمسی کیفیت، نہ میٹھا کھٹا، کڑوا نمکین وغیرہ کوئی ذائقہ نہ خوشبو بدبو وغیرہ کوئی بو۔ اس لئے کہ اگر ان میں سے کوئی شئی بھی اس کی ذات میں داخل ہو، تو پھر وہ کوئی دوسرا جمادی ونباتی وغیرہ نہ جسم ہی اختیار کر سکتا نہ گول لمبی وغیرہ کوئی شکل نہ کوئی سرد وگرم تلخ وشیریں وغیرہ مزہ نہ کوئی رنگ وبو۔ اس لئے جو چیز بھی کسی شئی کی ذات میں داخل ہو اس کا اس ذات سے منفک ہونا اس ذات کا اپنی ذات ہی نہ رہنا ہوگا۔ بس یہی ارسطو کا ہیولیٰ ہے جو بجائے خود کچھ اور کسی قسم کا جسم نہیں، لیکن سب کچھ بننے کی ایک مطلق ومجرد استعداد کا نام رہ جاتا ہے۔

یہی اسم بلا مسمی ارسطو کا ہیولیٰ یا بقول برکلے کے مادیہ کا مادہ ہے جس کا وجود نہ خارج میں ہے، نہ ذہن میں۔ اسی پر برکلے نے بہت زیادہ زور اس لئے دیا ہے کہ اسکے نزدیک مادہ کا اعتقاد عقیدۂ تجربیہی کے سیئات میں داخل ہے۔ اور جان اسٹورٹ مل جیسے استقرا کے سائنسی منطقی نے تو اسکو برکلے کے ان اکتشافات فلسفہ میں داخل کیا ہے جن میں سے ہر ایک اسکی عظمت کیلئے کافی ہے[1]۔

---

[1] تفصیل کیلئے راقم ہذا کی کتاب "برکلے" مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ از صـ۲۳ تا صـ۸۳ اور آخری ضمیمہ "تصورات کلیہ" کے چند صفحات انشاء اللہ اس بحث کو ہر سلیم وفہیم کے لئے صاف کر دینے کو کافی ہوں گے۔

**بدترین مغالطہ** بلکہ انتہائی عامیانہ بدترین مغالطہ مادہ کی نوعیت کے باب میں وہ ہے جو ارسطو سے بھی پہلے اس کے ہم وطن دیمقراطیس کو لگا تھا۔ اور جس کے نقارخانہ کو یورپ کے سائنسی عہدِ نو میں اس زور سے پیٹا گیا کہ برکلے کے سے صاف وسادہ[1] ابطال مادہ کے ان دلائل کے سننے سے جنھوں نے فلسفہ کی کایا پلٹ کر کے رکھ دی تھی، سائنس اپنے کانوں میں ایسی ڈاٹ ٹھونسے رہی (فی اذانھم وقر) کہ طوطی کی آواز کا درجہ بھی نہ حاصل کر سکے۔

عامی سے عامی آدمی بھی جو مٹی یا پتھر کے کسی ٹکڑے کو توڑ یا کوٹ پیس کر چھوٹے چھوٹے ذروں میں تبدیل کر لیتا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ یہ مٹی یا پتھر کا کوئی بڑا چھوٹا ڈھیر ان ہی ذرات کا مجموعہ ہے۔ دیمقراطیس اسی بدترین عامیانہ مغالطہ کی تعمیم کو پوری زمین سے لے کر آسمان تک کے اجسام کی حقیقت کو اسی طرح سمجھ لیا جس طرح ریت کا کوئی تودہ بظاہر بس ریت کے ذروں کا مجموعہ یا ڈھیر ہوتا ہے۔ وہ اجسام کی تقسیم در تقسیم کو ایسے ذروں پر ختم ہونے کا مدعی تھا جن کی ایک طرف نہ اب مزید تقسیم ممکن ہے، دوسری طرف یہ اتنے ٹھوس یا ناقابل نفوذ ہیں کہ ان کے اندر باہر کی کوئی چیز قطعاً داخل نہیں ہو سکتی ان ہی ذرات کو اس نے ایٹم کا نام دیا تھا۔

ہمارے مسلمان فلاسفہ نے ان ہی کو اجزاے دیمقراطیسی یا اجزاے لاتجزی کا نام دیا یعنی جن کی اب مزید تجزی یا تقسیم نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی اس تجزی و تقسیم در تقسیم کے متعلق لازماً

---

[1] اسی برکلے نام کتاب کو اگر خالی الذہن کسی ذرا ذہین وسلیم الفہم غیر فلسفی وغیر سائنس داں نے بھی پڑھ لیا تو انشاء اللہ ان دلائل کا صاف وسادہ ہونا اسی طرح واضح ہو جائے گا جس طرح بہتیرے اکابر فلسفہ و سائنس کو ماننا پڑا جس کا ذکر کچھ اوپر آچکا۔

ایک نہ ختم ہونے والی متناہی و نامتناہی کی نامعقول بحث اٹھ کھڑی ہوئی، جو معقولات کی عربی کتابوں میں آج تک چلی جارہی ہے۔

دورِ جدید کی مغربی سائنس میں عامیانہ مغالطہ کے اسی جزر لاتجزی یا ایٹم کو انیسویں صدی کے اوائل میں مشہور ماہر کیمیا جان ڈالٹن نے سائنس کا مسلمہ بنا دیا۔ لیکن اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ڈالٹن کے اس طے شدہ مسلمہ یا ایٹم کے ناقابل تجزی و تقسیم ہونے کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کی کچھ ضروری تفصیل بھی اوپر اپنی جگہ گذر چکی۔

**سائنسی طلسم ہوش ربا**

اس عہد کے سب سے عظیم عالم سائنس آئنسٹائن کا نظریہ اضافیت یا زمان و مکان کا نظریہ ہے، جس نے نظریہ کیا سائنسی مسلمہ کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ اب تک عوام و خواص کیا، کہنا چاہیے کہ سارے اکابر فلسفہ و سائنس سب ہی مکان و زمان کو بجائے خود ایک مستقل و اطلاقی خارجی ظرف کی سی حقیقت دیتے رہے جس میں سموات و ارض کے تمام اجرام و اجسام بطور مظروف کے پائے جاتے ہیں۔ بلکہ کسی ایسے جسم یا شئی کا خارج میں موجود ہونا سرے سے معدوم ہونا ہی تھا جو نہ کسی مکان یا جگہ میں پائی جائے نہ کسی وقت یا زمانہ میں۔

آئنسٹائن کی اس تحقیق یا دریافت کا ماحصل یہ ہے کہ مظروفات یا اشیا و اجسام سے قطع نظر کرکے کسی مستقل بالذات ہمہ گیر یا اطلاقی (ABSOLUTE) زمان و مکان کا سرے سے کوئی خارجی (OBJECTIVE) وجود ہی نہیں۔ البتہ جزوی اجسام یا مظروفات کے الگ الگ اضافی (RELATIVE) مکان۔ زمان ایسی بے شمار کثرت سے پائے جاتے ہیں جس کثرت سے خود یہ گوناگوں اجسام۔ اس سے بھی زیادہ عجائبی افسانہ یہ سائنسی حقیقت ثابت ہوئی ہے، کہ مکان و زمان کا ایک دوسرے سے جداگانہ کوئی وجود نہیں بلکہ مکان۔ زمان

مسلسلہ ہی کا چوتھا بعد ( FOURTH DIMENSION ) ہے۔ یعنی اب تک جس طرح ہم یہ جانتے تھے کہ کوئی جسم لمبان چوڑان اور گہراؤ کے صرف تین جہتیں یا ابعاد ( DIMENSIONS ) رکھتا ہے اور ان کا ایک دوسرے کے بغیر یا جداگانہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح مکان بھی زمان ہی کا چوتھا بعد ہے، جو ان تینوں سے اپنا کوئی جداگانہ وجود نہیں رکھتا۔ اسی لئے مکان و زمان کا فاصلہ اور عطف بھی حذف کر کے "مکان۔ زمان" کو ایک ہی مسلسل ( CONTINUOUS ) حقیقت قرار دیا جاتا ہے۔

اگر بعد رابع تدریجی وقت یا زمان ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تدریجی نشوونما درخت وغیرہ کسی جسم کی لمبائی چوڑائی موٹائی سے کوئی جداگانہ شئی نہیں جس طرح کسی جسم کا لمبان چوڑان وٹھان بالکلیہ اس جسم سے وابستہ یا غیر منفک ہوتا ہے، اسی طرح اس کا بڑھان یا نمو بھی اس سے ناقابلِ انفصال ہی ہوتا ہے۔ اور اگر یہی بڑھان یا نمو زمان ہے یا زمان اسی سے منتزع ہوتا ہے تو اس کا بعد رابع ہونا صاف سیدھی بات ہے۔ مگر اس طرح کی تفہیم کسی مستند سائنس کی کتاب میں نظر سے نہیں گذری؟ بلکہ یہ ارسطو ہی کی پرانی بات ہے کہ زمان نام ہے مقدار حرکت کا اور نشوونما بھی ایک تدریجی حرکت ہی کے سوا کیا ہے۔ جیسے گھڑی کی منٹ و سکنڈ کی سوئیوں کی تدریجی حرکات ہی سے ہم روزمرہ کے اوقات یا زمین کی حرکت سے روز و شب کا حساب لگاتے ہیں[1]۔ آگے آئنسٹائن کے نظریہ کے مطابق بتایا گیا ہے کہ "دنیا میں صرف ایک واحد شئی ہے

---

[1] قرآن کی زبان میں اس تدریجی نشوونما کا نام ربوبیت ہے۔ اور ساری کائنات عالم ربوبیت ہی ہے۔ قرآن میں خدا نے اپنا اولین تعارف "رب العالمین" ہی سے فرمایا اور اسم ذات اللہ کے بعد صفات میں سب سے زیادہ ذکر صفت "رب" یا "ربوبیت" ہی کا ہے۔ بلکہ شمار کرنے کرانے پر معلوم ہوا کہ صفت رب کی تعداد اسم ذات سے بھی زیادہ کم و بیش ڈیوڑھی ہے۔

جس کے لئے فاصلہ مکان (SPACE) یا وقت صفر کی حیثیت رکھتے ہیں، اور وہ ہے روشنی"۔[1]

بہر حال جو طبیعیاتی حقیقت اب سائنسی مسلمہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اصل و بنیادی وجود نہ مادہ کا ہے، نہ انرجی یا تابکاری (RADIATION) کا بلکہ صرف "مکان۔ زمان" یا اس کے تسلسل (SPACE-TIME-CONTINUANCE) کا، باقی مادہ وغیرہ سب اسی کے شیون یا بہ الفاظ دیگر اسی کی شکنیں سلوٹیں، جھریاں یا خمیدگیوں (CURVATURES) کے سوا کوئی اپنا مستقل بالذات وجود نہیں رکھتیں۔

**اصل معمہ** یا سوال یہ ہے کہ "مکان۔ زمان" بذات خود کیا ہیں؟ جس طرح کوئی کپڑا نام اپنی شکنوں کا نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ تو اس کی آنی جانی الٹتی بدلتی حالتیں ہوتی ہیں جو کپڑے کے علاوہ اپنا کوئی ........ مستقل بالذات وجود نہیں رکھتیں پھر اوپر یہی کہیں زمانہ کے متعلق یہ بھی پڑھ آئے ہیں کہ ایک طرف اس کا حقیقی ہونا یقینی و مسلم ہے اور دوسری طرف غیر مادی ہونا یعنی یہ جو سمجھا جاتا رہا کہ کسی شئی کے حقیقی یا خارجی (OBJECTIVE) وجود کے لئے اس کا مادی ہونا لازم ہے غلط ہے۔ یہی صورت مکان کی بھی ہونی چاہیئے۔

باقی اس سائنس سے بالکل کورے عامی آدمی کے لئے تو یہ بات بالکل ناقابل تصور ہے کہ کسی چیز کا خارج از ذہن وجود بھی ہو اور پھر وہ کسی مکان و زمان یا کسی جگہ اور وقت میں نہ پائی جاتی ہو ایسی چیز جو نہ کسی جگہ اور نہ کسی وقت میں پائی جاتی ہو وہ یا تو صرف ذہن میں پائی جا سکتی ہے، یا پھر سرے سے معدوم ہی تصور کی جاتی ہے۔ اب اگر "مکان۔ زمان" سلسلہ کا کوئی بالذات خارجی وجود ہو تو اس کو بھی کسی مکان و زمان یا جگہ اور وقت میں پایا جاتا ہے اور پھر یہ سوال

---

[1] اللہ نور السمٰوٰت والارض کی آیت زبان پر آگئی۔

کسی حد پر ختم ہونے والا نہیں نا متناہی حد تک چلا جائے گا!

عام طور پر یا عامی آدمی جو ایسا سمجھتا ہے کہ کوئی کلی مکان و زمان بجائے خود بطور ایک ظرف کے موجود ہے، یہ نہ اب صرف سائنس سے جلاوطن ہو چکا ہے، بلکہ عامی آدمی بھی اگر ذرا غور کرے تو وہی تجرید والا مغالطہ ہے، جو درخت جانور دریا پہاڑ، آگ پانی وغیرہ سارے کلّی الفاظ یا اسماء کا ہے، کہ ان کا کوئی کلی مسمّیٰ یا وجود ذہن سے باہر، ایسا درخت قطعاً نہ پایا جاتا ہے، نہ تصور تک کیا جا سکتا ہے، جو آم امرود، انار انگور وغیرہ ہزاروں بے شمار درختوں میں سے کوئی بھی نہ ہو اور پھر بھی درخت ہو۔ یہی حال تمام ایسے موجودات کا ہے، جن کو کسی ذہن سے باہر سمجھا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ خود سائنس کے پاس نہ اب نام نہاد مادہ کا کوئی خارجی OBJECTIVE وجود رہا ہے نہ مکان و زمان کا۔ حد یہ ہے کہ زمانہ یا وقت کے بے آغاز ( BEGINNING-LESS ) ہونے تک کو چیلنج کیا جا چکا ہے۔ یعنی کوئی زمانہ ایسا بھی تھا کہ خود زمانہ ہی سرے سے نہ پایا جاتا تھا۔ بات پتہ کی اور لے دے کر سمجھ میں آنے والی وہی ہے کہ یہ ذہن سے باہر خارجی موجودات بھی بس یا تو سراسر ہمارے ذہن کی تجریدات ہیں یا پھر ان کا مستقل ازلی وابدی وجود ہماری طرح کے کسی ازلی وابدی یا بقول سرجیمس جینز ( JEANS ) کے عالمگیر کائناتی ذہن ( UNIVERSAL MIND ) یا بقول برکلے برتر روح یا خدا میں ہے۔

عجب تو اور ہے کہ جس طرح برکلے جیسا تاریخ ساز فلسفی جس نے اپنے بعد کے فلسفہ کا رخ کہنا چاہیئے کہ مادیت سے بالکلیہ تصوریت ( IDEALISM ) کی طرف موڑ دیا حتیٰ کہ اس کے فلسفہ کے منکر بھی اس کو تاریخ فلسفہ سے الگ نہیں کر سکتے، وہ بجائے خود ایک مذہبی آدمی ہی نہیں بلکہ بشپ برکلے تھا۔ اسی طرح آج کی سائنس کا

صفِ اول کا نامور سر جیمس جینز (JEANS) بھی مذہبی تھا، جو کھل کر اعتراف کر رہا ہے کہ خود سائنسی راہوں سے کائناتی ذہن (یونیورسل مائنڈ) کے نتیجہ تک مجھکو پہنچنا پڑا ہے۔ ایک سائنس (طبعیات) کے ریسرچ اسکالر سے اس سلسلہ میں کچھ سمجھنا چاہتا تھا، درمیان میں سر جیمس جینز کا نام آگیا تو کہنے لگے وہ تو مذہبی آدمی تھا۔ میں نے کہا کہ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مذہبی رجحان اس کو سائنس میں بھی مذہب کی طرف لے گیا، تو پھر لامذہبوں کے لامذہبی رجحانات کے متعلق کیا ارشاد ہوگا!

بہرحال بار بار یاد رکھنے والی حقیقت یہ ہے کہ مادہ خود ان سائنس دانوں کے ہاتھ سے اتنا نکل گیا ہے کہ وہ نام نہاد مادی ذرات کو بھی مادی کا نام تک دینا اپنے لئے دشوار پا رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان کو اگر صرف واقعات (EVENTS) نہ کہا جائے تو بھی کم از کم "واقعات۔ ذرات" تو کہنا ہی پڑے گا[۱] یعنی سائنس کے پاس مادہ و ذہن یا ان کی بجائے لے دے کر واقعات بلکہ وقوعات (HAPPENINGS) رہ گئے ہیں۔ (EVENTS) کا ترجمہ بھی "وقوعات" ہی بہتر ہے۔ اس لئے کہ واقعات ترجمہ (FACTS) کا کیا جاتا ہے جس میں کچھ نہ کچھ واقعیت یا خارجی واقعیت کی بو پائی جاتی ہے جس کا سائنس کو کوئی ثبوت اب نہیں ملتا، اور مجبور ہو کر بڑے بڑے[۲] اکابر و مشاہیر سائنس کو اسی پر قناعت کرنا پڑا ہے کہ بس ہمارے پاس کچھ واقعات بلکہ وقوعات یا عام تعبیر میں مشاہدات (OBSERVATIONS) اور ان کے درمیان روابط و علائق اور مساواتوں (EQUATIONS) کے علم کے سوا کچھ نہیں باقی یہ وقوعات یا مشاہدات کسی خارجی مادہ جیسی شئی سے رونما ہوتے ہیں یا کسی برتر روح یا کائناتی ذہن کے آفریدہ ہیں۔ اس کا اب نہ سائنس کوئی نفیاً و اثباتاً دعویٰ کر سکتی ہے نہ اسکے مسائل کو

---

۱ و ۲ سب کے حوالے اوپر گذر چکے ہیں۔

براہِ راست اس سے واسطہ ہے، یہ فلسفہ مابعد الطبیعیات کے سوالات ہیں۔

لیکن ساتھ ہی آپ اوپر بڑے بڑے سائنس دانوں کی زبان سے سن آرہے ہیں کہ اب فلسفہ و سائنس کا نہ ایک دوسرے سے دست و گریباں رہنا آسان ہے اور نہ سائنس کو کسی نہ کسی طرح فلسفہ سے دوچار ہونے سے چارہ۔

آئنسٹائن کا نظریۂ اضافیت یا مکان و زمان کی ناقابل انفکاک اٹوٹ وحدت جو ایک طرف خالص سائنسی نظریہ ہے، دوسری طرف جب اسی "مکان۔زمان" میں مادہ و انرجی اور حرکت کو مدغم کر کے اس کو کائنات کی انتہائی حقیقت کہا جاتا ہے، جس سے خود مادہ و انرجی پیدا ہوتا گیا یعنی اس کی صرف شکنوں یا خمیدگیوں (CURVATURES) کا نام رہ جاتا ہے۔ تو اس کائنات کی وہ انتہائی حقیقت (ULTIMATE REALITY) یا غیب جو فلسفۂ مابعد الطبیعیات کا خاص موضوع ہے وہ یہی "مکان۔زمان مسلسلہ SPACE-TIME-CONTINUANCE قرار ہی نہیں پا جاتا بلکہ صاف لفظوں میں اوپر اسی کو کسی بڑے سائنس دان کی زبان سے پوری کائنات کی تخلیق کا رحم مادر تک ہونا سن آرہے ہیں۔

لیکن فلسفہ کی چوں وچرا یا کیوں اور کیونکر کا سوال تو ابھی ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ خود اس "مکان۔زمان" کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود کیا ہے؟ اور کہاں پایا جاتا ہے۔ ہمارے پاس اس کا سراغ لگانے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ کیونکہ دو ہی چیزوں میں پوری کائنات کی تقسیم و تجزیہ کر سکتے ہیں۔ ایک خود ہمارا ذہن اور دوسرے اس ذہن سے باہر کی دنیا۔ ان میں ذہن تو خود ہمارے لئے بدیہی و حضوری حقیقت ہونے کی بنا پر اپنے وجود کے لئے کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ باقی رہی وہ دنیا جس کو ذہن سے باہر موجود پانا اور مادی دنیا یا مادہ کی پیداوار گئی صدی تک سمجھا جاتا رہا وہ تو سائنسی راہوں سے بالکلیہ نہیں تو قریب قریب بالکلیہ اب صرف

ہمارے ذہن ہی میں موجود ہے، اور ہمارے ذہن سے باہر اگر کچھ موجود ہے بھی تو صرف ایسے ذرات کی مختل حرکات یا مجنونانہ رقص جو بجائے خود نہ زمین دریا پہاڑ، چاند سورج دوسرے نباتی وحیوانی موجودات کیا خود ہمارا ۵، ۶ فٹ کے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کان وغیرہ ظاہری جوارح یا دل ودماغ معدہ وجگر وغیرہ اندرونی اعضا تک والا جسم اس طرح کا خارج میں قطعاً کوئی وجود نہیں جس طرح یا صورت کا ہم ان کو دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ باقی ذہن سے باہر جو نام نہاد ذرات موجود کیے جاتے ہیں وہ بھی ہمارے لئے ذرات نہیں بلکہ کچھ واقعات یا وقوعات ( HAPPENINGS ) ہیں جن میں ہم کچھ روابط وضوابط کو پاتے ہیں اور سائنس کا کام لے دے کر صرف ان ہی رابطوں یا ضابطوں کو جاننا اور مرتب کرنا ہے۔

اس حقیقت کو مختلف بڑے سے بڑے سائنس داں اپنے اپنے الفاظ وتعبیرات میں ۵۰، ۶۰ سال سے جس طرح دہراتے رہے ہیں اس کی اہمیت کے مدنظر آپ کو بھی دہرا دہرا کر اوپر سنایا جاتا رہا۔

اب آخر میں بالکل تازہ ترین مثال مادہ ہی کی نہیں خود مکان وزمان کی ہم عامیوں کیا خود سائنس دانوں کے نزدیک اسی فروری ۱۹۶۷ء میں امریکہ میں ہونے والی سائنسی کانفرنس کے ایک سائنس داں ہی کی زبان سے بتایا ہوا پانچ چھ بارسن آئے جس کا ایک انگریزی اخبار کی اطلاع میں عنوان ہی زمان یا وقت کا خاتمہ ( END OF TIME ) قرار دیا گیا ہے۔ جو دراصل مکان وزمان اور مادہ سب ہی کا خاتمہ ہے، اور جس کا خلاصہ ذرا پھر تازہ کرلیں کہ ایک طرف مکان ( SPACE ) یا جگہ کے متعلق "یہاں وہاں" یا اس جگہ اور اس جگہ تک کہنے کی گنجائش نہیں رہتی اور زمان یا وقت کے متعلق "پہلے اور بعد" تک کا فرق نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں واقعہ پہلے وقوع میں آیا اور فلاں بعد کو۔ باقی غریب وہ مادہ جو زمین سے

آسمانوں تک کے سارے جاندار و بے جان ذہن والے موجودات کی ایجاد کا سرچشمہ گئی صدی تک سائنس کا مسلمہ بن گیا تھا وہ خود عدم و فنا یا بود سے نابود کے درجہ تک جا پہونچا!

بس معلوم شد کہ ہیچ معلوم نیست!

دیکھا آپ نے انتھاہ کائنات کے اس کرۂ ارض نام ذرا سے ٹکڑے میں بسنے والے اور اس کو عظیم الجثہ بر و بحر کے ہاتھی اور وھیل وغیرہ جیسے جثے اور جسمانیت والے حیوانات کے مقابلے میں حقیر الجثہ انسان کی غیب در غیب والی نامحدودیت طلب علمی پیاس نے خود اس کے دن رات کے آنکھوں دیکھے اجسام کی دنیا اور پھر یہ اجسام جس مکان و زمان میں پائے جاتے ہیں ان سب کو چیستان کیا بالکل بھول بھلیاں بنا چھوڑا۔ مادہ تو سچ پوچھئے ہمیشہ ہی سے ایک معمہ تھا، لیکن مکان و زمان جن میں ہم دن رات چلتے پھرتے جاگتے سوتے اور عملی زندگی کے سارے ہنگامے برپا کرتے اپنے کو پاتے ہیں اور جن کا ادراک جانور تک رکھتے ہیں ان کے وجود کو بجائے حقیقی یا اطلاقی کے محض اعتباری و اضافی تو آئنسٹائن ہی نے بنا دیا تھا۔ اب برائے نام اعتباری وجود تک کو خود سائنس ہی سے ایسی نیستی و نابودی تک پہنچا دیا گیا ہے کہ "یہاں" اور "وہاں" اور "قبل و بعد" تک کے الفاظ بولنا بھی بے معنی ہو کر رہا۔ حالانکہ ان کے بولے بغیر زندگی کا ایک قدم بھی ہم اٹھا نہیں سکتے!

پھر آپ اوپر ہی کسی نامور سائنس داں کا کچھ ایسا اعتراف سن آئے ہیں کہ پچھلے تیس ۳۰ سال میں سائنس میں جو بھونچال آیا ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ اگلے تیس ۳۰ سال میں اور کیا کیا کایا پلٹ سامنے آئے یا کیا کیا کہنا سننا پڑے۔ وہ بھی آپ نے غالباً ۳۰ سال کے اندر ہی سن لیا۔ البتہ اس ساری سائنسی طلسم ہوش ربا میں جو حقیقت کسی نہ کسی رنگ میں ابھرتی بلکہ وہی ناقابلِ انکار بن کر رہی کہ اس کا انکار ہی عین اقرار ہے، کہ زمان و مکان کا وجود حقیقی و

واقعی ہو یا اعتباری و اضافی۔ اور مادہ تحلیل ہوتے ہوتے عدم کے مرتبے پر پہنچ جائے۔ ایسی باتوں کا علم و انکشاف تمام تر انسانی ذہن کا کارنامہ ہی نہیں بلکہ ان کی تخلیق ہی دراصل انسان یا انسان جیسے کسی برتر و عظیم تر ذہن کا کارنامہ ہوتا ہے۔ حدیہ کہ کسی سائنس داں کو کسی بڑے نامی گرامی ماہر سائنس کی کسی عظیم دریافت تک کی نسبت کہنا پڑا کہ جس حقیقت کو وہ دریافت کر رہا تھا دراصل خود ہی اس کو خلق کر رہا تھا۔ سائنسی حقائق کا کیا ذکر کم و بیش ہر آدمی خصوصاً جس کی طلب و آرزو اس کے ظاہری حالات و اسباب کے دیکھتے بالکل کسی ان ہونی شئی کی تڑپ بار ہا بظاہر اپنے اس ان ہونے مطلوب تک کو پا کر رہتی ہے خود راقم کی زندگی میں متعدد ایسی ان ہونی باتیں ہو کر رہیں کہ اب ان کی توجیہ و تاویل بھی "انا عند ظن عبدی بی" ہی کی ایک شان سمجھ میں آتی ہے۔[1]

## سائنس کے تناقضات میں پھنسنے کا سبب

بہر حال ہم کو یہاں اصل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ سائنس کو مکان و زمان اور تمام تر مادہ یا مادی ذرات سے متعلق ایسی تناقض اور نہ سمجھ میں آنے والی چیستانیں جو بھائی پڑتی ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودات خارجی یا خود نفس خارجی مکان و زمان کی تعمیر و تشکیل میں اولی و بنیادی حصہ خود انسان یا انسان جیسے کسی برتر ذہن کو مان لینے کے باوجود ان چیزوں کو دانستہ یا نادانستہ ذہن سے باہر موجود فرض کرنے ہی کی بدولت روز بروز ناقابل فہم و ناقابل بیان تصورات بلکہ صریحی تناقضات میں پھنستی جاتی ہے۔

حالانکہ ان سے بالکلیہ نکلنے یا نجات حاصل کرنے کی جس طرح جدید فلسفہ ہی نے

---

[1] کچھ اس کی تفصیل شاید کبھی "اسباقِ زندگی" میں ملے۔

صاف سیدھی راہ "روح برتر" کو تسلیم کرکے کھول دی تھی اسی طرح جدید بلکہ جدید ترین سائنس میں ہمت کرکے ایڈنگٹن اور اس سے بھی صفائی کے ساتھ کائناتی ذہن کو مان لینا ساری نہ سمجھ میں آنے والی مذکورۂ بالا اسی بیسویں صدی ہی کی نہیں، اسی سال ۱۹۶۷ء تک کے معموں کو قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ تفصیل اس کی انشاء اللہ آگے کلامیات قرآن" میں آتی ہے،

## ذہنی تخلیق کی نوعیت اور ذہن و تخلیق میں ربط

یہاں اس ذہنی تخلیق کی نوعیت کو سمجھنے سمجھانے کے لئے کم و بیش ہر شخص کے اور روزمرہ کے تجربہ کی ایک مثال قابلِ توجہ تو خود ہمارے خوابوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سونے کی حالت میں نہ صرف بالکلیہ خود ہمارے ذہن میں پائے جاتے بلکہ اسی کے پیدا کئے ہوتے ہیں۔ البتہ سونے کی حالت چونکہ ہم بیداری والی شعوری عقل و فہم اور علم سے محروم ہوتے ہیں اس لئے بلا شعور علم و ارادہ کے غیر ارادی طور پر اس طرح کے مکان و زمان اور ان میں پائی جانے والی چیزوں کو اکثر بیداری کے نظم و انضباط کے بغیر مگر ان ہی کو خلط ملط یا زیادہ تر اضغاث احلام کی صورت میں پیدا کرتے ہیں۔ تاہم بہتیروں کے بہتیرے خواب خصوصاً جن کے ذہنوں کو کم و بیش کچھ یکسوئی اور صفائی و پاکیزگی کی دولت نصیب ہے، ہو بہو یا گویا بیداری کے واقعات کی کشفی یا تمثیلی حقیقت ہوتے ہیں۔

حیدر آباد کا ایک خواب اپنے ایک صالح و متقی محب فی اللہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے مجاز حضرت مولانا عبدالحی سہارنپوری کا یاد آیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں عربی ادب کے استاد تھے۔ کم و بیش ۵۰ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ فرمایا اور غالباً رمضان مبارک

میں تیسری دفعہ تراویح میں سنا رہے تھے کہ اسی دوران طاعون میں انتقال فرمایا۔ (یغفر اللہ لہ و رفع درجاتہ)! گو اس تباہ کار کی رسائی بھی تھانوی قدموں تک ہو چکی تھی اور بلا ناغہ سالانہ تعطیلوں میں حاضری کی بھی سعادت نصیب ہوتی تھی۔ تاہم اس راہ کا ایک بڑا مرض "خلط بالانام" یارباشی یا آج کل کی بولی میں سوشل ہونا اتنا بڑھا ہوا تھا کہ یونیورسٹی کلب کے خاص پرجوش بانیوں میں شمار تھا۔ عصر پڑھ کر اور مولانا گیلانی رحمۃ اللہ کو ساتھ لے کر قریبًا بلا ناغہ جاتا۔ مغرب ان ہی کی امامت میں ہوتی۔ اور مرحوم حیدر آباد میں اتنی اسلامیت تو باقی ہی تھی کہ کلب کے سب ہی ممبر جماعت میں شریک ہوتے، واپسی عشا کے وقت ہوتی۔

ایک سال شدت طاعون کے زمانہ میں مولانا گیلانیؒ، بندہ اور محمود احمد خاں صاحب استاد کیمیا اسی کلب کے (جو یوں بھی ایک پہاڑی پر واقع تھا) سب سے بلند دوسری یا تیسری منزل کے ایک بڑے کمرہ جا ٹھہرے۔ روزوں کا مہینہ تھا یا اسی درمیان میں آگیا تھا، روزہ بھی قریب قریب سب ہی رکھتے تھے اور کلب ہی میں سب کے ساتھ ہی افطار ہوتا۔

حضرت سہارنپوری مرحوم اکثر اپنی لینڈو گھوڑا گاڑی پر یونیورسٹی کی رفاقت سے زیادہ تھانوی خواجہ تاشی کی خصوصیت سے مشرف فرماتے۔ ایک دن اسی رات کا اپنا ایک خواب سنایا، کہ اس بندۂ ناپاک کو پاخانہ میں چارپائی بچھائے لیٹا اور مولانا گیلانی کو پاس بیٹھے دیکھا! میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ مولانا یہ خواب نہیں، دن دوپہر کا واقعہ ہے، جیسے کیسے روزہ نماز کے باوجود اور ہر طرح یہ بلند و بالا شاندار عمارت اپنی صحبت اور ماحول کے اعتبار سے پاخانہ ہی پاخانہ ہے۔ اور مولانا گیلانی

چونکہ میرے ساتھ ہی قیام فرما تھے اور طبعاً بھی مستقل زندگی کے بجائے "تبعی" زندگی کے عادی۔ اس لئے بالکل تبعاً میرے ساتھ کلب میں آ گئے۔ اسی لئے میں پاخانہ میں لیٹا ہوں، اور وہ میرے پاس بیٹھے۔

کہنا یہ ہے کہ خواب خود ہمارے روزمرہ کے تجربہ کی ایسی مثال ہے، جس میں خود مکان و زمان اور زمین سے آسمان تک کی ہر طرح کی موجودات اسی طرح واقعی اور خارج میں موجود پاتے ہیں جس طرح بیداری میں۔ لیکن چونکہ سوتے میں ہمارے شعوری ہوش و حواس معطل ہو جاتے ہیں، اس لئے ہم ان میں بیداری کا سا نظم و انضباط نہ پاتے ہیں، نہ عموماً پیدا کر سکتے ہیں۔

## کیوں نہ ازلی ابدی بیدار کائناتی ذہن مان لیا جائے

لیکن اگر جیمس جینز کے سائنسی نتیجہ یا فلسفہ کی طرح کوئی ایسا ازلی و ابدی بیدار (الحی القیوم لا تاخذہ سنۃ و لا نوم) کائناتی ذہن مان لیا جائے تو اس کے پیدا کئے ہوئے زمان و مکان اور ان میں پائے جانے والے موجودات باوجود ذہنی ہونے کے بالکل اسی طرح ہمارے لئے خارجی واقعی منضبط موجودات کی طرح موجود ہوں گے۔ جس طرح ہم ان کو بیداری میں محسوس کرتے ہیں، بے اسکے ان موجودات کا کوئی نام نہاد مادی ماخذ و مبدء فرض کرنا پڑے۔ ایک عجیب حدیث میں بھی اسی حقیقت کی حقیقت کا بلیغ اشارہ کیا صراحت موجود ہے کہ "لوگ در اصل سو رہے ہیں جب وہ مریں گے تب جاگیں گے۔" "الناس نیام اذا ماتوا استیقظوا۔"

غرض جس طرح برکلے کا دعویٰ تھا کہ میں تم کو تمہاری محسوسات کی دنیا یا موجودات سے محروم نہیں کرتا بلکہ ان کو اور زیادہ حقیقی و واقعی قرار دیتا ہوں، الٹی گنگا تو تم بہاتے ہو،

کہ مادہ نام ان محسوسات کی تہ میں سرے سے ایک نا محسوس شئی خود ہر قسم کے احساسات کیا سرے سے زندگی تک سے محروم ہے سارے محسوسات و مظاہر کیا خود اپنی جیسی شاعر الذات انسانی ہستی تک کو اسی سے ماخوذ و مخلوق بنا لیتے ہو،

اسی طرح جینز بھی پہلے خود برکلے کے الفاظ نقل کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری موجودات ...... یا ایک لفظ میں تمام وہ موجودات جن سے کائنات کا یہ زبردست و عظیم :-

"ڈھانچہ بنا ہے ذہن کے بغیر (یا باہر) یہ کوئی جوہری وجود نہیں رکھتا ...... جب تک میں ان کا بالفعل واقعتہً ادراک نہیں کر رہا ہوں یا کسی دوسری مخلوق کے ذہن میں پائے نہیں جاتے تو پھر یا تو ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہو سکتا یا کسی ازلی و ابدی روح میں پائے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد خود ہی سر جیمس جینز جیسا بیسویں صدی کا سربرآوردہ سائنس داں لکھتا ہے کہ :-

"میرے نزدیک جدید سائنس بھی بالکل ایک دوسرے سے مختلف راستہ سے جس نتیجہ تک پہنچاتی ہے فی الجملہ بہ حیثیت مجموعی (ALTOGETHER) اس سے مختلف نہیں ...... یعنی موجودات کے خارجی یا حقیقی وجود کے معنیٰ یا حقیقت یہی ہے اور ہو سکتی ہے کہ وہ کسی ازلی و ابدی روح کے ذہن میں مستقل طور پر پائے جاتے ہیں۔"

البتہ برکلے کی ازلی وابدی روح یا جمیس جینز کے :-

"کلی وکائناتی ذہن کی مخلوقات کے مقابلہ میں انفرادی ذہن کی مخلوقات کو بجا طور پر کم جوہری LESS SUBSTANTIAL کہا جاسکتا ہے۔"

اب ذرا آگے اسی سلسلہ میں راقم ہذا کی اوپر والی خواب کی بھی کچھ تصدیق جیمس کی سائنسی زبان سے سن لیں۔

"یہی فرق اس مکان (SPACE) میں کرنا چاہئے جو ہم خواب میں دیکھتے ہیں اور روزمرہ کی بیداری والی زندگی کے مکان میں۔ یعنی ثانی الذکر جو سب کے لئے ایک ہی ہوتا ہے، وہ کلی وکائناتی ذہن کا واحد مکاں ہوتا ہے۔ اسی طرح فطرت کے وہ قوانین جو بیداری کی زندگی کے واقعات یا مظاہر میں کارفرما پائے جاتے ہیں وہ کلی ذہن کے قوانین فکر (LAWS OF THOUGHT) ہوتے ہیں۔"

اتنا ہی نہیں بلکہ :-

"کائنات کو خالص فکر (PURE THOUGHT) کی دنیا مان لینے سے ایسی بہت سی چیزوں کو نئی روشنی مل جاتی ہے جن کا ہم کو جدید سائنس کی تحقیقات کی بنیاد پر سامنا کرنا پڑتا ہے۔"[1]

---

[1] پر اسرار کائنات کے ص۱۷۳ سے ص۱۷۶ تک کے اقتباسات بالاختصار ماخوذ ہیں (اور اقتباسات کی بیاض سے ص۴۶ سے)

## مگر دنیا کسی فلسفی یا سائنس داں کا عطا کردہ خدا نہیں چاہتی

مذہب کی زبان میں برکلے کی فلسفیانہ ازلی و ابدی روح برتر اور سر جیمس جینز کے سائنسی کائناتی و کلی ذہن کا نام چاہے تقریب فہم کے لئے خدا رکھیں لیکن ساتھ ہی یاد رکھیں کہ جس طرح ایڈنگٹن کوانٹم نظریہ کی وحی کا عطا کیا ہوا خدا دینا نہیں چاہتا تھا، اس سے بھی زیادہ راقم ہذا برکلے اور جینز یا کسی بھی فلسفی و سائنس داں کی وحی کا عطا کیا ہوا خدا دینا ہرگز نہیں چاہتا، وہ تو صرف خدا کی وحی کے عطا کئے ہوئے ایمانی خدا تک ایسوں کو پہنچانا چاہتا ہے جو آئے دن بدلتی ہوئی سائنس سے مرعوب ہو کر ایمان کی دولت و معنویت سے دور و محروم ہو رہے ہیں، تفصیلات انشاء اللہ آگے ہی کلامیات قرآن کے عنوان میں پڑھیں۔ وما توفیقی الا باللہ!

اور پھر ایک مرتبہ آب زر سے لکھنے کے لائق خود ایڈنگٹن کے الفاظ پڑھ لیں:۔

"مذہبی آدمی کے لئے یہ بہت بڑے اطمینان کی بات ہے کہ اس کو میں نے کوانٹم نظریہ کی وحی کا عطا کیا ہوا خدا نہیں پیش کیا ہے، جو آئندہ کسی نئے سائنسی انقلاب یا نظریہ کے سیلاب میں بہ جائے۔ البتہ یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ سائنسی فکر کی حالیہ تبدیلیوں نے مذہب و سائنس میں توفیق و تطبیق کے بعض موانع دور کر دیے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مذہب کو کسی سائنسی اکتشاف پر مبنی کر دیا جائے۔ میں کسی ایسی کوشش کے قطعاً خلاف ہوں"[1]

---

[1] سائنس اور عالم غیب ("SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD") ص ۲۵

## سائنس پر غیب الغیب کو مبنی ٹھہرایا نہیں جاسکتا

ظاہر ہے ایسی سائنس پر مذہب کے غیب الغیوب یا فلسفہ کی حقیقۃ الحقائق ( ULTIMATE REALITY ) کو کیا مبنی ٹھہرایا جاسکتا ہے، جس کے پاس اب کچھ نرے واقعات یا وقوعات ہی وقوعات اور ان کے مابین کچھ روابط اور ان کے ضابطوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا نہ وہ اب گئی صدی یا نیوٹنی عہد کی طرح یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان وقوعات کے وقوع پذیر کرنے میں مادی یا پروٹان والکٹران وغیرہ برقی ذرات کو کچھ دخل ہے کہ سائنس کے لئے تو اب ان ذرات تک کی حقیقت بجائے خود صرف واقعات یا زیادہ سے زیادہ "ذرات۔ واقعات" کی رہ گئی ہے۔ باقی ان برقی ذرات کیا خود برق تک کی حقیقت سے جہل ہی جہل ہے، پھر ان واقعات یا وقوعات کی نسبت سمجھے بے سمجھے ہم یہ بھی اوپر کسی بڑے سائنس داں ہی سے سن آئے ہیں کہ "واقعات واقعی وقوع پذیر نہیں ہوتے بلکہ ہم خود ان واقعات کے پاس سے گذرتے ہیں" (؟) کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا"!

اصل بات وہی ہے کہ سائنس اور سائنس دانوں کے نام اور بہت زیادہ ان کے ایجادی واکتشافی کام ہمارے لئے ایسے مرعوب کن ہو گئے ہیں کہ اس نام و کام کو سنتے دیکھتے ہی ان کی ہر بات پر ایمان کے سوا گویا چارہ ہی نہیں پاتے ورنہ جیسا اوپر کہیں عرض ہو چکا کہ سائنس داں نوعی طور پر کسی امیر کبیر شاہ و شہنشاہ کے ماہر باورچی سے زیادہ نہیں[1]۔ یا دوسرے کسی استادِ فن بڑھئی، لہار، سنار وغیرہ

---

[1] غلط صحیح خدا جانے کہیں پڑھا یا سنا کہ عالمگیر علیہ الرحمہ نے اپنے والد کو جب قید کیا تو یہ بھی قید لگادی کہ اپنے کھانے کے لئے صرف کوئی ایک اناج تجویز کرلیں۔ شاہجہاں نے اپنے (باقی حاشیہ صـ۲۸۳ پر)

کی سی حیثیت رکھتے ہیں کہ ایک طرف ان کے سامنے لکڑی، لوہا، سونا چاندی نام کے کچھ واقعات یا وقوعات ہوتے ہیں اور دوسری طرف خود ان کے یا ان جیسے انسانوں ہی کے بنائے ہوئے کچھ آلات و اوزار کے واقعات۔ باقی ان کے پاس لکڑی لوہے اور ان اوزاروں وغیرہ واقعات کے مابین کچھ خاص خاص روابط کے علم و تجربہ کے محض کچھ مزید یا وقوعات ہی ہوتے ہیں۔ ان دوگونہ وقوعات ہی کے علم کی بنا پر بڑھئی یہ جانتا ہے کہ میں فلاں فلاں اوزار فلاں فلاں طریقہ سے استعمال کروں تو وہ چیزیں یا واقعات وقوع پذیر ہوں گے جس کو کرسی میز وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے یہی لہار سنار وغیرہ سارے اپنے فن کے استاد سے استادی کی کارنامہ ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہی نوعیت ہمارے سائنس دانوں کے ہوا میں ہوائی جہاز یا خلا میں راکٹ اڑانے اور چاند تک رسائی حاصل کرنے کی کوششوں کی ہے۔ لیکن نامحدود خدا کی نامحدود خدائی کے نامحدود سماوی اجرام میں تو ان جیسے چاندوں کی بھی اتنی نامحدود تعداد، نامحدود کہکشانوں اور ان کے نامحدود شمسی نظاموں میں ہے کہ صرف اپنی رات کو نظر آنے والی ایک کہکشاں کے چاندوں تک پہنچنے کا، انسان صرف خواب ہی دیکھ سکتا ہے! "ولا یعلم جنود ربک الا ھو"

---

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۲ کا) شاہجہانی باورچی سے مشورہ کیا۔ اس نے عرض کیا کہ حضور بس چنے منظور کرلیں۔ پھر انشاء اللہ زندگی بھر دو وقت بھی آپ کے دستر خوان اسی کے الوان نعمت سے بھرا رکھوں گا۔ گویا یہ چنا پرانے سائنس دانوں کا نام نہاد مادہ تھا۔

## عالم شہود خود غیب در غیب ہے

غرض کائنات کے ان شہودی خدائی لشکروں اربوں کھربوں اجرام سماوی (جنود ربکؑ) کا علم بھی خدا کے سوا انسان کو حاصل ہونا ہی ناممکن ہے۔ حالانکہ یہ عالم شہود یا فلسفہ و سائنس کی اصطلاح میں ظواہر و مظاہر ( APPEARANCE AND PHENOMENA ) یا اور جدید ترین سائنسی زبان میں صرف واقعات یا وقوعات ( EVENTS OR HAPPENINGS ) ہی وقوعات کے آگے صرف غیب ہی غیب ہے بہ الفاظ دیگر "عالم شہود" خود ہی درحقیقت غیب در غیب ہے۔

وہی غالب کا الہامی غیر فانی مصرعہ کہ "ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود" یا اور بے پردہ خود جدید فلسفہ و سائنس کے "دانائے راز" حکیم الاسلام شاعر اسلام حضرت اقبال کے بقول کہ ظہور یا تجلی خود عین غیب یا "مستوری" ہے۔

حکیم و عارف و صوفی تمام مست ظہور
کسے خبر کہ تجلی ہے عین مستوری

## پس مذہب کے خدا کا اقرار ناگزیر ہے

جب ایک طرف حکیم و (سائنس داں) و فلسفی و عارف و صوفی سبھی کے حکیمانہ و فلسفیانہ عارفانہ و صوفیانہ علم و عرفان کسی کی بھی رسائی عالم شہادت کی تجلیات یا تخلیقات سے ماوراء پس پردہ مستور حقیقت کی پردہ کشائی کے سے اپنے عین علمی و عرفانی نقش محدودیت ہی کی بنا پر عاجز و درماندہ ہے۔ انسان عین اپنی انسانی خلقت ہی کی رو سے نامحدودیت طلب اور ظہور و تجلی کی تہ میں مستور انتہائی حقیقت ( ULTIMATE REALITY ) کا طالب و تشنہ بھی ہے۔ اکثر قدیم و جدید اکابر فلسفہ نیز

خود ہماری بیسویں صدی کے جدید سے جدید بہتر سے رجال سائنس اس مستور حقیقت کو ہمارے جسم کی ظاہری جسمانی یا مادی نوعیت کے بجائے خود ہمارے ذہن سے ملتی جلتی کسی حقیقت کبریٰ کی نشاندہی پر اپنے کو مضطر پا رہے ہیں۔

اور خود ہمارے ذہن کی سب سے بڑی نوعی حقیقت علم وارادہ ہے یعنی کسی شئے کا ذہنی تصور یا نقشہ قائم کر کے اس نقشہ کے مطابق اپنے ارادہ کی مراد کو خارجی تخلیق و تجلی کی صورت دینا ہی ہوتا ہے تو پھر پوری کائنات کی پس پردہ انتہائی مستور حقیقت باصطلاح فلسفہ (خصوصاً برکلے کی) روح برتر اور باصطلاح سائنس (خصوصاً سر جیمس جینز) کا کلی یا کائناتی ( UNIVERSAL MIND ) ذہن تو مذہب کے خدا ہی کے عام فہم نام کے سوا کیا ہوا۔

لہذا انسان کی محدود ظلوم وجہول ذات کو اس کے عملی و علمی ظلم وجہل تاریکیوں پر تاریکیوں (ظلمات بعضہا فوق بعض) سے نکال کر صرف یہ خدا ہی حسب ضرورت و حکمت روشنی عطا کر سکتا ہے: من لم یجعل اللہ لہ نوراً فمالہ من نور۔ (سورہ نور رکوع ۵)

لہذا اب آگے یہی دیکھنا ہے کہ مذہب کے اس خدا ہی کی طرف سے جو ایک صاف و واضح قرآن نام کی صورت میں ہر طرح مستند و محفوظ ایسا ہدایت نامہ مل چکا ہے جو رضائے حق کے طالبوں کو ہر طرح کی تاریکیوں سے نکال کر کس طرح روشنی کی طرف لانا اور زندگی کی تمام راہوں میں صاف سیدھا راستہ دکھلاتا ہے۔

"قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ

یھدیھم الی صراط مستقیم" (سورہ مائدہ رکوع ۳)

اب آگے کتاب ہذا کا دوسرا حصہ "کلامیات قرآن" انشاءاللہ اس کتاب ہدایت کی رہنمائی میں پڑھیں۔

"اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

# اشاریہ

(انڈکس)

# شخصیات


۲۴۵، ۲۵۰، ۲۵۶

## کتابیات

INDEX